

ضروری اہتمام!

معزز خواتین و حضرات!

www.booksbuster.net کو پسند کرنے کے لئے آپ

سب کا بہت بہت شکریہ! ہماری ویب سائٹ کا مقصد علم و ادب کی ترقی و ترویج ہے۔ جیسا کہ آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ کتابیں پڑھنے کا شوق دن بدن کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس امر کی کئی وجوہات ہیں لیکن سب سے بنیادی وجہ کتابوں کی بڑھتی ہوئی قیمتیں ہیں۔ ہمارا اولین مقصد عوام الناس کو اعلیٰ کتابیں اور وہ بھی مفت فراہم کرنا ہے۔ امید ہے آپ سب ہمارے اس عظیم مقصد کی تائید کرتے ہیں۔

کتابوں کی قیمتوں کی وجہ سے اگر آپ کو خریدنے کے بعد کتاب پسند نہیں آتی تو آپ کا اس سے مالی نقصان بھی ہو گا ہمارا مقصد یہی ہے کہ اگر آپ کو ہماری ویب سائٹ سے کوئی کتاب پسند آتی ہے تو رائٹر کو اس کا حق ضرور دیں اور کتاب خرید کر اپنی لائبریری کی زینت بنائیں۔

ہم www.booksbuster.net آپ کو نیٹ کی وسیع دنیا سے ہر قسم کی کتابیں فراہم کرتے ہیں۔ ہم بلا معاوضہ آپ کی اور علم و ادب کی یہ خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔

اس کے جواب میں ہم آپ سے درج ذیل باتوں کی توقع کرتے ہیں۔

- ۱۔ برائے مہربانی www.booksbuster.net کا نام اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ تاکہ اگر کسی وجہ سے سائٹ گوگل میں نہ بھی ملے تو با آسانی ہماری سائٹ تک پہنچ سکیں۔
- ۲۔ اگر کوئی کتاب پسند آئے تو اسے Share ضرور کریں تاکہ اور دوست احباب بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔

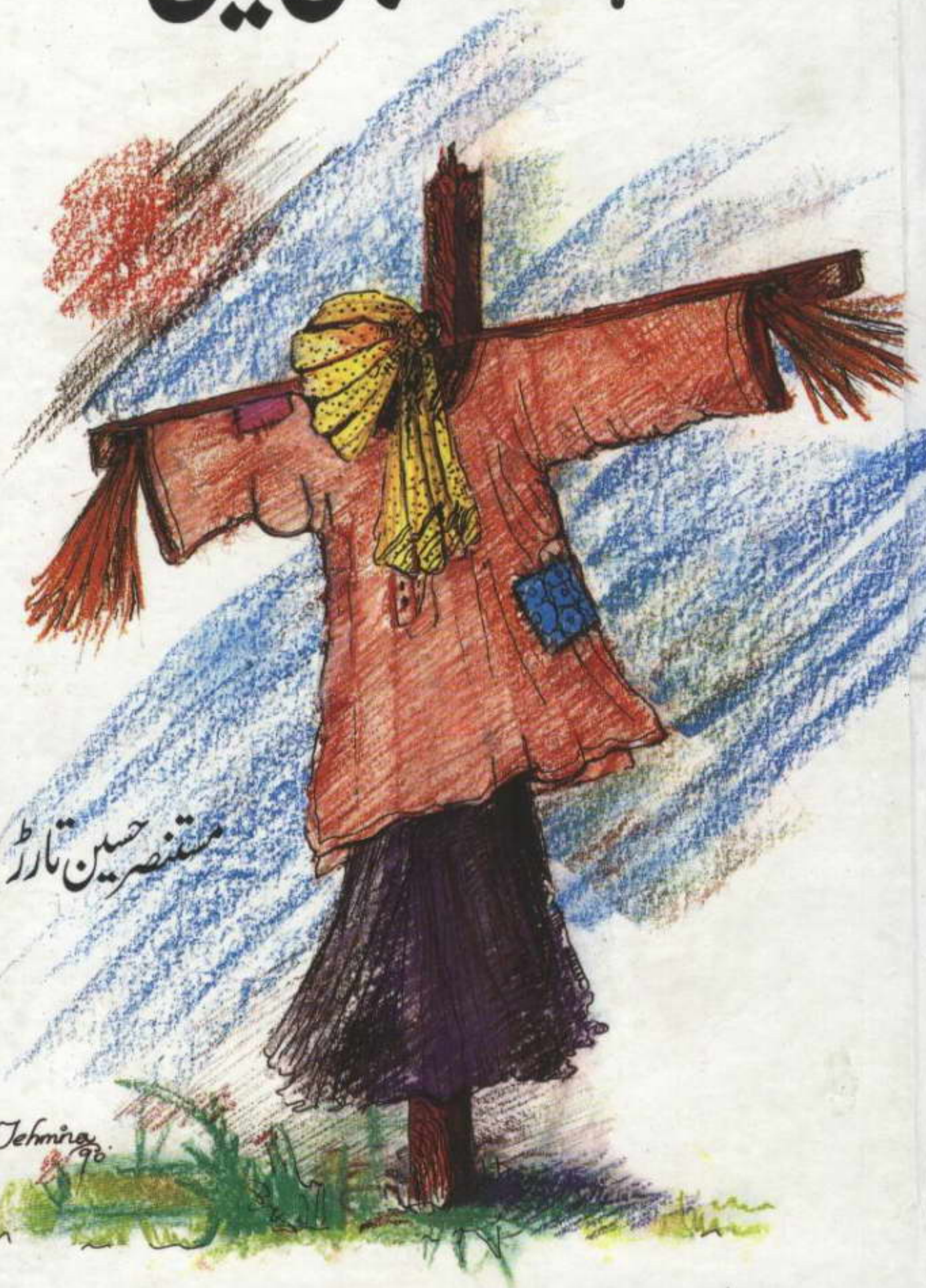
۳۔ ہمارا فیس بک پیج لائک کریں اور احادیث، دعائیں، اقتباسات، شاعری کی کی اپ ڈیٹس حاصل کریں۔۔۔ www.facebook.com/UrduAdabb/

www.facebook.com/Mian.Ashfaq4 منجانب:-

انتظامیہ: www.booksbuster.net

www.urdunama.org/forum

اُوہمارے بھائی ہیں



مستنصر حسین تارڑ

Jehmina
96

فہرست

- ۱۔ اُو ہمارے بھائی ہیں
- ۲۔ جو بھی تیرے فقیر ہوتے ہیں
- ۳۔ آستینوں میں بُت
- ۴۔ شہر میں کیوں آگئے ہو راجہ جی
- ۵۔ شکریہ تو ادا کرنا چاہیئے
- ۶۔ پاکستانی رابنن کرو زو
- ۷۔ اتبنول کا اکبر خان
- ۸۔ کالا جادو۔ کھوپڑیاں۔ سیاہ بچھو اور آفریدی
- ۹۔ دریائی گھوڑوں کو شرم نہیں آتی
- ۱۰۔ ہم سب پیٹھ ہیں
- ۱۱۔ ایکش کہانی
- ۱۲۔ بیس کاروں کا سوال ہے بابا
- ۱۳۔ نیا سال مبارک
- ۱۴۔ خریدا ہوا جن واپس نہیں ہوگا

- ۱۵۔ شیر چائے شیر
۱۶۔ پائلٹ اور پیلٹ
۱۷۔ تلاش گمشدہ گناہی و نیولاجات
۱۸۔ گلزارنگ سرعید مبارک
۱۹۔ میں نے سگریٹ چھوڑ رکھے ہیں
۲۰۔ بنانا قی مضی اور گلابازی
۲۱۔ ماچس ہوگی آپ کے پاس
۲۲۔ میں بھی انٹرنیشنل ہونا چاہتا ہوں
۲۳۔ ماؤنٹ ایورسٹ پر یادیں
۲۴۔ اے میری مرغابیاں
۲۵۔ پاکی باسٹرو
۲۶۔ بازار حسن یا بازار محبوبی
۲۷۔ ہم پاکستان کے یار ہیں
۲۸۔ مائی پھیرے باز
۲۹۔ گائے گھوڑا بیکار ہے جی!
۳۰۔ لاہور شیش اور سکھ برادران
۳۱۔ جہاز اور ہوائی جہاز
۳۲۔ گالی الاؤنس
۳۳۔ پھول اگالے والے اور پھول بیچنے والے
۳۴۔ آدھے مسلمانوں کا ملک

- ۲۵۔ پنک جامنوں کھا رہی ہے
۲۶۔ چڑیا گھر میں رہائش کا مسئلہ
۲۷۔ مہماندہ کا برگد اور آبشار
۲۸۔ سکھ شہزادی کا مرتبان اور پانڈان
۲۹۔ عید کرکس کے نزدیک آرہی ہے
۳۰۔ متاب راشدی، موٹر سائیکل اور سرفراز سید
۳۱۔ بھولا بچی اور لپک کھیلیں
۳۲۔ آجائین دے میوے اور لپک کھیلیں
۳۳۔ موچی دروازے کا مارکو پولو
۳۴۔ نقاد اور مہار پائی
۳۵۔ بارغ بہاراں
۳۶۔ ابا بیلین گوالمنڈی میں
۳۷۔ سکھ آئے ہوئے ہیں
۳۸۔ لوٹ ماریل
۳۹۔ بونی بے ایمان ہے
۴۰۔ جانی جوکر اور پاکستان
۴۱۔ نادان فرنگ اور جنگلی مینیں
۴۲۔ پچ مانگنگ
۴۳۔ آئی تو پاکستان کا چپکو
۴۴۔ ہرن مینار اور پیاسے ہرن

۵۵۔ قوموں کی ترقی کا پیکر شدہ ٹائر

۲۴۰

۵۶۔ اس پلیٹ فارم اور اس پلیٹ فارم میں فرق

۲۴۲

۵۷۔ چوٹی گم ہو گئی ہے

۲۴۶

۵۸۔ عاشق اور انشورنس ایجنٹ

۲۵۱

۵۹۔ فینی ڈریس

۲۵۵

۶۰۔ نجات خاں کو ب

۲۵۹

۶۱۔ بیگمات اور سیلاب

۲۶۲

۶۲۔ ایک لنگوری کا لم

۲۶۸

دنیا بھر کے اُلوؤں کے نام

۲۶۹۔ ایک لنگوری کا لم

۲۷۰۔ ایک لنگوری کا لم

۲۷۱۔ ایک لنگوری کا لم

۲۷۲۔ ایک لنگوری کا لم

۲۷۳۔ ایک لنگوری کا لم

۲۷۴۔ ایک لنگوری کا لم

۲۷۵۔ ایک لنگوری کا لم

۲۷۶۔ ایک لنگوری کا لم

۲۷۷۔ ایک لنگوری کا لم

۲۷۸۔ ایک لنگوری کا لم

۲۷۹۔ ایک لنگوری کا لم

۲۸۰۔ ایک لنگوری کا لم

”اُلو ہمارے بھائی ہیں، باقی سب نائی ہیں“

اُلوں میں دلچسپی رکھنے والے باذوق حضرات کے لئے یہ خبر باعثِ صدمہ و مسرت ہوگی کہ یورپ میں ایک ماہر جانوراں نے اُلوؤں کے بارے میں بے شمار حقائق سے پردہ اٹھایا ہے۔ جب پردہ اٹھایا گیا تو پردے کے پیچھے بھی الٹ نہ تھے۔ جو ایک اطلاع کے مطابق، بہ پردے کے پیچھے کیا ہو رہا ہے.... گارہے تھے۔ بہر حال ان صاحب نے برسوں کی اُلو ریسرچ کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اُلو بس اُلو ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اُلوؤں کے بھی طائفے ہوتے ہیں اور ان میں کچھ کام کرنے والے ہوتے ہیں اور کچھ بس اُلو کے پٹھے ہوتے ہیں اور یہ کڑی کام نہیں کرتے۔ اسی طرح ان کی تحقیق کے مطابق اُلو آپس میں گفتگو بھی کرتے ہیں۔

بس ہماری بد قسمتی یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اُلو تحقیق پر مناسب توجہ نہیں دی گئی درنہ ہمارے ہاں اُلوؤں کی کیا کمی ہے۔ ایک سے ایک بڑھ کر اُلو ہے اور بڑا بڑا اُلو ہے بلکہ ہر شاخ پر اُلو بیٹھا ہے۔ اگرچہ میں نے اُلوؤں پر زیادہ تحقیق نہیں کی لیکن کچھ حقائق ایسے ہیں جو خود بخود آشکارا ہوتے گئے ہیں.... مثلاً یہ کہ اُلوؤں کی بلکہ پاکستانی اُلوؤں کی چار قسمیں ہیں..... پہلے تو دو قسم کے ابتدائی اُلو ہوتے ہیں۔ یعنی بڑے اُلو اور چھوٹے اُلو.... پھر بڑے اُلوؤں میں ایک ذرا چھوٹے ہوتے ہیں اور اس طرح چھوٹے اُلوؤں میں بھی ذرا چھوٹے اُلو اور بہت ہی چھوٹے اُلو.... ان چار اقسام کے اُلوؤں میں ایک قدر مشترک پائی جاتی ہے اور وہ ہے اُلو ہونا۔ ویسے محاورے کے لحاظ سے بڑے اُلو کا زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً یار وہ تو بڑا اُلو ہے.... یاد رہے کہ یہ کبھی نہیں کہا جاتا کہ یار وہ تو چھوٹا اُلو ہے۔

اُو انسان کی حماقت کا آنکھیں جھپکتا ثبوت ہے..... اہل یورپ اسے عقل و دانش کے
علامت کے طور پر اپنی درس گاہوں کی نشانی بناتے ہیں۔ اکثر یونیورسٹیوں کے لیٹر پٹر پر اُو کی
شکل بنی ہوئی ہے..... اور ادھر مشرقی میں اُو کو حماقت کی علامت سمجھا جاتا ہے اور اُو اور
بلے دونوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس میں اُو کا کوئی قصور نہیں۔
یہ انسان ہے جو ایک پرندے کو بیک وقت عالم ادا حق سمجھتا ہے۔

شفیق الرحمن نے "تربک نادری" میں ایک اُو شناس کا ذکر کیا ہے جو اُوؤں کی بولی
سمجھتا تھا..... یعنی یہ اُو تحقیق جو ہے مشرق میں بیت پہلے ہو چکی ہے اور یہ جواب کہا جا
رہا ہے کہ اُو آپس میں گفتگو کر رہے ہیں تو یہ نادر شاہ کے زمانے سے چلا آ رہا ہے ظاہر ہے اُو
شناس اسی لئے اُوؤں کی بولی سمجھتا تھا کہ اُو بولتے تھے..... نہ بولتے تو بولی کیا خاک سمجھتا.....
یوں بھی پاکستان میں بولنے والے اُو کثرت سے پائے جاتے ہیں..... شاید دے کر دانیج
کرنے کی چند ضرورت نہیں۔ آپ اپنے آس پاس نگاہ ڈالیں تو آپ کو منہ بولنا ثبوت مل
جائے گا۔

دیسے میں نے آج تک اُو نہیں دیکھا..... اس پر آپ یہ مت کہیں گے کہ نیچے کیا دیکھ
رہے ہو میری طرف دیکھو۔

اُو کی آنکھیں بڑی بڑی ہوتی ہیں اور وہ انہیں متواتر جھپکتا رہتا ہے..... اُو
فیادی طور پر ایک غیر بند باقی پرندہ ہے اور اسی لئے وہ کبھی بھی اپنی مادہ کے ساتھ
چلیں کرتا نہیں دیکھا گیا جس طرح کہ دیگر پرندے کو ترا در مرغ وغیرہ کرتے ہیں اور یہ
برسر عام کرتے ہیں کہ ان پر فحاشی کے الزام میں مقدر مرد دج ہو سکتا ہے..... اُو ایسا
نہیں کرتا وہ جو کچھ کرتا ہے چھپ کر کرتا ہے۔ ظاہر ہے اگر اُوؤں کی نسل جاری ہے تو
وہ اس لئے کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ تو کرتا ہے.....

بعض لوگ اُوؤں سے شدید محبت کرتے ہیں..... کیوں کرتے ہیں؟ اس لئے کہ وہ

اُوؤں سے شدید محبت کرتے ہیں.....

میں ذاتی طور پر اُوؤں کے بارے میں غیر جانبدار ہوں..... کیونکہ اگر میں اُوؤں
کے حق میں بات کروں گا تو مجھ پر اُو نواز ہونے کا الزام لگے گا۔ اگر ان کے خلاف بیان دوں
گا تو کہا جائے گا کہ لوطیہب اُوؤں نے اس کا کیا بگاڑا ہے جو ان کے خلاف ہو گیا ہے۔ حالانکہ
اُو بیج کی نشریات کی میزبانی تو نہیں کر سکتے..... غیر جانبداری میں یوں بھی بڑے مزے
ہیں یعنی رند کے رند رہے اور ہاتھ سے اُو نہ لیا..... اور اگر ہاتھ میں دو اُو ہوں تو پھر
یہ کہا جائے گا کہ رند کے رند رہے اور ہاتھ سے اُو نہ لگئے۔ اگر اُو دو کی بجائے تین ہوں
تب بھی یہی فارمولہ استعمال ہو گا بلکہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ رند کے رند رہے اور ہاتھ سے تین
اُو نہ لگئے۔

اگر اُو آپس میں گفتگو کرتے ہیں تو کس قسم کی گفتگو کرتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اپنی زندگی اپنے
نظام اور دین بہن کے بارے میں ہی بات چیت کرتے ہوں گے۔ اور یہ بھی خیال ہے کہ ایسے
باشعور پرندوں کے ہاں ایکشن بھی ہوتے ہوں گے۔ یہ ایکشن جماعتی ہوتے ہیں یا غیر جماعتی
اس کے بارے میں کچھ یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ یہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر
ایکشن ہوتے ہیں تو پھر ان میں پسندیدہ امیدوار کے حوالے سے نعرہ زنی تو ہوتی ہوگی.....
..... مثلاً.....

"سا دا اُو آدے ای آدے....."

"ہمارا اُو بہترین اُو....."

"اُو مت بیٹے! صرف ہمارے اُو کو ووٹ دیں۔"

"ووٹ اُو کی امانت ہے۔"

"اُو سا ڈا شیراے باقی بچھو اے۔"

"اُو ہلرے بھائی ہیں باقی سب ناٹی ہیں۔"

ان امینی معروں کے علاوہ انوکے انٹرویو بھی اس سلسلے میں اخباروں کی زینت بنے ہوں گے۔ چنانچہ ایک مختصر انٹرویو پیش خدمت ہے.....

”آپ کیا ہیں؟“

”کیا آپ کو نظر نہیں آ رہا کہ میں ایک اعلیٰ کوالٹی کا انوکھوں.....“

”آپ انوکھوں ہیں؟“

”اس لئے کہ میں شتر مرغ نہیں ہوں۔“

”بہت خوب..... یہ فرمائیے کہ آپ کب سے انوکھ ہیں؟“

”کچھ ٹھیک طرح سے یاد نہیں لیکن جب سے ہوش سنبھالا! اپنے آپ کو انوکھا پایا.....“

”آپ بنائے گئے تھے یا بنے بنائے تھے؟“

”ویسے تو میں بنانا تھا لیکن تصویر سی کسرہ لگی تھی اس لئے میں نے اپنے

آپ کو تصویر سا خود بھی بنالیا تھا۔“

”اور آپ عوام کو کیا بنائیں گے؟“

”وہی جو کہ میں خود ہوں..... انوکھ۔“

”اور کیا آپ کہتے ہیں کہ آپ سیدھے ہیں.....؟“

”میں بالکل سیدھا ہوں اور عوام کو مجھے سیدھا کرنے کا مزدورت پیش نہیں آئے گی۔“

”یعنی عوام اپنا انوکھ..... سیدھا نہیں کر سکیں گے.....؟“

”جی بالکل.....“

”یہ فرمائیے کہ کیا عوام انوکھ بن جائیں گے؟“

”بن جائیں گے کا کیا مطلب.....؟“

”اگر آپ الیکشن جیت گئے تو آپ اس ملک کے لئے کیا کریں گے؟“

”میں نے اس ملک کے لئے کیا کرنا ہے۔ یہ ملک میرے لئے کچھ کرے گا؟..... ویسے

میرا ارادہ ہے کہ جیتنے کے بعد اگر کوئی شاخ خالی نظر آئی تو اس پر بھی انوکھا دوں گا.....

”کہیں آپ کو عقل مند سمجھا جاتا ہے اور کہیں آپ حماقت کی علامت ہیں۔ آخر آپ

ہیں کیا؟“

”میں صرف انوکھوں اور مجھے اس پر فخر ہے..... اور میرا نعرہ یہ ہے کہ دنیا بھر کے

انوکھ ایک ہو جاؤ..... یا کم از کم دو ہو جاؤ۔“

”شکریہ انوکھی..... آپ نے بے حد اوزن والی باتیں کیں جس کے لئے میں آپ

کا شکریہ گزار ہوں.....“

”میں آپ کا بھی شکریہ گزار ہوں کہ آپ نے مجھ ایسے انوکھی عزت افزائی کی..... امید

ہے آپ وڈ بھی مجھ کو دیں گے.....“

”جی بالکل..... میرا نعرہ یہی ہے کہ ”ساڈا انوکھ آڈے ای آڈے“.....“

”جو بھی تیرے فقیر ہوتے ہیں“

شہر میں ان دنوں عداوت سارا ہی کے ان محنت کا بڑا ہر چاہے جن میں فقیر رہتے ہیں.... جی ہاں یہی فقیر اللہ کے نام پر بابا اور دس روز سے صیو کا ہوں بابا اور اللہ ہی اللہ اور کئی داتا تیرے بچے جیٹیں....
 والے حیرتوں.... ان محلوں میں رہتے ہیں جو کسی گنم شخص نے ایدھی صاحب کو عنایت کر دیئے کہ انہیں خدمت غنق کے کام میں لائیے.... کوئی ایسا گنم شخص جو یہ جان گیا کہ بجلہ لادھنے گا اور یہ سب کچھ ہیں وہ جانتے گا۔ یہ فائوس اور سنگ مرمر کے فرش اور ٹیک وڈ کا فرنیچر اور اسی دانت کے میز کرسیاں.... تو ان محنت اور فقیروں کے ساتھ ساتھ شہر میں سماجی بیہود کے کاموں پر بڑا زور ہے۔ ہر کوئی اپنی عاقبت سنوارنے کی فکر میں نظر آتا ہے یہ الگ بات ہے کہ عاقبت سنورے سنورے دن کی دنیا سنور جاتی ہے۔ کیونکہ سوشل و فیئر یعنی سماجی بیہود کے کاموں میں کمائی بھی بہت ہے۔ بلکہ ایک دوست کا کہنا ہے کہ بیرون کی سگنگ سے زیادہ منافع بخش کاروبار ہے.... کوئی ٹرسٹ بنائیے حکومت سے امداد لیجئے اور پھر اس میں اپنی مدد آپ کیجئے.... زندہ کے زندہ رہے اور ہاتھ سے جنت نہ لگی اور جائے گی کہاں جب تک ہمارے معاشرے میں ایسے ایسے ذہین لوگ موجود ہیں جو ان لوگوں کو بھی بچ کاتے ہیں۔ صرف چند لوگ ہیں جو خدمت کے جذبے سے سرشار ہیں اور باقی لوگ دولت جمع کرنے کے جذبے سے سرشار ہیں۔
 بہر حال ان دنوں سماجی بیہود کا کام بہت ”ان“ ہے۔ ہر کوئی اس فکر میں ہے کہ ان لوگوں کی خدمت کی جائے۔ چونکہ ہمارے ہاں جب کوئی چیز ٹیلی ویژن پر آجائے تو وہ فیشن بن جاتی ہے۔ اس لیے ادر عبدالستار ایدھی اور انصار برنی ٹیلی ویژن پر آئے اور ادر سماجی بیہود کا فیشن چل نکلا.... مسیح ایک عاتق کار ہیں کوئی

گنم سا کاروبار کرتے ہیں اور خوب کسے ہیں کیونکہ مادر بہت میں لیکن مجھے کبھی بھی ان کے کاروبار کی تفصیل یاد نہیں رہتی.... اس لیے گنم کہہ دیا۔ چنانچہ مادر ہیں اور نت نئے فیشنوں کی تلاش میں رہتے ہیں تاکہ اپنا مال خرچ کر سکیں۔ اس مرتبہ ملاقات ہوئی تو کہنے لگے۔ ”میریاں سوشل رینڈ میں گزارنے کا رواج ہوا تو میں وہاں چلا گیا۔ ہاں بچوں سمیت سری جانے سے تو بہت بہتر ہے اور خرچ بھی دو چار لاکھ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ سدا ایک بھلے مانس کو اور کیا چاہیے؟“

”ہاں دو لاکھ کیا شے ہے۔“ میں نے ہوا ہی سے کہا۔ ”ایک بھلے مانس کو اور کیا چاہیے؟“
 ”پھر اس کے جانے کا رواج آگیا.... پچھلے برس لوگ عمرہ کرنے جاتے تھے اور ساتھ میں مصر بھی ہو آتے تھے میں بھی ہوا آیا۔ بھارہ کا شوق تو پورا کر چکا۔ ان دنوں مرشد بڑ کا فیشن ہے۔ اس لیے اس کا تذکرہ کرنا مائل آندر کر رہا ہے.... دیئے آج کل کس چیز کا فیشن ہے؟“
 ”آج کل؟“ میں نے فوراً جواب دیا۔ ”آج کل خدمت غنق کا رواج ہے۔“
 ”کتنے کی فتنی ہے؟“ انہوں نے بھی فوراً کہا اور پھر فوراً حیران ہوئے۔ ”کس چیز کا فیشن ہے؟“
 ”خدمت غنق کا۔ انسانوں کی خدمت کرنا ان دنوں فیشن میں شامل ہے.... اسے سماجی بیہود بھی کہا جاتا ہے۔“

”سماجی بیہود“ وہ چونک گئے۔ ”نہ جی نہ۔ میں باز آیا سماجی بیہود سے۔ یہ تم مجھے کیا مشورہ دے رہے ہو۔ تم دوست ہو کہ مجھے سماجی بیہود کی طرف لگا رہے ہو۔ نہ نہ....“
 ”حرج ہی کیا ہے؟“
 ”حرج؟“ وہ چپک کر بولے۔ ”سماجی بیہود نے میری زندگی برباد کر دی.... تم جانتے ہو کہ کاروبار میں کسے پہلے میں کون سے ٹکے میں عازم تھا؟ سماجی بیہود کے ٹکے میں۔“
 ”پھر تو تجربہ بھی ہو گا۔“

”خوب تجربہ ہے۔ میں تو ساری زندگی کسی انسان کی مدد نہیں کر دوں گا۔ مجھے تو فنانس نے ذلیل کر دیا تھا.... وہ تو قسمت اچھی تھی کہ کاروبار چل نکلا۔ ورنہ میں تو صیو کا مر جاتا۔“

لیکن قصداً ہے؟" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"قصداً ہے؟ وہ خدا کا نام لے کر بولے اور بولنے سے پیشتر سکرانے۔ میں کئی برس پیشتر فکر سماجی بہبود میں کام کرتا تھا۔ انسانوں کی خدمت میں کی جائے اور اس کا معاون بھی مل جائے۔ اس سے بہتر کام اور کیا ہو سکتا ہے۔ ان دنوں حکومت نے مختلف شہروں میں "بیگر ہوم" یعنی فقیروں کے گھرنائے تاکہ مائٹرس سے گداگری کی لعنت کا خاتمہ کیا جائے۔ ان گھروں کے ساتھ زمین بھی اور ہم شہر کے فقیروں کو دہاں لاتے

تھے تاکہ وہ خکلام کریں اور جی محل کی روزی کمائیں۔ ہم بڑی شکل سے فقیروں کو پکڑ کر لاتے لیکن فقرا لگی بیچ چہیت ہر پوجا تھے۔ میں بھی ایک بیگر ہوم کا انچارج تھا ایک روز ہمارے شے کے انچارج نے میلہ بیگر ہوم دیکھا اور چکر لگا کر کوئی بھی بیگر نہیں تھا۔ اس لیے غلبہ ڈانٹ ڈپٹ کی کہ کیا بیگر ہوم چلا رہے ہو کہ چال ایجت بیگر بھی نہیں اور میں ہر ہفتے یہاں آکر چیک کروں گا اور دیکھوں گا کہ تم کتنے فقیروں لاتے ہو۔۔۔۔۔ وہ نہ تو کوری سے چھٹی کروادوں گا۔۔۔۔۔ اب جناب مجھے تو نوکری کے لئے پڑ گئے۔۔۔۔۔ اور کوئی بھی فقیر میرے ساتھ بیگر ہوم آنے کو تیار ہی نہیں ہوتا تھا۔ سدا دن مراکوں پر فقیروں کی منتیں کرتا رہتا کہ میرے بھائی مجھ پر احسان کرے۔ خدا کے واسطے میرے ساتھ ملو۔ میں نہیں کھلاؤں گا پلاؤں گا نہ کپڑے لے کر دوں گا لیکن جناب فقیروں کا تو داغ خراب ہے۔ روزانہ سینکڑوں روپے کاتے ہیں اور میٹھ کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ کہاں آتے؟ تب میں نے ایک ترکیب سوچی۔۔۔۔۔ میں فقیر کو کہتا "بابا جی آج میرے والد کا چاہیو ہے۔" دیکھیں چڑھائی ہیں فقیروں کو کھانا ہیں اور خیرات بھی ساتھ لے گی۔ یا یہ کہ آج میرے بچے کا عقیقہ ہے۔ فقیروں کے لیے کھانا اور پیسے بھی ملیں گے۔ فقیر راضی ہو جاتے۔ میں اسے میکسی میں بٹھا کر تانا اور بیگر ہوم میں بند کر کے باہر تالا۔ جب صاحب نے انسپکشن کی تو صاحب بہت خوش ہوئے کہ ہر طرف فقیر ہی فقیر نظر آ رہے ہیں۔

"تو ان فقیر حضرات نے شور نہیں مچایا کہ ہمیں یہاں زبردستی لایا گیا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"بالکل مچایا بلکہ بہت زیادہ مچایا۔ لیکن فقیروں کی کون سنتا ہے۔۔۔۔۔ یوں بھی فقیر بھائی بولتے ہیں اور صاحب کو اگر بھائی سمجھ میں آ جائے تو اس کی ماسجی میں فرق آ جاتا ہے۔"

"تو یہ فقیر تبار سے بیگر ہوم سے بھاگتے نہیں تھے؟"

"جھاگ جاتے تھے کبھی کبھی۔۔۔۔۔ لیکن میں ان کی تعداد پھر سے پوری کر دیتا تھا۔۔۔۔۔ پھر آہستہ آہستہ میں فقیروں کو آغا کرنے کا مہر ہو گیا اور مجھے میں دیگر افسران میری خدمات طلب کرنے لگے واصل انہیں بھی ہی مشد تھا۔ فقیروں سے نہیں تھے اور حکومت کہتی تھی کہ بیگر ہوم آباد کرو اور جس کا بیگر ہوم آباد نہیں ہوتا تھا اس کی نوکری برباد ہو جاتی تھی۔ چنانچہ میں فقیر سپاہی کرنے لگا۔"

"نہیں۔" میں نے حیران ہو کر کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"بالکل ہو سکتا ہے اور میں کرتا رہا ہوں۔۔۔۔۔ میں ان دنوں سو روپیہ فی فقیر کے حساب سے چارج کرتا تھا اور فقیر سپاہی کرتا تھا۔۔۔۔۔"

"تو فقیر پکڑنے کے اہل کیا طریقے تھے؟"

"طریقے تو مختلف تھے لیکن ان کی بنیاد لاپٹ تھی۔۔۔۔۔ کیونکہ ہوا یہ کہ آہستہ آہستہ مقامی فقیروں کو میرے جھانڈوں کا علم ہو گیا بلکہ جہاں کہیں بھی انہیں کھانے کے لیے بلایا جاتا وہ وہاں سے غائب ہو جاتے بلکہ ایک دوست کے والد صاحب کی فوٹیدگی ہوئی تو انہوں نے شکایت کی کہ جی تم نے قدمے اور ہاتھ کی اتنی دیکھیں عزبار اور مسکین کے لیے چڑھائیں اور میں غریب یا مسکین کو کہتے تھے کہ آؤ کھانا کھاؤ میں تو اس کا رنگ پلا پڑ جاتا تھا اور وہ اچھل کر جھاگ جاتا تھا۔ چنانچہ میں نے شہر سے باہر چھوٹے قصبوں اور گاؤں تک اپنا جال پھیلا دیا۔ اس طرح میرے اخراجات میں اضافہ ہو گیا۔"

"اور تبار سے افسران خوش تھے؟"

"اور نہیں تو کیا۔۔۔۔۔ انہیں اور کیا چاہیے تھا۔ ان کی نانائیں فقیروں سے بھری ہوتی تھیں، کہ اتنے فقیروں سے گئے۔ شہر کو گدا گروں کی لعنت سے پاک کر دیا جائے گا اور حکومت کا آئندہ منصوبہ دینو دیوہ۔"

"اچھا ان فقیروں کی تہذیب کا انجام کیا ہوا؟"

"انجام بہت بُرا ہوا۔" وہ سر ہل کر بولے۔ "اور خاص دیر تک کپ افوس مٹے رہے۔"

"فقیر جھاگ گئے؟"

”وہ تو جھاگتے ہی رہتے تھے اور میں انہیں اغوا کر کے قاتل بنا تھا۔ لیکن ایک ٹریجڈی ہو گئی۔“
 ”کس قسم کی ٹریجڈی؟“

”ایک صبح میں اپنے دفتر گیا کیا دیکھتا ہوں کہ برآمدے کے قریب ایک فیکر کھڑا ہے..... اسے دیکھ کر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ پچھلے کاجیتا جاگتا ایک فیکر..... میں اسے اپنے بیگر ہوم میں لے جا کر غبر بنا سکتا تھا۔ چنانچہ میں اس کے قریب گیا۔ لیکن قریب جانے سے پیشتر ایک ٹیکسی روکی اور اسے ہایا دے دیں تو میں اس فیکر کے پاس گیا۔“ اسلام علیکم
 ”جی ہاں علیکم۔“ فیکر نے انتہائی عاجزی سے کہا۔

”بابا جی آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“ میں نے بھی عاجزی سے کہا۔

”مجھ غریب سے.....“ اس نے حیران ہو کر کہا..... جلد اچھ غریب سے ہی تو میں نے بات کرنی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔

”ہاں آپ سے ایک ضروری کام ہے..... ایک منٹ کے لیے ادھر تشریف لے آئیے..... یہ ادھر ٹیکسی میں آجائیں تو آرام سے گفتگو ہو جائے گی۔ آپ کی بڑی مہربانی میں ہمیشہ آپ کا شکر گزار رہوں گا۔ آپ کا تو بچہ ہوں۔ بچے کی بات سن لیجئے۔“

یہ باتیں کرتا کرتا میں اسے ٹیکسی تک لے آیا۔ وہ میرے کہنے پر اندر بیٹھ گیا اور میں نے ڈرائیور کو اشارہ کیا اور ٹیکسی سٹارٹ..... اس نے بہت شور مچایا کہ یہ کہاں سے جا رہے ہو..... میں تشریف آ رہی ہوں..... لیکن یہ تو ہر فیکر کہتا تھا..... میں نے اسے بیگر ہوم میں بند کر دیا۔
 ”پھر کیا ہوا؟“

”پھر یہ ہوا کہ اگلے ہفتے جب صاحب انسپکشن کے لیے بیگر ہوم میں گیا تو اس فیکر نے صاحب کی طرف دیکھا اور روتے پڑ گئے گئے لگا کر کہا..... ”بٹیا یہ شخص زبردستی مجھے یہاں لے آیا ہے۔“ یہ فیکر صاحب کا باپ تھا۔

”لیکن تم اتنا بھی زبان کے کہ.....“

”صاحب کا باپ گاؤں سے آیا تھا۔ ہم شہری لوگ تمام دیہاتیوں کو فیکر سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ان کا لباس جو ہم سے مختلف ہوتا ہے۔ تو بس غلطی ہو گئی۔“
 ”پھر کیا ہوا؟“

”پھر میں نوکری سے نکال دیا گیا۔ اس لیے میرے سامنے سماجی بہبود کا نام مدت لو..... میں فناؤں کی خدمت نہیں کروں گا.....“

”لیکن نوکری سے نکل کر تم نے جو کاروبار کیا تو تم بہت دولت مند ہو گئے.....“
 ”ہاں.....“ اس نے ایک پاکیزہ آہ بھری۔ ”یہ ان تمام فیکروں کی دعاؤں کا اثر ہے۔ جنہیں میں زبردستی بیگر ہوم میں لے آیا کرتا تھا۔“

”آستینوں میں بت“

سرکپ کے قدیم کھنڈروں میں گھومنے کے بعد ایک غیر ملکی جوڑا باہر آیا تو ایک کہل پوش مقامی نوجوان ان کی جانب بڑھا۔ اس نے ایک چور کی طرح ارد گرد احتیاط کی نگاہ ڈالی اور پھر اپنے کہل میں سے ایک چھوٹا سا ہاتھ بڑھ کر آکر کے غیر ملکی جوڑے کے سامنے پیش کر دیا۔ وہ متاثر ہوئے بغیر آگے پھرتے رہے۔ نوجوان نے دوسرے ہاتھ سے ایک اور مجسمہ کہل میں سے نکالا اور انہیں دکھایا مگر وہ اپنے ہاتھ کی جانب بڑھتے رہے۔ اس نے کم از کم پچاس سال کے کہل میں سے برآمد کردہ ایک غیر ملکی جوڑا شاید جانتا تھا کہ یہ ہزاروں سال قدیم مجسمے دراصل مقامی نوجوان کی مہارت سے ابھی دو چار روزہ پیشتر ہی وجود میں آئے تھے۔ اس لئے وہ اطمینان سے اپنے ہاتھ میں سوار ہو گئے اور قدیم درگاہ جوہن کی طرف روانہ ہو گئے۔

میں اپنے چھوٹے بھائی میجر بمبشرا اور بال بچوں کے ہمراہ اسلام آباد سے ٹیکسلا اور اس کے قریب وچوار میں پچھلے کھنڈرات دیکھنے کے لئے آیا ہوا تھا۔ پہلا پڑاؤ ٹیکسلا کا عجائب گھر تھا جس کی عمارت پر کسی انگلش کنٹری ہاؤس کا گمان ہوتا تھا۔ لیکن مقامی پھر سے تعمیر شدہ دیدہ زیب عمارت میں داخل ہونے پر کسی انگلش لارڈ سے ملاقات ہونے کی بجائے لارڈ بھیا سے سامنا ہو گیا۔ گندھارا عہد کے مجسمے، برتن، زیور، اوزار، غرض کہ ایک مکمل تہذیب کی مکمل زندگی۔ عجائب گھر کے کیوریٹر مگر گلزار صاحب ہر آنے والے کو ایک مہمان کی طرح خوش آمدید کہتے اور خوش اخلاق گائیڈ کے سپرد کر دیتے۔ زیورات کا کمرہ جو کہ بند ہونے کو تھا اس لئے

میری بیوی کا اصرار تھا کہ پہلے انہیں دیکھ لیا جائے۔ کیونکہ بقول اس کے باقی تو ٹوٹے ہوئے برتن اور فضول سے بت وغیرہ ہیں۔ گندھارا عہد کے زیورات کی چکا چوند نے مسودات کو بے حد متاثر کیا۔ بلکہ کھانڈوں کے بجائے کنگن کا ڈیزائن بالکل وہی تھا جسے آج کل شیر منہ کنگن کہا جاتا ہے۔ ان کنگنوں کا مشیر کی شہادت کا تھا اور تمام زیورات خالص سونے کے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اس زمانے میں خاوند حضرات اپنی بیگمات کو چھریا ہڈی کے کنگن یا نیپلس وغیرہ کے حنائف دے کر خرافاتی دے آؤں گے اور چین کی زندگی بسر کرتے ہوں گے لیکن اب معلوم ہوا کہ اس عہد میں بھی خواتین اپنے خاوندوں کو طعنہ دیتی ہوں گی کہ ہائے ادھر تو دیکھو اس کاموٹی پجاری کو جس کی کھانیاں سونے کے کنگنوں سے بھری ہوئی ہیں اور ذرا میرے شکے بازو دیکھو..... میری پی مینی ایک شوکس پر مٹکی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا بیٹے کیا دیکھ رہے ہو؟ البتہ کچھ کتنی پیاری بالیاں ہیں اور اتنی ساری ہیں۔ مجھے ایک سے دیکھیے۔ یعنی نے سال ہی میں بڑے شوق سے اپنے کان چھدوائے اور میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ تم بالیاں پسند کر لینا میں خریدوں گا..... میں نے اسے بتایا کہ بیٹے کئی ہزار سال پہلے چھوٹی بچیاں یہ بالیاں بنتی تھیں اس لئے یہ صرف دیکھنے کے لئے ہیں۔ وہ بول ابراگر بالیاں ہیں تو انہیں پہننا چاہیے۔ خواہ مخواہ یہاں پڑی ہیں اور اتوان بچوں کے نام کیا تھے جو یہ بالیاں بنتی تھیں..... میں نے بڑی مشکل سے اسے سمجھایا کہ میں یہ بالیاں نہیں لے کر نہیں دے سکتا۔ ٹیکسلا عجائب گھر سے جوہن درگاہ کے کھنڈروں کی جانب سفر شروع ہوا۔ چھوٹے چھوٹے کھیت، نیم پھرتی زمین اور ٹیلوں کے کوہان..... کہاوت ہے کہ چند رگبت مور یہ کو جب مگدھ سے نکال دیا گیا تو وہ قتل و دافش کا تلاش میں ٹیکسلا پہنچا۔ ایک روز اس نے دیکھا کہ ایک شخص آیا۔ اس نے ایک درخت کو پانی دیا اور چلا گیا۔ دوسرے روز وہی شخص لوٹا اور کھانڈی سے اسی درخت کی چند جڑیں کاٹ ڈالیں..... چند رگبت نے سبب پوچھا تو وہ بولا کہ ایک روز میں اس درخت کے نیچے سے گزرا تو اس کی شاخوں سے میری پگڑی نیچے آ کر گئی۔ اب میں اسے زندہ بھی رکھتا ہوں اور انتقام بھی لیتا

ہوں..... چند گیت اُسے اپنے ہمراہ گھر لے گیا اور اس کے مشوروں کے مطابق اپنا کھرباؤ تخت دوبارہ حاصل کر لیا..... اس کا نام چانکیہ تھا۔ جسے چانک بھی کہا جاتا ہے اور جو آداب حکمرانی میں میاری اور چالاکی کے باب میں پہلا نام ہے۔ جانے کس درخت تلے چند گیت موریر اور چانکیہ کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

جوہن درگاہ کے کھنڈرات ایک بند ٹیلے پر واقع ہیں اور وہاں تک پہنچنے کے لئے ایک کوہ پیما کا حوصلہ اور ایک سیاح کی ڈھنسی درکار ہوتی ہے۔ خاص طور پر جب بچہ لوگ ہر قدم پر پہنچنے سے انکار کر دیں اور کہیں کہہ ادا کر ادا کر جا کر اُس کریم طے گی تو پتے ہیں وہ نہ آپ باکر اپنے کھنڈر دیکھ آئیں..... جس طور کسی بند چوٹی پر پہنچ کر انسان حیرت سے دوچار ہوتا ہے اسی طرح جوہن کے کھنڈرات میں داخل ہو کر میں چند لمحوں کے لئے سناٹے میں آ گیا۔ میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ کھنڈرات اتنے وسیع اور بارعب ہوں گے۔ پٹھان گائیڈ آگے آگے چلتا رہا۔ صاحب یہ اس وقت پورے برصغیر کی سب سے بڑی درگاہ تھی۔ یہاں بدھ بھاشو مذہب کا علم حاصل کرنے آتے تھے۔ افغانان، چین اور ایسے ملکوں سے جن کے نام اب مٹ چکے ہیں ان ستونوں پر کھدے مجسموں کے ذریعے انہیں بدھ کی تعلیمات سے آگاہ کیا جاتا تھا۔ یہ اسمبلی ڈال ہے جہاں یکپہر ہوتے تھے اور یہ وہ کمرے ہیں جن میں طالب علم رہائش پذیر ہوتے تھے۔

”اُس کے پاس کے ان بلند ٹیلوں کو کھودا جاتے تو اس درگاہ کے مختلف حصے برآمد کئے جاسکتے ہیں میں مارشل صاحب اور دیملر صاحب د معروف ماہر آثار قدیمہ اسے ملاحظہ ہوں۔ وہ یہاں آتے رہتے ہیں....“

”ابو.....“ میرا بیٹا سمیر ایک بُت کے پاس کھڑا تھا۔ دیکھئے اس کی نافی میں ایک سوراخ ہے۔ اور بورڈ پر لکھا ہے کہ اگر آدمی اس سوراخ میں انگلی ڈال کر اپنی کسی خواہش کے بارے میں سوچے تو وہ پوری ہو جاتی ہے..... وہ سوراخ میں انگلی گھمانے لگا۔

”بیٹے بتوں کو شک نہیں کرتے..... انگلی نکالو.....“ لیکن تم نے کس خواہش کے بارے میں سوچا ہے؟“

”مجھے سبک لگی ہے.....“ وہ بولا۔ ”اور اب تو ان کھنڈروں میں ایک جگہ بورڈ لگا ہے۔ جس پر لکھا ہے: کھانے کا کمرہ..... وہاں چلیں!“

ہم ایک منفر کھنڈر میں آئے جو کبھی بدھوں بھکشوؤں کا کھانے کا کمرہ ہوتا تھا، اور پتھروں پر بیٹھ کر برگر۔ سینڈویچ اور چپس کھانے لگے..... بدھ بھکشو پتہ نہیں کیا کھاتے ہوں گے؟

”شہر میں کیوں آگئے ہو راجہ جی“

خواتین و حضرات! السلام علیکم! جیسا کہ آپ ملتے ہیں ان پر تشریف انتہائی اہم ہے۔ اس میں ان شیردہانوں کو نصوحی نشہ دیئے جائیں گے جنہوں نے اپنی بائیں ترسی پر مدھک کر تانچ سے بے پردہ ہو کر وطن کے عوام کی زندگیوں کو بچانے کے لئے وہ کارنامے سرانجام دیئے کہ بس آپ کو کیا بتائی میرا خیال ہے وہ آپ کو خود ہی بتائیں گے کہ انہوں نے یہ کارنامے کس طرح سرانجام دیئے۔ ڈالے۔۔۔۔۔

”جناب! آپ نے یہ عظیم کارنامے کس طرح سرانجام دیئے؟“

”میرا فرض تھا جناب۔۔۔۔۔“

”کل کتنے کارنامے تھے؟“

”کارنامہ تو صرف ایک ہی تھا لیکن وہ کئی کارناموں پر جاری تھا۔ اتنا خطرناک کہ جناب اب بھی میری بعض تیز چل رہی ہے اور مجھے ہلکا ہلکا بخار ہے۔“

”آپ کا تعلق کس محلے سے ہے؟“

”میرا تعلق جنگلی جانوروں کے تحفظ کے محلے سے ہے۔“

”بہت خوب اور اس محلے کے کیا کفرائیں ہیں؟“

”ایک تو ہم ہر اس بندے کو بکڑ بناتے ہیں جس کے ہاتھ میں بندوق ہو اور دوسرا کہیں کا لائنس نہ ہو۔“

”اور اس کے علاوہ؟“

”اور اس کے علاوہ ہم انسروں کو شکار کرانے ہیں۔“

”یہ بھی آپ کے فرائض میں شامل ہوگا۔ اس کے علاوہ؟“

”اس کے علاوہ ہم پاکستان میں آنے والے اور رہنے والے جنگلی جانوروں اور پرندوں وغیرہ کو بچاتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم اس معاملے میں بے مددگوش قسمت واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے ملک میں جانوروں اور پرندوں کی بہتات ہے۔ ہم اس بہتات کو کم۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے زیادہ کرنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔ ان جانوروں کو بچاتے ہیں۔ جن کی نسل ختم ہو رہی ہے۔ یہ تو ہیں الاقوامی مسئلہ ہے۔“

”بہت خوب تو آپ نے جو یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے تو یقیناً خوب صورت جانور کو ختم ہونے سے بچایا ہوگا۔“

”آپ کہہ سکتے ہیں۔“

”ذرا روشنی ڈالیں۔“

”ہم نے ایک انتہائی خوشخوار آدم نور چنے کو جان بھری پر مدھک کر ایک گھرانے کے اندر صرف پندرہ مہینوں میں گولیوں سے ہلاک کر ڈالا ہے۔“

”بہت خوب۔۔۔۔۔ تو یقیناً آدم نور تھا۔“

”یقیناً! تبھی تو انسانوں کی بستی میں آیا تھا۔“

”سندے کے پھوٹا سا بچہ تھا۔“

”جی ہاں لیکن بڑا ہو کر ضرور آدم نور بن جاتا اس کی آنکھوں سے پتہ چلتا تھا۔“

”یہ بھی سندے کے تھکا ہوا تھا، بھوکا تھا اور گھبراہٹ میں مرنے سے سوراٹا تھا۔“

”بالکل آپ نے خود ہی فرمایا ہے کہ بھوکا تھا۔ ظاہر ہے جب جاگتا تو اسے کھانے کو کیا

”مقا؟۔۔۔۔۔ صرف انسان۔۔۔۔۔“

”لیکن۔۔۔۔۔ وہ آپ تو جنگلی جانوروں کے تحفظ کے محلے میں ہیں اور آپ کی اہواز سے

”اسے ہلاک کیا گیا تو تحفظ کیسے ہوا؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ اس میں بھی ایک لائن ہے۔ دیکھئے! ان غلطیوں میں کی ہے۔ ننھے ننھے بچوں کو گھر

کے باہر لڑائی جانی دینا چاہیئے چاہے وہ پینے کے پانی ہی کیوں نہ ہوں۔۔۔۔۔ اب اسے تو ہم نے

مار دیا..... تو ہو گا یہ کہ اب اس کی ماں اپنے بغیر بچوں کیست اسے تلاش کرنے کے لئے شہر آئے گی اور ہم ان سب کو پکڑ کر ان کا تحفظ کریں گے..... ایک پتہ مار کر ہم بہت سارے پتے حاصل کریں گے۔“

”یہ واقعی بہت شاندار حکمت عملی ہے.....“

”اور مالک مکان صاحب جو پتے کے پچے کے مارے جانے پر بہت سیخ پایا میں بالکل جاہل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ بے ضرر تھا۔ انسان کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا تھا اور اسے پکڑ کر چڑا گھر میں بھیجنا چاہیے تھا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ پاکستان میں اللہ تعالیٰ نے کتنے خوبصورت جانور پیدا کئے ہیں..... جناب جنگلی جانوروں کے تحفظ کے محکمے میں تو ہم ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ تحفظ کس طرح کیا جاتا ہے اور بس اسی طرح کیا جاتا ہے۔“

”اور وہ بے حد خطرناک تھا؟“

”جی ہاں جب اسے ہلاک کر دیا گیا تو میں اپنی بان بستی پر رکھ کر اس کے قریب گیا اور یقین جانے میری گھمسی بندھ گئی اور آپ کہتے ہیں کہ خطرناک تھا۔“

”لیکن صاحب تصویر میں وہ بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ ہو سکتا ہے اس نسل کا کوئی اور چیتا موجود نہ ہو۔ ہم اپنی آئندہ نسلوں کو کیا بتائیں گے کہ ہمارے ہاں کیسے کیسے جانور ہو کر تھے۔“

”ہاں اس کا ہم نے انتظام کر لیا ہے۔“

”وہ کیا؟“

”ہم نے اس کی کھال میں جس بھرنے کا آرڈر دے دیا ہے..... اب وہ خطرناک بھی نہیں رہے گا اور نہ ہی اسے خوراک دینے کی ضرورت پڑے گی بلکہ میں بھی اسے اتنے لگا کر دیکھوں گا کہ اس کی کھال کیسی ہے.....“

”بہت بہت شکریہ! تو خواتین و حضرات اب بہادری کے تھے دینے کی تقریب شروع ہونے کو ہے۔ ہمیں آپ سے صرف یہی کہنا ہے کہ نئے نئے بچوں کو گھر سے باہر نہ جانے دیجئے چاہے وہ چیتے کے بچے ہی کیوں نہ ہوں..... شکریہ!“

”شکریہ تو ادا کرنا چاہیے“

عارف میاں کو میں کب سے جانتا ہوں جب ہم دونوں چوتھی جماعت میں پڑھا کرتے تھے ہم دونوں دراصل نہیں پڑھتے تھے۔ پڑھنا صرف میں تھا اور وہ دیگر عارفانہ حرکات میں مشغول رہتے..... سگریٹ یا بٹری ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا جی ہاں اس وقت ان کی عمر تقریباً دس برس کے لگ بھگ ہوگی..... اس کے علاوہ مزاج بھی لڑکپن سے عاشقانہ رکھتے تھے۔ مجھے بھی گھر والوں سے بار بار وارننگ ملتی کہ عارف میاں سے دور رہ کر و ان کے لہجے کچھ ٹھیک نہیں ہیں..... اور یہ حقیقت ہے کہ ان کے لہجے کچھ ہی نہیں بہت زیادہ ٹھیک نہیں تھے..... چوتھی جماعت کے بعد میں ایک دوست سکول میں چلا گیا اور ہماری ملاقاتیں کم ہو گئیں..... پھر صرف خبریں ملیں کہ عارف میاں مسلسل فیل ہو رہے ہیں۔ ان کے والد نے سکول سے اٹھا لیا ہے۔ اور جب میں کالج پہنچا تو اطلاع آئی کہ وہ صرف گوان کی بڑھی ہوئی عارفانہ حرکات کی وجہ سے گھر سے نکال دیا گیا ہے۔

اس دوران میں ملک سے باہر چلا گیا اور ان سے رابطہ مکمل طور پر ٹوٹ گیا۔ چھ سات برس بعد جب واپسی ہوئی تو ایک روز عارف میاں ملنے چلے آئے..... ایک بے حد بکے ہوئے تانگے میں سے اترے شاید سوٹ میں ملبوس انگلیاں سگریٹ نوشی کے باعث زرد اور دانت پتھر نہیں کیا کیا نوشی سے پیلے معلوم ہوا کہ گھر سے نکلنے کے بعد انہوں نے اپنا ذاتی کاروبار شروع کر لیا۔ ادب خبر سے لاکھوں میں کھیلتے ہیں اور کوئی بڑی صنعت لگانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ البتہ ان کی حرکات بدستور عارفانہ تھیں۔ چند روز اُن کے ہمراہ گھومنے کا اتفاق ہوا۔ تو عجیب و غریب تجربے ہوئے..... تانگے پر کار ہو کر اُسے صرف اتنا کہتے کہ چل بھٹی اور تانگہ چل پڑتا اور انہیں وہاں لے جاتا جہاں وہ جانا

جانتے تھے اور جہاں بیشتر شریف آدمی نہیں جانا چاہتے۔ بلکہ ان علاقوں میں دیکھا بھی نہیں جاتا چاہتے..... ان علاقوں میں عارف میاں بے حد مقبول تھے۔ اپنے روپے پیسے کی وجہ سے اور اپنی لمبے دار گنگو کی وجہ سے..... گھر گ کی کسی ویران سی کوٹھی میں مقیم تھے تاکہ پراثر کوٹھی میں خلل نہ پڑے..... میں بچپن کی دوستی کے باوجود ان کا ساتھ اتنی دور تک نہ دے سکا اور ہم دور ہو گئے..... کبھی کبھار کسی بیاہ شادی پر نظر آجاتے اور سلام دعا کے بعد نصرت ہو جاتے۔

یہی عارف میاں اگلے روز میرے ہاں تشریف لے آئے۔ کہنے لگے میوہ پستان میں کسی عزیز کی خبر لینے آیا تھا سو چاقم سے تمنا چلوں..... میں نے چائے پلائی اور کہا کہ میں تو صرف یہی پلا سکتا ہوں وہ قہقہہ مار کر ہنسنے اور چائے کے ایک اور گلاس کا مطالبہ کیا..... اس کے بعد وہ حیرت انگیز واقعہ ہوا جس کے لئے میں نے عارف میاں کی ہٹری ٹیٹ بیان کی ہے۔ انہوں نے ہڑ ہڑا کر وقت دیکھا اور ابھی آیا کہہ کر غائب ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئے اور پھر گنگو دیں سے شروع کر دی جہاں پر چھوڑ گئے تھے میں نے پوچھا "عارف میاں کہاں گئے تھے؟" کچھ شرمندہ سے ہوئے اور کہنے لگے "کیس نہیں....." میں نے کہا "کسی پکڑ میں گئے ہو گے؟" گھبرا کر بولے "نہیں یاد" میں نے پوچھا "پھر کہاں گئے تھے؟"

سر جھکا کر بولے "ذرا نماز پڑھنے گیا تھا مسجد میں۔"

"نماز؟" حیرت سے میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"اور سناؤ بال بچوں کا کیا حال ہے؟"

"وہ تو ماشا اللہ ٹھیک ہیں لیکن عارف تم اور نماز؟"

"بھئی..... وہ بس ہو جاتا ہے ناں..... کیوں میں نماز نہیں پڑھ سکتا"

"لیکن عارف....."

تب عارف میاں نے مجھے ایک کہانی سنائی کہنے لگے: "ایک مرتبہ کراچی جانا ہوا یہی کوئی دو تین برس پہلے کی بات ہے۔ میری عادتیں وہی تھیں جنہیں تم کیا سا راز مانہ جانتا ہے..... بہر حال

شام کو ایک دوست کے ہمراہ ذرا موڈ ٹھیک کیا اور پھر کوساٹی میں ایک جگہ ٹینون کیا کہ ہم آرہے ہیں اور وہاں ہم اکثر جایا کرتے تھے۔ راستے کے گیارہ بجے ٹوٹل سے نکلے، چونکہ ذہنی طور پر تیار ہی نہیں تھے اس لئے دو تین گھنٹے اور عرصہ گھومنے کے باوجود وہ مکان نہ ملا جہاں ہم متوقع تھے..... رات کے دو بجے کے قریب میں ہی ایک مکان کی گھنٹی بجائی صاحب مکان ادھتے ہوئے باہر آئے۔ ہم نے کہا کہ جی ایک مریض بیمار ہے اس لئے فون کر رہے..... انہوں نے ڈرائنگ روم کھول دیا۔ جتنی دیر میں نے فون پر اس مکان کے مینوں سے ان کے گھر کا نمبر دوبارہ پوچھا اور بتایا کہ آپ انتظار کریں ہم پہنچ..... صاحب مکان چائے لے آئے..... اور ان کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں معلوم ہے کہ ہمارا کوئی مریض بیمار نہیں اور ہم کس قسم کے "ٹاکٹر" کو فون کر رہے ہیں۔ لیکن وہ مسکراتے رہے اور بار بار ہماری آمد کا شکریہ ادا کرتے رہے۔ ہم باہر آئے اور بڑی دیر تک ان کی فراش کا شکریہ ادا کرتے دوہرے ہوئے رہے..... بھلا رات کے دہ بجے جو شخص اپنے گھر کا دروازہ کھول دے اور فون کرنے دے، چائے پلائے اس کا شکریہ کس طرح ادا کرتے بلکہ کری نہیں سکتے تھے۔ بہر حال ہم وہاں گئے جہاں جانا تھا..... واپسی پر صبح ہو رہی تھی۔ ہم تھکے ہوئے تھے۔ وہ کسی مسجد میں اذان ہو رہی تھی..... میں ادھکتا ہوا اُسے سنارٹا اور یکدم میرے ذہن میں ایک خیال آیا..... عارف میاں آج رات ایک اجنبی شخص نے تمہیں ساٹھ پیسے کا فون کرنے دیا اور پچاس پیسے کی چائے پلائی اور تم اس کا شکریہ ادا کرنے کے دہرے ہو گئے ہمیشہ کے لئے اس کے احسان تلے دب گئے..... تو پھر جس نے تمہاری تمام قربانیوں کے باوجود لاکھوں روپے دیئے۔ شاندار کوٹھیاں، کاریں اور بال بچے دیئے یا اس کا شکریہ بھی تو ادا کرنا چاہیے..... میں نے کار مسجد کی طرف موڑ دی..... اور بس اس کے بعد اس کا شکریہ ادا کرتا رہا ہوں اور کسی بات کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا..... شکریہ تو ادا کرنا چاہیے ناں؟"

"ہاں؟" میں بول نہ سکا اور بیٹھے ہوئے گھٹے سے کہا۔

"شکریہ ادا کرنا چاہیے؟"

”پاکستان اور رابنس کروڑو“

چٹھی کے روز حسبِ مول میرے گھر میں ہڑبونگ بھی ہوئی تھی۔ بچے شور مچا رہے تھے۔ سکول کا کام کر رہے تھے۔ بلند آواز میں ٹیپوٹرین کر سٹلر کے گانے گارہے تھے اور میں پینزن کے ایک پورے کو سامنے رکھ کر صبح رہا تھا کہ ابھی تک اس میں کلیاں کیوں نہیں آئیں۔ جبکہ باغوں میں گلزاروں میں پینزی کے پھولوں کے ڈبیر دکھائی دے رہے ہیں۔ شاید میرے ہاں دھوپ کم ہے اس لئے روشنی زیادہ نہیں اس لئے۔ یا یہ کہ میں ہر صبح ان پودوں کو دیکھ کر گھورتا رہتا ہوں۔ ان کا معائنہ کرتا رہتا ہوں اور پودوں کو یہ بات پسند نہیں کہ ان کو ڈسٹرب کیا جائے اس لئے انہوں نے پھول دینے سے انکار کر دیا ہے۔ تب میرے چھوٹے بچے لابیوں کی طرح لڑتے ہوئے غصے سے لال بھبھو کا باہر آئے اور ابو دیکھیں اس نے..... نہیں ابو میں نے کچھ نہیں کہا یہ تو..... ابو ابو اس نے مجھے پٹے مارا..... کا شور مچا دیا.....

”خاموش“ میں نے غرج کر کہا۔

دونوں خاموش ہو گئے۔

”اب بتاؤ کیا ہوا ہے.... پہلے تم عینی“

”عینی نے اپنے سرخ گالوں پر لڑکتے آنسو پونچھے اور کہنے لگی: ”دیکھیں ابو سیر کرتا

ہے کہ سرسوں سرخ رنگ کی بوٹی ہے۔“

”اور آپ کیا کہتی ہیں؟“

”میں کہتی ہوں کہ سبز رنگ کی بوٹی ہے..... میں ٹھیک ہوں نا ابو..... ہم جو سرسوں کا

سائل کھاتے ہیں وہ سبز رنگ کا ہوتا ہے نا؟“

”اور آپ جناب کا خیال ہے کہ سرسوں سرخ رنگ کی بوٹی ہے کیوں؟“ میں نے سیرے

مخاطب ہو کر پوچھا۔

”ابو اس لئے اس کا نام سرسوں ہے..... سرخ رنگ کی چیز کو ہی سرسوں کہتے ہوں

مے.....“

”کہاں ہے؟“ میں نے غصے سے کہا۔ ”تم ایک پینڈو شخص کے بچے ہو جو اپنے کسان

پس منظر پر فخر کرتا ہے۔ گاؤں کے حوالے سے ڈرامے لکھتا ہے اور تمہیں یہ پتہ نہیں کہ سرسوں

کس رنگ کی بوٹی ہے؟“

”پینڈو تو آپ ہیں ابو“ سیر نے کہا۔ ”ہم تو شہر کے رہنے والے ہیں..... ہم نے کبھی

سرسوں دیکھی ہی نہیں ہیں کیا پتہ کیسی بوٹی ہے؟“

اور بچے درست کہہ رہے تھے۔ پچھلے پورے برس میں میں صرف ایک مرتبہ لاہور سے

باہر شہر قیور کی جانب گیا تھا اور اس روز بھی مجھے احساس ہوا تھا کہ میں اب صرف نام کا پینڈو

اور صرف فیشن کے طور پر کسان ہوں۔ ورنہ میرا رابطہ کھیتوں، درختوں اور کھلی فضاؤں سے

کٹ چکا ہے۔ اور اس سفر کے دوران میرے بچے میرے ساتھ نہیں تھے..... میں اپنے

طور پر انہیں پینڈو رکھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا لیکن انہیں کچھ لاہور سے باہر لے کر نہیں گیا

تھا..... بچے اگر سرسوں کو سرخ یا سبز رنگ کی بتا رہے تھے تو ان کا قصور نہ تھا۔

”آج ہم لاہور سے باہر جائیں گے پلنگ منانے کے لئے، چلو تیار ہو جاؤ۔“ میں

لے اعلان کیا۔

یہ اعلان بچوں کو بے حد پسند آیا جو فوراً اپنے جوگر شوز اور جرابیں ڈھونڈنے لگے

لیکن بیگم صاحبہ باورچی خانے میں سے ہاتھ میں ڈوئی پکڑے برآمد ہوئیں اور اسے ایک تولیہ

کی طرح لہرا کر بولیں: ”ایک تو تمہاری زندگی میں ڈپین نہیں ہے۔ تمہیں کچھ پتہ نہیں کہ تم کیا

کمر نہا رہے ہو.... اب آرام سے بیٹھے بٹھائے نہیں پلنگ پر جانے کی کیا سوچھی ہے....
 "بیگم! میں نے نہایت الفت بھرے انداز میں کہا: ہم شہر دہلی میں قید ہو گئے ہیں۔ یہیں
 کبھی کبھار کھلی فضاؤں میں ہیں سانس لینا پہلے ہے۔"
 "اور دوسرے تم رومانوی ہوئے تو اس عمر میں.... تھیک ہے ہاؤ باکر فضا میں سانس
 لو میں نے نہیں رد کیا ہے؟"

"بیگم اگر سانس بھی کون تو تم مجھے نہیں روکو گی۔ لیکن پسند جو ہانڈی تم نے پکار رکھی ہے
 اسے ساتھ لے لو اور آج میرے ساتھ جوانی کی باریں تازہ کرتے ہوئے پلنگ پر چلو۔"
 "جوانی کی یادیں؟" بیگم یکدم چوکنی ہو گئیں۔ "میں تو کبھی تمہارے ساتھ پلنگ پر نہیں گئی
 کس کے ساتھ گئے تھے؟"

اس دوران تینوں پتے تیار ہو کر باہر آ گئے اس لئے ہم نے گفتگو یہیں ختم کر دی۔

"لیکن جانا کہاں ہے؟" سلیم نے پوچھا۔

"بھئی یہاں گھر سے نکلتے ہیں.... راوی کی طرف۔ خوراک ہمارے پاس ہو گی۔ کسی بھی
 پر فضا متام پر دیں گے اور پلنگ مناس نہیں گئے۔"

"اور وہ تمہارے چیلے پائے جیسی کے روز چائے پینے آ جاتے ہیں ان کا کیا ہو گا؟"
 بیگم نے پوچھا۔

"میں آج آزاد ہو جانا چاہتا ہوں؟ میں نے سینہ تلان کر ایک لمبی سانس سہری.... آہ....
 تازہ ہوا.... مسروروں کے کھیت اود.... اور.... اور پتہ نہیں کہا کیا کچھ.... آؤ
 بچو...."

ہم سب نوٹر سائیکل پر سوار ہوئے۔ راستے میں خوراک کی خریداری کی اور راوی کی
 جانب روانہ ہو گئے۔ ہل پار کرنے کے بعد پلنگ کے مقام کی تلاش شروع ہوئی....

مقبرہ جہانگیر کے بارے میں کیا ہے؟
 "دفع کر دو۔" بیگم بولیں۔ زندگی میں ایک بار باہر لائے ہو تو مقبرے میں جاتے

ہو....

"راوی کے کنارے کسی پیر سکون ریتی جگہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"وہاں سرسوں ہو گی؟" بچوں نے پوچھا۔

"سرسوں تو شرقپور روڈ کی طرف ہو گی۔"

"تو پھر وہاں چلتے ہیں؟"

میں نے اپنا موٹر سائیکل شرقپور کی جانب موڑ دیا۔ ٹریکٹر، ٹرائیاں، بسیں اور

انسانوں کا ہجوم.... لاہور میں بس ایک ہی خامی ہے کہ یہاں انسان اکیلا نہیں ہو سکتا....

اس کے آس پاس کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں پہنچ کر لاہور پیچھے رہ جائے، آبادی ختم ہو

جائے اور آپ کسی گوشے میں بیٹھ کر سکھ کے چند سانس لے سکیں.... لاہور ایک اجتماعی

خاندان کی طرح رہتا ہے.... آپ کہیں بھی چلے جائیں.... مقبرہ جہانگیر، جلو پارک، شالیمار

.... اور وہاں آپ کوئی نہ کوئی واقف کار مل جائے گا.... بھابی کی حال اسے؛ بھائی جان

آپ کہاں گھوم رہے ہیں؟.... چاچا جی سلامائیکم.... اس معاملے میں اسلام آباد کے

باسی خوش قسمت ہیں.... وسیع میدان اور پہاڑیاں جو ان دنوں دھوپ میں نہری ہو

جاتے ہیں.... سرکڈے، درخت، بھیلیں.... کسی بھی شاہراہ سے ہٹ جائیں تو جنگل

شروع ہو جاتا ہے.... شرقپور روڈ پر متعدد جگہ کے لیکن کوئی بھی ایسی جگہ نہ ملی جو

پلنگ منانے کے لئے مناسب ہو.... اکثر جگہ کھیتوں کو پانی دیا ہوا تھا.... ایک مقام

پر شرک سے ذرا دور ہوئے تو موٹر سائیکل کے پیچھے کتے لگ گئے اور بچہ لوگ بے حد

خوفزدہ ہوئے۔ ایک جگہ پسند آئی تو وہاں بھینسیں آگئیں اور بیگم نے وہاں بیٹھنے سے

انکار کر دیا.... بچے بھی سرسوں کے کھیت دیکھ کر اکتا چکے تھے اور اب انہیں

بھوک لگ رہی تھی۔ چنانچہ سلجوق نے بیزار ہو کر کہا: ”ابوہم نے کھلی فضا میں بہت سارے سانس لے لئے ہیں اور سرسوں کے کھیت دیکھ لئے ہیں۔ اب واپس چل کر اپنی ڈانٹنگ ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔“ اس تجویز کا سب نے خیر مقدم کیا لیکن بیگم نے ایک اور تجویز پیش کی: ”تم کبھی کبھار کسی سید صاحب کا ذکر کرتے ہو جو شہر قورقور و دیگر کھیتوں کے درمیان رہتے ہیں اور تمہارے دوست ہیں..... وہ کہاں رہتے ہیں ادھر.....؟“

اب یہ سید صاحب جو ذرا گم گم اور کھوئے کھوئے کبھی کبھار میرے پاس آتے تو تھے اور یہ بھی کہتے تھے کہ تارڑ صاحب میں نے دنیا سے الگ ایک اپنی دنیا بنا لی ہے، کبھی آئے گا..... لیکن بول چٹھی کے دن بال بچوں کی فوج کے ساتھ بغیر اطلاع کئے ان پر دھاوا بول دینا بھی تو شرافت نہ تھی..... میں قدرے ہچکچا یا تو بیگم کہنے لگیں۔ ”نان ہمارے پاس، گوشت ہم نے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ لیک بھی ہے ان کو کوئی تلف نہ ہوگی..... زیادہ سے زیادہ چائے کا ایک کپ پی لیں گے..... اور مجھے اس وقت چائے کی شدید طلب ہے..... اگر چائے نہ ملی تو شاید میں موٹر سائیکل سے گر جاؤں.....“ اب اگر کوئی سمجھدار غافل نہ ہوتا تو ایسے سنہری موقع سے فائدہ اٹھانا اور بیگم کو چائے نہ بلانا لیکن میں اب تک چکا تھا چنانچہ ہم نے سید صاحب کے گھر کی تلاش شروع کر دی..... سڑک کے صین کنارے پر ایک بلند دیوار تھی اور اس دیوار میں لوہے کا ایک بہت بڑا رنگ آلود پھانگ تھا جو بند تھا..... ہم نے دستک دی پہلے شریفانہ طور پر آہستہ آہستہ اور پھر تمام اہل خاندان اس پر کھے برسائے لگے۔ ایک سوراخ میں سے کسی بچے نے جھانکا ”کون ہے؟“ میں نے اپنا نام بتایا تو وہ غائب ہو گیا۔ خاصی دیر بعد ایک اور بچے کی آنکھ سوراخ میں نمودار ہوئی ”کون ہے؟“ میں نے پھر اپنا نام بتایا تو وہ غائب ہو گیا..... تیسری مرتبہ پھاٹک چرچرایا اور کھینے لگا..... سامنے

سید صاحب ہاتھ میں لوہے کے چند اوزار لئے کھڑے تھے۔ ان کے آس پاس ان کے بچے ہیں ایسے گھور رہے تھے جیسے ہم کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہوں اور ان کے ہمراہ ان کی مسکراتی ہوئی تندرنازہ بیگم ایک مرغی ہاتھ میں لئے کھڑی تھیں..... ہمارے پاس تو درتوں کوئی جہان نہیں آتا..... آئیے، آئیے..... بڑا اچھا کیا آپ نے.....“

سید صاحب اور ان کے بال بچوں کے کچے ایک عجیب و غریب دنیا تھی..... دو تین ایکڑ میں پھیلی ہوئی ایک دنیا جسے ہم حیرت اور مسرت سے دیکھ رہے تھے..... پچھلے درخت و تالاب اور سنہریوں کے پلاٹ، وسیع میدان اور ان کے درمیان ایک بند سطح پر سید صاحب کی رہائش گاہ.....

”ابو! یہ سارا گھرانہ کلب ہے؟“ عینی نے حیرت سے پوچھا۔

”آؤ میں تمہیں مچھلیاں دکھاؤں۔“ میر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

کامران نے سلجوق اور میر کو ساتھ لیا اور جنگل میں گم ہو گئے۔

”تقریباً بارہ برس قبل کچھ خاندانی اختلافات کی وجہ سے میں نے شہر چھوڑا اور یہاں آکر زمین خرید لی..... ان دنوں بے حد سستی تھی۔ پہلے ایک چار دیواری تعمیر کی اور پھر ایک دو کمرے بنائے اور رہائش اختیار کر لی۔“

”آپ کو خوف نہیں آتا تھا یہاں؟“ میری بیگم نے پوچھا۔

”آتا تھا، بیگم سید بولیں۔“ یہ علاقہ بالکل دیوان تھا اور ہم دونوں نے ایک ایسا پروگرام بنا رکھا تھا کہ میں رات بارہ بجے تک کام میں مشغول رہتی تھی۔ پھر میں سو جاتی تھی اور سید صاحب صبح تک جاگتے تھے۔ یہ عادت اتنی پختہ ہو چکی ہے کہ اب بھی ہم اس طرح پہرہ دیتے ہیں۔ شروع شروع میں چوروں نے کوشش کی لیکن اب ان کو معلوم ہے کہ ہماری تمام دیواروں میں کرنٹ ہے اور ہم کبھی غافل نہیں ہوتے۔“

”یہ دیکھئے یہ تالاب ہے جس میں تقریباً ایک ہزار مچھلیاں ہیں..... امروں، لمبول

اور مالٹوں کے درخت ہیں۔ یہ مرغی خاندن ہے.... یہ میری درکشاپ ہے جس میں مزدور کی تمام چیزیں خود تیار کرتا ہوں۔ اس گھر میں کوئی شے ایسی نہیں جو میں نے خود بنائی ہو۔ کرسیاں، میز، ٹوب دیل اور یہ پرانی کار۔ بچوں کے لئے جھوٹے.... سب کچھ میں نے خود بنایا ہے.... میری ضروریات محدود ہیں.... چھت میرے پاس ہے، سبزیاں ہم اگاتے ہیں، پھل بھی بے شمار ہے۔ مرغی اور مچھلی کا گوشت بھی اپنا ہے، ایک اور بسکٹ وغیرہ میری بیگم خود بنالیتی ہیں.... ہم بازار سے کپڑوں کے سوا کچھ نہیں خریدتے۔ بیگم سعید نے کچے ہوئے امرود توڑے اور تالاب میں پھینک دیے۔

”یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟“

”ہم پھل یا تو خود کھاتے ہیں یا پھیلیوں کو کھلاتے ہیں بیچتے نہیں.... آپ بھی کھائیے۔“

میرے بچے اس ماحول میں وحشی ہو رہے تھے۔ جیسے جنگل کے جانور چڑیا گھر میں بند رہنے کے بعد ایک مرتبہ پھر جنگل میں آگئے ہوں.... ہر شے میں ایک عجیب ذائقہ تھا۔ وہ ذائقہ جو کھیت اور شہر کے درمیان راستے میں کہیں گم ہو جاتا ہے اور ہم صرف گاجر، مولی، مائٹے یا امرود کی کوئی قسم کھاتے ہیں اور ذائقے سے بے خبر رہتے ہیں.... دوپہر کے کھانے پر ہم نے سعید صاحب کے گھر کی مرغی اور سبزی کھائی.... دہی کا ذائقہ بھی مختلف تھا اور مزیدار تھا.... کھلی فضا میں شاید ہر شے لریاں مزیدار ہو جاتی ہے.... دیوار کے پار گیندے اور گلاب کے کھیت تھے۔ جن کی گرم تپک ہوا کے دوش پر آتی تھی اور ہمارے آس پاس پھیل جاتی تھی۔

”میرے بچے بھی اس آزاد فضا میں بے حد خوش ہیں.... مجھے یقین ہے کہ یہ فطرت کے قریب رہنے کی وجہ سے نسبتاً ایماندار اور معصوم انسان بنیں گے.... ہم نے کوئی کوئی ملازم نہیں رکھا اور سارا کام مشترکہ طور پر کرتے ہیں.... مرغیوں اور مچھلیوں سے

اپنی آمدنی ہو جاتی ہے کہ گزارہ ہو جائے اور باقی ہم خود کھاتے ہیں اور مچھلیوں کو کھلاتے ہیں....“

واپس فطرت کے قریب جانے کی خواہش ہر انسان کے سینے میں پیدا ہوتی ہے جو سڑکوں، کاروں، عمارتوں، شہر، دھوئیں اور کثافت سے تنگ آ جاتا ہے۔ چند برس پیشتر امریکہ اور یورپ میں تو باقاعدہ ایک تحریک چلی تھی کہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بڑے شہر چھوڑ کر دیہاتوں اور جنگلوں میں جا بسے۔ اپنی ضروریات کی سب چیزیں خود بناتے اور غوراک زمین سے حاصل کرتے.... سعید صاحب کسی تحریک کا حصہ نہ تھے.... انہوں نے اپنی ایک انگ اور فطرت کے قریب دنیا بسائی تھی۔ اور وہ انہوں نے کامیابی سے بسائی.... میرے خیال میں وہ ایک ماڈرن رائسن کروند ہیں.... ایک پاکستانی رائسن کروند۔

گھر واپسی پر سارے بچے بالکل خاموش تھے.... وہ ایک نئی دنیا دیکھنے کی حیرت میں گم تھے۔ ایک ایسی دنیا جس میں ان کا دادا رہا کرتا تھا۔ ان کے باپ نے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی اور وہ اس سے محروم کر دیئے گئے تھے۔

”ابو اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ سرسوں کا گنیلا رنگ ہوتا ہے؟“ سمیر نے کہا۔

”کیا رنگ ہوتا ہے؟“

”سرخ۔“ وہ شرارت سے بولا۔

”الو کیا ہم دوبارہ بھی وہاں جائیں گے؟“ عینی نے پوچھا۔

”نہیں بیٹے.... اگر ہم دوبارہ وہاں گئے تو تمہارے لئے اس دنیا میں کوئی کشش نہیں ہوگی، وہ دنیا تمہیں گندہ اور گنوار لگے گی۔ اس کا وہ مان ختم ہو جائے گا.... کیونکہ شہر ہم پر غالب آچکا ہے اور ہم سرسوں کے کھیت دیکھنے کی بجائے دی سی آرزو زیادہ پسند کرتے ہیں؟“

”استنبول کا اکبرخان“

استنبول دنیا کے ان چند شہروں میں سے ایک ہے جو بے حد پرواہ ہوتے ہیں۔ اپنی خوب صورتی پر ناز ہوتے ہیں۔ انہیں مٹنے کے لیے آپ کو جھکنا پڑتا ہے۔ ان کی تعلیم کرنا پڑتی ہے۔ ورنہ وہ ناراض ہو کر رخ پھیر لیتے ہیں اور آپ ان کی خوب صورتی اور قدامت کو دیکھ نہیں پاتے۔۔۔۔۔ یہ خصوصیت ان تمام شہروں میں ہوتی ہے جو انسانوں نے نہیں بسائے ہوتے بلکہ انسان خواہش کر کے ان کے پاس جاتے ہیں کہ ہمیں اجازت دو ہم تم میں بسنے کو آتے ہیں۔۔۔۔۔ ایسے شہر ایک مقام میں کی طرح انسان کو اپنی جانب کھینچتے ہیں۔۔۔۔۔ انہیں انسان کی نہیں بلکہ انسان کو ان کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔۔۔ چنانچہ ہر دو چار سال بعد وہ اس شہر کی کشش کے آگے بے بس ہو کر اس کی جانب سفر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ میں استنبول کی بات کرتا ہوں۔ تقریباً دس بارہ برس پیشتر کی بات۔۔۔۔۔ استنبول کا حیدر پاشا سٹیشن ایذا میں واقع ہے۔ پیشتر سے باہر نکلے تو باسفورس میں کھڑے سیٹر آپ کو بندھو بیٹھو بھا بھا کر جاتے ہیں کہ آؤ یورپ چلیں۔ جیسے لاہور سٹیشن کے باہر تانگے واسے جاتے ہیں کہ آؤ لوہاری چلیں، آؤ جھاتی چلیں۔ ہر حال میں ایک سیٹر پر بیٹھا اور دس منٹ کے اندازہ باسفورس کے دوسرے کنارے پر براعظم یورپ میں تھا۔۔۔۔۔ اور یورپ میں اکبرخان تھا۔ میں سیٹر سے باہر نکل رہا تھا تو وہ پتہ نہیں کہاں سے نمودار ہو گیا۔ ”اسلام علیکم“ یو پاکستانی! اس نے دانت نکالتے ہوئے پوچھا۔ ”علیکم اسلام۔۔۔۔۔ ہاں پاکستانی؟“ میں نے جواب دیا۔

”میں اکبرخان ہوں۔“ اس نے بیٹھے پر ہاتھ جما کر کہا: خدا حافظ اکبرخان! میں نے اپنا سامان اٹھایا اور ہل غلط کی جانب چلنے لگا۔۔۔۔۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ جناب میں آپ کا پاکستانی بھائی ہوں۔ یہاں استنبول میں ڈیڑھ سے کمرہ ہوں اور بھائیوں کی مدد کرتا ہوں۔۔۔۔۔ آپ پر دیسی ہو۔ میں آپ کو ہوٹل

سے پہلے

میں کچھ زیادہ پردیسی نہیں ہوں اکبرخان۔ میں نے بیزار ہو کر کہا۔ ارض روم سے استنبول تک دو دن اور دو رات کا سفر انسان کو شتر مرغ بنا دیتا ہے۔ میں شاید دسویں مرتبہ ادھر آ رہا ہوں۔ خود ہی ہوٹل چاہاؤں گا۔

”وجاہ آپ بھائی ہو ہمارے۔ یہ جو ترکی ہیں ناں، بڑے چالاک ہیں۔۔۔۔۔ مجھے پتہ ہے ترکی آتی ہے بول کر دکھاؤں؟“ اس کے بعد پتہ نہیں وہ ترکی زبان میں یا کسی اور زبان میں گانے لگا۔۔۔۔۔ میں جب اس ہوٹل کے کاؤنٹر تک پہنچا جہاں مجھے ٹھہرنا تھا تو اکبرخان بھی میرے ساتھ چکا ہوا تھا۔ وہ ہوٹل کے ایک کونہ پر نہیں کیا کہتا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہتا لو جی میں نے سفارش کر دی ہے۔ کہتا تھا کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں نے کہا یہ میرے بھائی جان ہیں۔ ان کو کمرہ ضرور ملنا چاہیئے اور جناب دس لیرے کم کر دینے میں کراتے ہیں۔

جب تک میں اپنے کمرے میں جا کر مقفل نہ ہو گیا وہ بولتا رہا۔ پچھلے پیر میں ہوٹل سے باہر آیا تو وہ ایک چائے خانے کے باہر بیٹھا ایک سوکھا ہوا نان کھا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تیر کی طرح میرے پاس آیا اور پھر شروع ہو گیا۔ اچھا اچھا آرام کریا ہے۔ لو جی جان نان کھاؤ۔ ترکی نان ہے۔۔۔۔۔ چائے پو گئے۔۔۔۔۔ اس سے پیشتر کہ میں کچھ کہتا اس نے ترکی زبان میں چائے کا آرڈر دے دیا۔ مجھے اس کے پاس بیٹھنا پڑ گیا۔ میں جناب ڈیڑھ سے کمرہ ہوں۔۔۔۔۔ ادھر پاکستان میں ہرنی ہے۔۔۔۔۔ میں نے سوچا دفعہ کمرہ مل دولت اور کماؤں کو ذرا ترکی میں ڈیڑھ سے کرو۔۔۔۔۔ چائے آگئی جو ہم نے پی اور بل میں نے ادا کر دیا جو کچھ زیادہ تھا۔ اکبرخان چائے کے ساتھ اپنا نان کھاتا رہا۔

”اب کیا پروگرام ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”حضرت ایوب انصاری کے مزار پر حاضری دینے کا خیال ہے۔“ میں نے کہا۔

”اللہ اعلم“ اس نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا۔ بہت بڑے بزرگ ہیں جی۔۔۔۔۔ میں یوں سمجھو کہ استنبول کے ”تالانچی بخش“ ہیں۔۔۔۔۔ جلد میں بھی چلتا ہوں۔ آپ کو دکھا لاؤں۔ میں اس کی رفاقت کا خواہش مند

تو نہیں تھا لیکن مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ اسے سختی سے منہ کر دیتا۔

ہم بس پر سوار ہو کر حضرت ایوب افسلی کے مزار پر پہنچ گئے۔۔۔۔۔ یہ مزار قلعہ آئینول سلطان اور فاتح نے تعمیر کرایا تھا۔

آپ کو تروں کے لیے دانہ لائے ہیں؟ اس نے پوچھا۔

کون سے کو تروں کے لیے؟ میں نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

حضرت کے مزار کے مٹی میں جو کو تروں بیٹھے رہتے ہیں ان کو ہر ترک دانہ کھاتا ہے اور منت ہوتا ہے۔۔۔۔۔ لایے دس بیس بیس میں دانہ لے کر آنا ہوں۔

میں تو صرف زیارت کی خاطر آیا تھا۔ میں نے سختی سے کہا۔

نزدہ سربا کر لو۔ کو تروں کو دانہ اگر نہ کھایا تو حضرت ایوب ناما میں ہو جائیں گے۔ لایے بیس بیس

میں نے مجھ کو بیس بیس لے دئے۔ وہ باہر گیا اور دانے کی ایک ٹوٹی خرید لایا۔ حضرت ایوب کے

مزار سے ملحقہ ایک قبرستان ہے۔۔۔۔۔ مجھے معلوم نہیں وہاں کون کون دفن ہے۔ لیکن اس کی قدمت سے

اندازہ ہوتا ہے کہ کیا کیا لوگ وہاں گئے جو اس کی خاک میں سوتے ہیں۔۔۔۔۔ اس قبرستان سے آئینول کا نظام بھی

سحرانیز ہے۔ میں اس قبرستان کے آخر تک گیا۔ جہاں سے چٹانوں کے کنارے کے نیچے سمند تھا۔ کبریاں

میرے ساتھ ساتھ باتیں کرتا چلا جاتا تھا۔۔۔۔۔ ٹوٹی واپسی پر ہم نے ایک رستوران میں کھانا کھایا۔ کھانے کا بل

ظاہر ہے میں نے ادا کیا۔

اگلے روز میں صبح سویرے ٹوٹی سے نکل کر ایک واقعہ کار کے ہاں چلا گیا اور سارا دن وہی گزارا۔ شام کو واپس آیا تو وہ ٹوٹی کی سیر میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔

جناب آپ کہاں چلے گئے تھے؟ چپ چاپ۔۔۔۔۔ وہ ناراض ہو کر کہہ رہا تھا۔

میں نے سوچا پر دس کا معاملہ ہے جاتی جان کا پتہ کراؤں۔۔۔۔۔ آؤ ایک پیالی کافی کی چاؤں آپ کو

کبریاں تقریباً تیس برس کا ہو گا۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ لیکن ملک ملک کی خاک چھاننے کی وجہ

سے اس میں زندہ رہنے کی جدوجہد بڑی طاقتور تھی۔ اس شام کافی کا بل ادا کرنے کے بعد میں نے تھکاوٹ

کا بیان کیا اور کمرے میں واپس آ گیا۔ اگلے روز میں صبح سویرے نکل گیا اور گنتی رات واپس آیا۔ اس سے

اگلی صبح میں ویران سوئیا۔ ہاشمتہ کرنے کے بعد جب واپس آیا تو وہ ٹوٹی کی سیر میں بیٹھا تھا۔ لیکن

کچھ تھا تھا سا اور۔۔۔۔۔

کہاں کر دیا ہے آپ نے۔ مجھے بتایا ہی نہیں آپ نے۔ ترکی بڑا خطرناک ملک ہے۔۔۔۔۔ اکیلے

گھومتے رہے جاتی جان۔۔۔۔۔ آؤ چکر کی ٹوٹی میں ہاشمتہ وغیرہ کر لیں۔

ہاشمتہ تو میں نے کر لیا ہے کبریاں اور آج شام کی گاڑی سے میں ایوب چار ہوں۔

اچھا؟ اس کا چہرہ اڑ گیا؟ ہاشمتہ نہ کریں چلیں چائے تو پی لیں۔

نہیں۔ میں نے سختی سے کہا۔ تم کیا بگڑے ہو کہ میں بے وقوف ہوں۔ مجھے ایک دم غصہ آ گیا۔ چائے

ہاشمتہ۔۔۔۔۔ کھانا۔۔۔۔۔ مجھے تو بتاتے ہو۔۔۔۔۔ خبردار جواب میرے ساتھ آئے تو۔۔۔۔۔ دفع ہو جاؤ۔

اس کا اترا ہوا چہرہ زندہ ہو گیا۔ معاف کرو جاتی جان۔ اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے۔

مجھے بھی خدا ہی اپنے کیے پر ندامت ہونے لگی۔ آؤ چائے پیتے ہیں؟

پر پہلے معاف کرو۔ وہ اسی طرح ہاتھ جوڑے سیر میں بیٹھا۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ میں

نے اپنے گھر کو چھوڑا جس میں اللہ کا دیا بہت سارا ذوق تھا۔۔۔۔۔ صرف جرمی جانے کے لالچ میں۔ اب پچھلے

چھ مہینے سے یہاں پڑا ہوں۔۔۔۔۔ جس روز شیش پر آپ سے بات چیت ہوئی تھی تو تین روز ہو گئے تھے بغیر

کہ کھاتے پیئے۔ پھر آپ نے چائے پی لیا۔ کھانا کھایا۔ میں نے کو تروں کے دانے میں سے بھی پیسے پکڑے۔

آپ معاف کر دیں۔۔۔۔۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو ان میں اس سمند کی نفی تھی جس کے کنارے وہ بے آسرا رہے

سباز پڑا ہوا تھا۔

مجھے یاد آیا کبریاں۔ میں نے اس کے کنارے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ میں نے تو ابھی ہاشمتہ بھی نہیں

کیا۔۔۔۔۔ آؤ کسی لہجے سے رستوران میں پکڑتے ہیں۔

کالا جادو - کھوپڑیاں - سیاہ بچھو اور آفریدی

انسان غائب بدوش ہو تو اللہ کی زمین پر اسے کدو لگاتے ہیں۔ اگر ادیب ہو یا ٹیلی ویژن سے تعلق ہو تو کدو ابل کے خط آتے ہیں۔ یہ کدو زندگی کی روٹیں سے الگ اپنی دنیا میں رہتے ہیں۔ ہم ان سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ ہم ان پر سنیں بھی سکتے ہیں لیکن..... وہ ایک مختلف سطح پر زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ غائب بدوشی کے دور ان کبھی کسی شہر میں اور کبھی کسی صوبہ میں۔ اور کبھی جنگل میں ایسے لوگ ملے جو میرے سفر ناموں کے کدو بنے۔ میں نے انہیں اس لیے چنا کہ وہ مختلف تھے۔ وہ زندگی کو کسی اور طرح گزارتے تھے۔ کسی سانپ نے میں فٹ نہیں ہو سکتے تھے۔ ان میں تیران کا سکہ پ تھا۔ اشیلیہ کا وہ امریکی تھا جو زمین موٹر سائیکل پر سفر کرتا تھا۔ ہرات کا وہ جرمن تھا جو صرف طوط آفتاب دیکھنے کی غرض سے وہاں آتا تھا۔ کدو آراء کے دامن میں وہ ترک چڑھا تھا جو بات بے بات پر خیر نکال دیتا تھا..... اور اسی قسم کے کدو ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ ہر آدمی عام لوگ یاد نہیں رہے۔ جو ہماری دکھتری میں تار مل کھاتے ہیں۔ لیکن وہ یاد رہے جو دوسروں کے الگ تھے۔

ادب اور ٹیلی ویژن کے حوالے سے خط آتے ہیں اور ان میں کئی ایسے لوگ ہوتے ہیں جو منفرد شخصیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان میں ایک صاحب ہیں جو پھیدیاں پکڑنے کے شوقین ہیں۔ کراچی میں رہتے ہیں اور پھیدوں کی باتیں کرتے ہیں۔ صوبائی کے قبضے خورشید کے شیریں ہیں جو ایک دور افتادہ گاؤں میں رہنے کے باوجود ادب پر نظر رکھتے ہیں اور کڑی نظر رکھتے ہیں اور بے شمار لوگ ہیں جن سے میری خط و کتابت ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ میں قدرے معروف ہونے کی بنا پر خط و کتابت کر نہیں سکتا۔ ان کی شخصیت مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں ان کے جواب ضرور دوں۔

ایک ایسی ہی شخصیت ریاض آفریدی کی ہے۔

میں اسے صرف غلوں میں ملا ہوں..... موصوف اتنے دلچسپ ہیں کہ میں اپنے قارئین سے ان کا تعارف کروانا چاہتا ہوں تاکہ لوگ جان جائیں کہ یہاں کیسے کیسے نادر اور بے مثل نمونے پائے جاتے ہیں۔ کیسے نادر وجود پر ہمارا دل بے پرواہ لوگ ہیں جن کی اپنی ایک الگ دنیا ہے اور وہ کتنے مطلق اور کتنے خوش ہیں۔ انہیں دنیا کی کوئی پرواہ نہیں کہ کون کیا کہتا ہے اور اگر ہم یہ کریں گے تو کون کیا کہے گا۔ وہ صرف وہی کچھ کرتے ہیں جو ان کا جی چاہتا ہے۔

ریاض آفریدی کا پہلا خط آیا تو میں اس کے مشاغل کی تفصیل پڑھ کر چونکا۔ یعنی ویڈیو فلمیں بنانا، فلم کرنا، فوٹو گرافی، نوادرات جمع کرنا، اداکاری کرنا اور خاص طور پر بادشاہ کی اداکاری کرنا، پرندے پکڑنا، کدو پانی، مسنون مکھن، سانپ پالنا، بچھو پکڑنا، بندر اور کتے رکھنا، کالا جادو کرنا وغیرہ وغیرہ۔ میں نے سوچا یہ شخص مجھے متاثر کرنے کی غرض سے یہ سب کچھ لکھ رہا ہے۔ چنانچہ میں نے چند سطور جواب میں لکھ دیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ موصوف واقعی یہ سب کچھ کرتے ہیں اور بڑی سنجیدگی سے کرتے ہیں۔ کوئی مسکراتے یا اپنے انہیں کوئی پرواہ نہیں۔

میں نے لکھا کہ آپ کے سانپوں اور بچھوؤں کا کیا حال ہے؟ جواب میں لکھا کہ میرے سانپ اور بچھو میرے میں رہتے تھے۔ اب مٹی جون میں نئے پکڑیوں گا۔ اس کے ساتھ انہوں نے کم از کم ایک پالتو بچھو کی تصویر بھی روانہ کی۔

چرکتے ہیں کہ اگر ہو سکے تو جو کبھی آپ رسالوں کے لیے لکھتے ہیں وہاں فرضی تصاویر کی جگہ میری تصاویر لگا دیں۔ فرضی کیجئے کہ آپ کسی عیاش اور وطن ناپ مرٹ کے کی زندگی پر روشنی ڈالیں وہاں آپ میگزین پرنٹرز کو روانہ تصویر لگا دیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ غلوں کے ساتھ وہ اپنی زندگی کی تصاویر روانہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ تصاویر بھی بے حد دلچسپ ہیں۔ ان میں سانپ، بچھو، بندر، باز، کتے، پرندے وغیرہ عام پائے جاتے ہیں۔

ایک تصویر کسی شاہانہ دربار کے سب سے تخت پر بادشاہ اور ملکہ تشریف رکھتے ہیں۔ غلام حاضر ہیں اور ہنگام

اکڑ کر بیٹھے ہیں۔ ان میں ایک درباری آفریدی صاحب ہیں۔ تصویر کے پیچھے لکھتے ہیں: "یہ ہے احمد نیکو نامی کا لکھا ہوا ڈرامہ"۔ مصنفہ "میں شہزادہ مین کے روپ میں درباری بیٹھا ہوا ہوں۔ میرے ہاتھ میں اصلی ہیرے کی انگلی تھی چمک رہی ہے مگر انفس ان حد کرنے والوں نے مجھے اس ڈرامے میں سوائے درباری کے کوئی شائبہ نہیں دیا۔ کیونکہ میرا لباس بادشاہ سلامت اور دوسرے شہزادوں سے بہتر تھا۔ ہاتھ میں اصلی ہیرے کی انگلی تھی مجھے میں اصل موتیوں کے ہار اور تاج پر اصل یا قوت لگے ہوئے ہیں۔ جبکہ بادشاہ سلامت کے مجھے میں ایک بار بھی نہیں۔ انہوں نے مجھ سے پہنے کے لیے مانگے تھے میں نے انکار کر دیا۔ میں اس کے لیے تمام امانت مجھ سے حد کرنے لگے۔"

ایک تصویر بقول ان کے پانچ سو سال پرانی کھوپڑی کی ہے۔ جس پر ایک سانپ میٹھا ہے اور وہ سنائی پڑا ہوا دیکھو ریش کے لیے برابر میں رکھی گئی ہیں۔ آفریدی صاحب ان کے ساتھ کالا جادو سیکتے ہیں۔ ایک تصویر میں ایک میسے میں سٹال لگائے بیٹھے ہیں، اور ایک مشین کے ذریعے پیاس روپے فیس لے کر ہیرے اور جواہرات ٹیسٹ کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ بھی ان کا شوق ہے۔ اپنے فوٹ شدہ بچوں اور سانپوں کی تصویر بھی روانہ کی ہے۔

پہران کی ڈونوٹھیں میں جو ابھی تک ناخونک نہیں پہنچ سکیں۔ ان میں وہ خناسائیں سیر رہیں۔ کتوں کے ساتھ شکار کر رہے ہیں۔ مازن کے ساتھ خنجر آزمائیں۔ غم، ہیرے کی تلاش میں "ایک عرب سوداگر کے ساتھ۔ پھر جنگل میں جنگی آدمیوں کے ساتھ لڑائی اور اس طرح کے روٹنگے کھڑے کر دینے والے منظر۔

راجہ سالو کے غار میں سے نکل رہے ہیں اور ساتھ میں ایک بندر ہے۔ ایک پہاڑ پر چڑھ رہے ہیں اور کیا زبردست پوز بنا کر چڑھ رہے ہیں۔ اور ہاں پرانے سکے بھی جمع کرتے ہیں۔.... ان کے علاوہ گندھارا کے نمونے بھی تلاش کرتے ہیں۔ ہتھیاروں میں بھی دلچسپی ہے۔

اپنی زندگی کے بارے میں تحریر کرتے ہیں، خانان میرا آفریدی ہے۔ آفریدی قوم سے مفود یا دوسرے قبیلوں کے پٹان سمیت ڈرتے ہیں۔ میرا اپن خورست (کابل) کی سرحد کا ایک جاگیردار کا بیٹا تھا۔

ان کے چاچوں نے ان کے باپ کو یعنی میرے دادا کو جائیداد کے لیے قتل کر دیا، اور میرے باپ کو جو اس وقت صرف سترہ برس کا تھا ایک کمرے میں بند کر دیا تاکہ صبح صراحت سے کافیات بکھو اکس پر دستخط کر لے اور پھر اسے بھی قتل کر دیا جائے۔ رات کو کسی طریقے سے یہ کھڑکی توڑ کر وہاں سے بھاگ نکلے۔ اور رات کو جب سے پیدل ہی بھاگ نکلے اور چلتے ہوئے کو باٹ پہنچ گئے اور وہیں منیم ہو گئے۔ محنت مزدوری کی اور پھر ٹرنیڈڈ بن گئے۔ مجھ سے دو بڑے بھائی ہیں۔ ایک ٹرنیڈڈ ہے۔ دوسرا جنگلوں کی کٹائی کا ٹیکے دار ہے۔ میں جب پیدا ہوا تو میرا باپ مر گیا....."

"میں سانپوں، ٹکٹوں، پنڈوں کے بارے میں اور بچوں کے بارے میں بھی خوب جانتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میرا پڑھائی کی طرف زیادہ دل نہیں لگتا تھا۔ کیونکہ میرا خیال انہیں چیزوں میں اور سروسایات میں لگا رہتا تھا اور ویسے بھی میری انگلش کمزور ہے۔"

آفریدی صاحب ادب بھی ہیں اور ذہنی کوشش کے ساتھ یا بغیر کوشش کے انشائیہ نگار بن سکتے ہیں۔ ان کا ایک انشائیہ..... کل چودھویں کی رات۔ ملاحظہ فرمائیے۔

"جب کہ خدا کی تمام مخلوق کائنات سے بے نیاز نیند کی گہری گھاٹیوں میں پڑی سو رہی تھی، اس وقت بھی نہ معلوم کیوں چاند کی طرف ٹٹکی بانٹھے دیکھ رہا تھا۔ ہر طرف سکون طاری تھا۔ دنیا کی کشتی خود کے سکون آمیز سمندر کی سطح پر تیر رہی تھی۔ چاند کی افسردہ اور زرد روشنی میں ہلکا ہلکا درد چھن رہا تھا نہ معلوم کیوں میرے دل میں ان کی یاد نے انگڑائی لی۔ میں نے چاند کی طرف خود سے دیکھا۔ جب مجھ سے دریا گیا تو میں نے پوچھا۔ "اسے زخمی دلوں کو بے چین کرنے والے چاند۔ سچ بتا تو آج اس قدر افسردہ اور پریشان کیوں نظر آ رہا ہے۔ آہ چاند و"

تو آپ نے غلط فرمایا کہ آفریدی صاحب اگر کسی ادبی گروپ میں شامل ہو جائیں تو بڑی آسانی سے انشائیے کے آسمان پر طوح و فیرو ہو سکتے ہیں۔ ان کی تحریر میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو انشائیے کے لیے اہم ضروری ہیں۔

آفریدی صاحب نے جو ڈونوٹھیں بنائی ہیں ان کے بارے میں لکھتے ہیں: "مجھے یقین ہے کہ میری

دو نو فلموں کو ہر مکتبہ فلو کے لوگ پسند کریں گے اور شاید آپ کا اٹل آپ کو بار بار دیکھنے پر مجبور کرے گا۔ ان کی ڈائریکشن، کیمیرہ، میوزک کی ہدایات، بلکہ کیویشن سب میری اپنی ہے اور نہ ہی کوئی ریپرسل کی گئی ہے۔ میری فلموں میں ایک انگلینڈ کے انٹریز نے کام کیا ہے۔ اس کی ایک بات مجھے بار بار یاد آئی کہ تم مٹی میں پڑے ہوئے ایک نایاب پتھر ہو، اگر تمہیں تراش کر پالش کر دیا جائے تو دنیا کے مشہور قیمتی پتھروں میں گنے جاؤ گے..... مگر انھیں ہزارہ میں کون ہے مجھے پالش کرنے والا؟

میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ ریاض آفریدی ایک دنیا ہیں۔ ایک ایسی دنیا جسے دیکھ کر آپ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ دولت کی ہوس میں گرفتار دنیا سے الگ دنیا جس کے اپنے معصوم شعلے ہیں۔ اپنی علیحدہ زندگی ہے۔ ان کی باتوں میں ایک جھولن ہے۔ بچپن کی معصومیت ہے اور عیاری اور علم نہیں ہے۔

میں یہ کالم لکھ رہا تھا کہ عثمان سے قدیم تاریخ کے دانشور جناب ابن حنیف تشریف لے آئے۔ انہوں نے آفریدی کی چند تصاویر دیکھیں اور مسکرا کر کہنے لگے۔ "تاریخ صاحب کیا اس قسم کے کردار ہوتے ہیں؟" "ہاں؟ میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ خود ہی دیکھ لیجئے کہ کتنے دلچسپ ہیں۔" کہنے لگے۔ "لیکن ایسے کردار صرف آپ ہی کو کیوں ملتے ہیں؟" "اس لیے کہ میں خود اسی قسم کا ایک کردار ہوں اور وہ جان جاتے ہیں کہ یہ شخص ہیں سمجھ سکتے ہیں" میں نے ہنسنے ہوئے جواب دیا۔

انسان خانہ بدوش ہو تو اللہ کی زمین پر اسے کردار ملتے ہیں۔ اگر صاحب ہو یا ٹیلی ویژن سے تعلق ہو تو کرداروں کے خط آتے ہیں۔ ریاض آفریدی بھی ایک ایسا ہی کردار ہے۔

”دریائی گھوڑوں کو شرم نہیں آتی“

چند بچوں نے مجھ سے ایک عجیب و غریب سوال پوچھا۔ کہنے لگے۔ چاہا جی یہ بتائیں کہ کیا جانور بھی ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں۔ میں نے کہا بھئی بچہ حضرات جانور ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں۔ لیکن وہ واسے نہیں، جو چیز باہر میں پائے جاتے ہیں۔ بلکہ وہ واسے جو تم جیسے معصوم بچوں کو اغوا کرتے ہیں، ارشوت لیتے ہیں اور جھوٹ کر تے ہیں اور لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ بچوں کو یہ جواب مطمئن نہ کر سکا۔ کہنے لگے نہیں نہیں پہچان جی ہم تو یہ جانتا چاہتے ہیں کہ کیا مگرچہ ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں اور کیا سانپ بھی کارٹون دیکھتے ہیں..... میں انہیں کیا جواب دینا۔ انہیں پید کیا اور چلا آیا..... لیکن میرے ذہن میں یہ فقرہ اٹک گیا کہ کیا جانور بھی ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں؟ پھر میں نے سوچا کہ فرض کیجئے۔ صرف کچھ دیر کے لیے فرض کیجئے کہ جانوروں کی ایک دنیا ہو ایک ملک ہو تو ظاہر ہے وہاں ان کا ایک ٹیلی ویژن ہوگا اور اس ٹیلی ویژن پر ان کی پسند ناپسند کے پروگرام پیش کیے جائیں گے تو وہ پروگرام کس قسم کے ہوں گے؟ کیا شیروں کے لیے الگ پروگرام ہوں گے۔ گیدڑوں کے لیے الگ۔ اور کیا ان کی اناؤنسٹر خواتین ہیں وہ پتہ اڑھ کر بیٹھیں گی۔ ہر حال پروگرام تو بے شمار ہوں گے لیکن ان میں جانور گھر بہت پاپور پروگرام ہوگا۔ کیونکہ اس میں حاضرین سے مختلف سوال پوچھ کر انہیں انعامات سے نوازا جائے گا۔ تو یہ جانور گھر کیا ہوگا؟ میرا خیال ہے کچھ ایسا ہوگا کہ.....

ٹیلی ویژن سکرین پر میزبان ہاتھ میں یا پاؤں میں مائیک پکڑے خود دار ہوتا ہے۔ یہ میزبان کون سا جانور ہوگا۔ اسے رہنے دیجئے ہر حال یہ ایک فراشوخ و خلقی عمر کا شرسناں والا میزبان ہوگا..... تو یہ میزبان اگر تالیان جیسا ہے گا اور ہال میں تشریف فرما جانور خواتین و حضرات بھی خوب تالیان پائیں گے۔

”میرے پیارے بہن بھائیو! میزبان مکر آتا ہوا کہہ رہا ہے۔ ”میرے شیر، میرے گیدڑ... میرے سانپ! خرگوش! ہرن! مگر مجھ بھیڑیے! لہر! ادبلاڈ! دریائی گھوڑے! زبرے اور اونٹ وغیرہ وغیرہ میں آپ سب کو جانور گھر میں خوش آمدیہ کہتا ہوں۔۔۔۔۔ ایک درخواست ہے کہ کم از کم اس پر درگرم کے دوران ایک دوسرے کو خوش نہ کیجئے گا۔ یہ آداب کے خلاف ہے اور بعد میں بے شک جو جی میں آئے کیجئے گا تو پہلا سوال ہے کہ جنگل کے بادشاہ کا کیا نام ہے۔ جی تو میرے ہال میں سے کون جواب دے گا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہال میں بہت ساری دمیں اور پاؤں گھڑے ہیں۔ جی تو آپ دریائی گھوڑے صاحب آپ بتائیں گے۔“

”جی میں تو دریا میں رہتا ہوں جنگل میں نہیں۔ ویسے دریا میں میں بادشاہ ہوں۔“

”اوتے گھوڑے اوتے گھوڑے“ ہال میں نعرے لگتے ہیں۔ ”اوتے بادشاہ بقتے ہوشم نہیں آتی! گھوڑوں کو شرم نہیں آتی۔ اور دریائی گھوڑوں کو تو بالکل نہیں آتی۔ انہوں نے دریا میں نہانا جو ہوتا ہے کپڑوں کے بغیر“ دریائی گھوڑا جواب دیتا ہے۔

اس دوران ہال کے ایک کونے سے ایک عجیب و غریب آواز آتی ہے۔ جیسے کوئی خزانے لے رہا ہو اور پھر ایک رشتہ زدہ شیر اپنی طرف سے گرج کر کہتا ہے۔ ”اوتے میں ہوں جنگل کا بادشاہ شیر! بڑھا شیر! بڑھا شیر! ہال میں پھر نعرے لگتے ہیں۔“

”خواتین و حضرات براہ مہربانی منانوں جیسی حرکات نہ کریں اور خاموشی سے سوالوں کے جواب دیں۔“ میزبان تنگ آکر کہتا ہے۔

”اگر خاموش رہیں گے تو سوالوں کے جواب کیسے دیں گے۔“ ایک خرگوش معصومیت سے کہتا ہے۔ ”کوئی شعر سنا دیجئے سر“ ایک لومڑی فرمائش کرتی ہے۔

”میں سناؤں۔“ ایک شوخ لومڑا اٹھ کر کہتا ہے۔۔۔۔۔ عرض کیا ہے۔۔۔۔۔ لومڑی لومڑی کی ہوں آپ ہی لومڑی ہوا۔ کیا ہے؟“

لومڑی شیراکر ”اُف اُف“ کہتی ہے اور اپنی دم منہ پر رکھ لیتی ہے۔

”تو جناب اگلا سوال ہے۔“ میزبان ہال میں گھومتا ہوا کہتا ہے۔ ”دنیا کا بلند ترین جانور کونسا ہے۔“ میں ہوں۔“ ایک خرگوش کہتا ہے۔ ”نہیں جی میں ہوں۔“ اوپر سے آواز آتی ہے۔ ہال کے روشن دان میں سے ایک ندانے کی گردن نکل آتی ہے۔

”جواب درست ہے؟“ میزبان کہتا ہے۔ ”لیکن، آپ نے جانور کا نام نہیں بتایا۔“

”کہہ چکا ہوں کہ میں ہوں۔“ زرافہ بکڑ ندانے کی گردن بٹھا کر کہتی ہے۔

”میں جی تو ہوں۔“ ایک اونٹ لہر کر کہتا ہے۔

”اوتے میٹھا اوتے۔“ ندانہ کہتا ہے۔

”جی تو ہمارا اگلا مرحلہ۔ ایک عدد بھری ہے جو صاحب تین سوالوں کے جواب درست دیں گے۔ ان کو یہ بھری انعام میں دی جائے گی۔ صرف تین غلطیوں کی گنجائش ہے تو آئیے گیدڑ صاحب آپ سے سوال پوچھتے ہیں۔ پہلا سوال ہے کہ آپ کی زندگی کتنی ہے؟“

”میں سو سال کا ہو چکا ہوں۔“ گیدڑ اطمینان سے جواب دیتا ہے۔

”جواب تو درست ہے لیکن یہ فرمائش کہ شیر کی ایک دن کی زندگی سے یہ زندگی بہتر ہے؟“

”آپ فرما رہے ہیں کہ اگر شیر ایک دن جیتا ہے اور ایک گیدڑ سو سال جیتا ہے تو

گیدڑ کی ایک زندگی میں کتنے لاکھ شیر اب تک جاں بحق ہو چکے ہیں؟“

”اچھا تو گیدڑ صاحب اگلا سوال ہے کہ جنگل میں مور ناپا کس نے دیکھا؟“

”کسی نہ کسی نے تو دیکھا ہوگا ورنہ ہمیں کیسے پتہ چلتا کہ جنگل میں مور ناپا ہے۔ یہ مادہ ہی غلط ہے۔“

”جواب درست ہے۔ اچھا آپ یہ فرمائیں کہ اگر آپ بھری جیت جاتے ہیں تو آپ اس کا کیا کرنا کریں گے؟“

”میں اسے شیر بھائی کو دے دوں گا۔ مجھ سے زیادہ ان کو اس کے خون کی ضرورت ہے۔ بورج

ہو چکے ہیں۔ اس لیے ان کی خوراک کا بندوبست میں ہی کرتا ہوں۔

”یہ جانور ہمدردی کی بہترین مثال ہے..... انکا سوال ہے جنگل میں منگل کس طرح میٹا جاتا ہے؟“

”منگل کے روز۔“

”بالکل درست..... ویسے آپ بکری جیت چکے ہیں۔ لیکن یہ ضرور بتا دیجئے کہ یہ منگل آپ کس کے ساتھ منانا پسند کریں گے؟“

”وہ منگل نہیں جو منایا جاتا ہے۔ وہ ہنی مون ہوتا ہے اور میں ابھی لٹوڑا ہوں۔“

”گیڈر صاحب آپ بکری کے مالک ہوئے اور چونکہ آپ نے جانور ہمدردی کی بہترین مثال قائم کرتے ہوئے اسے بڑے شیر کو بخش دیا ہے تو آیتے بڑے شیر سے کچھ باتیں کرتے ہیں۔“ بڑے شیر صاحب کیا حال ہے؟

”کوئی حال ہوتا تو آج گیدڑوں کا محتاج ہوتا۔ فرنا روسٹ کرنے والی ایک بھی کی مشین منگ رکھی ہے تو بکری کو اس پر ٹانگ کر روسٹ کر لوں گا۔“

”بہت اچھے..... تالیاں“ میزبان ہاتھ اوبنے کر کے کہتا ہے۔ ہاں اپنے پاؤں سے تالیاں پھینکا ہے۔ کچھ جانور میٹاں بجاتے ہیں۔ ”تو اب آپ کو موسیقی سنوائی جائے.....“ نشریف لاتی ہیں حناں سسٹروں اس پرتین ہرنیاں کو دیتی ہوئی اسٹیج پر آتی ہیں اور ہلک ہلک کر ”میری چچی واچھتا ہی لایا“ گانے لگتی ہیں۔ اب میٹھیوں کا شور بہت زیادہ ہے۔ گیدڑ بھی موسیقی میں مست ہے اور بے حیالی میں سر ہٹا ہوا بڑے شیر کے قریب چلا جاتا ہے۔ بڑا شیر اونگھ رہا ہے ایک آنکھ کھول کر دیکھتا ہے اور پھر یکدم بچا مار کر گیب ڈر کو قابو کرتا ہے اور المیناں سے اسے خوش کرنے لگتا ہے۔... کھانے سے غارت ہو کر وہ ہانسنے کے لیے سوڈا واٹر کی بوتل پیتا ہے اور پھر گلگانے لگتا ہے۔

مینول سوڈا واٹر سے دے دے روز بالما کہندی۔

جانور گھر میں ہرنیاں گامی ہیں اور شیر گلگانا رہا ہے اور جنگل زندہ باد۔

شیر منگل کے شیشے اتار کر صاف کرتا ہے اور پھر اپنی نفلی تپتی اتارتا ہے اور اسے دوبارہ فٹ کرتا ہے۔

”آپ کو شیر مننا کیا لگتا ہے؟“

”شیر مننا کیا لگتا ہے۔ ہم بھی پاگل ہو جائیں گے ایسا لگتا ہے۔“ شیراک آدھ سرد بھر کر کہتا ہے۔

”واہ واہ“ میزبان ہاں سنوارتے ہوئے داد دیتا ہے۔ ”کیا شعر ہے آپ کا اپنا ہے۔“

”جی ہاں کل ہی خریدنا تھا۔ بر خود دار آپ کی شکل مجھے ٹھیک طرح سے نظر نہیں آرہی۔ آپ ذرا

قریب آجائیے۔“

”اگرچہ آپ بڑے شیر ہیں۔ پھر بھی آپ سے ڈر لگتا ہے۔ اس لیے یہی فاصلہ ٹھیک ہے..... تو

بکری آپ کی ہوئی۔ میں ابھی اس کی رسی آپ کو تھما دوں گا۔ یہ فرمائیں کہ آپ اس بکری کا کیا کریں گے؟“

”روسٹ۔“

”جی؟“

”میں اسے روسٹ کر دوں گا..... جب سے کمزوری لاحق ہوئی ہے کپا گوشت کھانے سے

پرہیز کرتا ہوں۔“

”ہم سب بیٹویں“

میرا اور آپ کا مشترکہ تجربہ ہے کہ کسی شادی میں شرکت کے لئے گئے۔ رسم نکاح اقامت کو پہنچی۔ لوگوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے مگر آنکھیں ہیں کہ اس فحاشی کے پیچھے جھانک رہی ہیں جہاں سے برتنوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ اشتہا انگیز خوشبوئیں اٹھ رہی ہیں۔ منصوبہ بند حضرات پہلے سے ہی ان نشستوں پر براجمان ہیں جو کھانے والے حصے کے قرب وجوار میں واقع ہیں۔ چنانچہ جوہی پردہ ہٹا کر رخ کھانا دکھایا گیا۔ ایک بھگدڑی جی اور اسی دھم پیل میں آپ بھی اندر پہنچ گئے۔ اب آپ پیٹ ہاتھ میں پکڑے اس انبوہ کثیر کے اُد پر سے جھانک رہے ہیں جس کے درمیان کہیں کھانے کی فطرتیاں ردپوش ہیں۔ کامیاب حضرات اپنی پیٹ کو وٹلڈن کے کپ کی طرح سر سے اونچا اٹھائے بیچ میں سے فاتحانہ طور پر برآمد ہو رہے ہیں اور ہر پیٹ میں گوشت کا ایک پہاڑ ہے جسے وہ کھائیں گے نہیں بلکہ نوہن نوح کر ادھر ادھر پھینکتے رہیں گے۔ اس وقت آپ ہانکل ایک فیکر کی طرح پیٹ ہاتھ میں لئے انتظار کر رہے ہیں اور آپ انتظار کرتے رہیں گے اور بالآخر چادلوں کے چند دانے اور کچھ سلا دھان حاصل کر کے اس مقابلہ سے دستبردار ہو جائیں گے اور کھانا گھر جا کر کھائیں گے۔

آخر ہم اتنے بھوکے کیوں ہیں؟

چلیے غریب غرباء تو بچا رسے ترسے ہوتے ہیں کہ اپنی محدود آمدن میں دوسرے مرغ اور پلاؤ انورڈ نہیں کر سکتے اور ان موقعوں پر وہ خوراک اپنے معدوں میں اتارنا چاہتے ہیں جسے وہ باناً میں دیکھتے ہیں اور خرید نہیں سکتے۔ لیکن میں نے تو کارخانہ داروں، بڑے بڑے افسروں اور مختلف

نسبیت حضرات کو بھی کھانے کے معاملے میں انتہائی بے صبری بلکہ بدتمیزی کا مظاہرہ کرتے دیکھا ہے۔ ایسے لوگ جن کے فرج ہمہ وقت گوشت سے ٹھننے رہتے ہیں۔

کیا یہ ہماری انرلی بھوک ہے جو ختم ہی نہیں ہوتی؟

لاہور کی گلیوں میں ہر جگہ مرغوں کے دھڑلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کباب، ٹکے، کڑا ہئی گوشت، مرغ صمیم، پنہاری اور ہر قسم کے گوشت کھا کھا کر ہم اپنی بھوک کو ختم کرنے کی کوشش میں ہیں بدوٹوں اور فٹ پاتھوں کے کنارے میچ کر ہم اس کڑا ہئی پر دیشیوں کی طرح پل پڑتے ہیں جن میں جلنے کون سے جانور اور کتنے بوٹھے جانور کا گوشت تیز مصالحوں کی وجہ سے گھلا ہوا اور قابل استعمال دکھائی دیتا ہے۔ دوسرے مرغوں کی مشینیں ایک قومی نشان کے طور پر ہر سود دکھائی دیتی ہیں۔ ایک اچھا بھلا کھوٹا سوار یا کاروالا ایک غلیظ ترین ریڑھی لٹے کے قریب رک کر ایک روپے کی حلیم اور آدھا نان ایک نحس فرس کے طور پر کھائے گا۔ کچھ لوگ اتنا انتظار نہیں کر سکتے کہ کڑا ہئی گوشت پوری طرح تیار ہو جائے۔ وہ کڑا ہئی کے اُد پر کھڑے ہو کر اس میں سے بوٹیاں نکال نکال کر جیباں میں لے لے کر لپکی ہوگی تو وہیں تھوکر کے اٹھل دیں گے۔ اگر لنگی جا کے تو گرم گرم لنگی میں لے لے اور ساتھ ساتھ چپک کی طرف دیکھتے جائیں گے کہ دیکھا بچہ ہم خوراکیں کھا رہے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمیں گوشت ترک کر دینا چاہیے۔ لیکن اسے کھانے کا کوئی طریقہ، کوئی قرینہ بھی تو ہونا چاہیے۔ کیا تہذیب صرف لباس اور اٹھنے بیٹھنے تک ہی محدود ہوتی ہے؟ کیا خورد و نوش کی کوئی اخلاقیات نہیں ہیں؟

دراصل ہم ایک بیٹو قوم ہو گئے ہیں۔ چپکورے اور ندیدے۔ ہم کھاتے کم ہیں اجاڑتے زیادہ ہیں یا پھر ہمارے پیٹوں میں ”مہلب“ ہیں جو ہماری بھوک ختم ہی نہیں ہوتی اور پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ صاحب اب خوراک میں وہ لذت کہاں۔ اب تو بھوک ہی نہیں لگتی۔ ہمارے بزرگ تو پورا بکرا کھایا کرتے تھے۔ ان کو شاید یہ معلوم نہیں کہ ان بزرگ نے شاید زندگی میں ایک ہی بکرا کھایا تھا اور بکرا کھانے کے بعد کیا وہ حیات بھی رہے یہ کسی کو معلوم نہیں اور آپ تو دوزخ انداز کھوں مرغ اور بکرے اجاڑتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ روزانہ گوشت خوردی کے ان مقابلوں میں حصہ لیتے ہیں ان کے پاس ایسی رقم ہوتی ہے جو وہ کسی انسانی بکرے "کو ذبح کر کے لانے ہوتے ہیں۔ انہوں نے کسی انسانی مرغ "کو دوسٹ کیا ہوتا ہے جو اتنی مہنگائی کے باوجود فٹ پا تھوں پر بیٹھے "خود اکیس لکھا ہے ہوتے ہیں اور ایسے بیٹوں لوگ ملک کے پسماندہ حصے میں شدید اسباب کمتری پیدا کر دیتے ہیں۔ کیا پچیس روپے دہاڑی لینے والا مزدور کبھی سوچ بھی سکتا ہے کہ وہ بال بچوں کو بھول کر چالیس روپے کا ایک دوسٹ مرغ بڑب کر جائے ؟

اصل میں ہم دوسروں کا رزق بھی کھا جاتے ہیں۔ آپ کے آگے رکھی بھاپ اڑتی کڑھائی میں مگر دو کلو گوشت ہے تو اس میں سے آپ کا حصہ بیشک ایک چمچا تک ہے مگر آپ وہ سارے کا سارا کچھ پھینکتے ہیں اور کچھ پیٹ میں اتار لیتے ہیں۔ کیا ہم گوشت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے گوشت کا نامہ اگر دو دن کی بھالے دو ماہ کا ہو تو کیا ہم سب فوت ہو جائیں گے۔ ایسا نہیں ہو گا البتہ گوشت کی قیمتیں ضرور کم ہو جائیں گی۔

چنانچہ دوسٹ مرغ، کڑھائی گوشت، سیخ کباب، بکے لاہوری، مرغ ملیم، پشادری اور پگن بکے کے شوقین حضرات سے گزارش ہے کہ براہ کرم دوسروں کا رزق مت کھائیں ورنہ ایک طرف آپ کا رزق بھی ختم ہو جائے گا اور مرغوں اور بکروں کی تصویریں صرف بچوں کی کتابوں میں دیکھنے کو ملیں گی۔

”ایکشن کہانی“

کلی دوپہر جب شہر سے گھر واپس آیا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرا کتنا نہار ہا ہے..... میرا مطلب ہے نہلا یا جا رہا ہے۔ ایک صاحب جو مجھے دیکھ کر اس طرح اٹھے جیسے کوئی جہان سے اٹھتا ہے۔ فارغ البال تھے اور دھوپ میں ان کی ٹنڈر شک رہی تھی..... ان صاحب نے اٹھ کر پیسے مجھے گلے لگایا اور پھر دانت نکالتے ہوئے کہنے لگے: "ہائے ہائے تارڑ صاحب" میں ذرا پریشان ہو گیا کہ یہ حضرت مجھے ہائے کیوں کر رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے ذرا سنجیدہ ہو کر کہا "فرمائیے" انہوں نے اسی طرح دانت نکالتے ہوئے برا آمدے کے فرش پر بیٹھے ہوئے ایک صاحب کی طرف اشارہ کیا جو بڑی دلجمعی سے میرے کتے کو غسل دینے میں مصروف تھے..... یہ کتا دراصل کچھ زیادہ کتا نہیں ہے اور بڑے کتے کے چوری ہو جانے کے بعد فی الحال بارہویں کھلاڑی کے طور پر صرف فیڈنگ کر رہا تھا یعنی نفع نقصان میں شریک نہیں بھونکنے کے بارے میں ذرا تامل سے کام لیتا ہے اور ہر وقت ایک چار پائی کے نیچے گھس کر سو رہتا ہے اور رات کو ہم اسے شہدے ملاد کر اٹھاتے ہیں کہ جاؤ چوکیداری کر دو اور وہ ایک ہلکی سی بج کر کے پھر سو جاتا ہے..... میری بیگم کا کہنا ہے کہ ابھی بچہ ہے جب بڑا ہو جائے گا تو تمہاری طرح گھر کی چوکیداری شروع کر دے گا۔ ظاہر ہے جب یہ کتا آیا تھا نہایا نہیں تھا کیونکہ کتے عام طور پر خود غسل نہیں کرتے اور مجھے کتے نہلانے کا زیادہ تجربہ بھی نہیں..... یہ صاحب جو برا آمدے میں بیٹھے میرا کتا نہلا رہے تھے میری طرف دیکھ کر کہنے لگے: "لو جی سو نہا ہو گیا ہے....." اب میری بگم میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ یہ دونوں صاحبان کون ہیں اور میرے کتے پر اتنے مہربان کیوں ہو رہے ہیں..... میری پریشانی

بھانپ کر گنجے صاحب کہنے لگے: میں ادھر سے گزرتا تھا تو سوچا آپ کے کتے کو ہنلا دوں....
آپ کا کتا میرا کتا....

"لیکن آپ...." میری کچھ میں نہ آیا کہ میں انہیں کیا کہوں۔

"دراصل یہ میرا ملازم ہے اور میرے کتوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ آج صبح میرے کتوں کو ہنلا رہا تھا تو مجھے خیال آیا کہ اگلے روز تار صاحب کے گھر کے سامنے جو کتا نکلتا کھڑا تھا اس بے چارے کی طرف کہنے تو جہ نہیں دی کیوں نہ اسے بھی ہنلا دیا جائے...."

"کوئی کتا تیار ہے؟" ملازم نے اٹھ جھٹک کر کہا اور کتا خاموشی سے بیٹھا ہانپنے کے بعد کی ہلکی پھلکی کیفیت سے کھٹک اندوز ہو رہا تھا۔ "آپ ذرا اندر سے کوئی کپڑا لے کر آئیں اسے خشک کر لیں۔" اسے پھوڑیے گا نہیں: میں نے اندر جاتے ہوئے کہا.... "بگم باورچی خانے میں تھیں۔" "بھئی یہ باہر کتا کس سلسلے میں ہنلایا جا رہا ہے؟"

"ایکشن کے سلسلے میں...." وہ کہنے لگی۔ "تم ٹھہر چلے باتے ہو اور شامت میری آجاتی ہے ہر دو منٹ بعد گھنٹی بجتی ہے اور کوئی نہ کوئی امیدوار چند منٹ کے دالوں ایسی مسکین سمورت بنائے جھانک کے باہر کھڑا ہوتا ہے...."

"لیکن ایکشن کا اس غیل کتا سے کیا تعلق ہے؟"

"یہ جو صاحب ہیں گنجے سے یہ امیدوار ہیں ہمارے علاقے کے.... آج صبح آکر کہنے لگے کہ بھابھی اجازت دیجئے تاکہ آپ کا کتا ہنلا دیا جائے۔ اب میں انہیں کیا کہتی.... اس سے پیشتر ایک صاحب آئے تھے وہ گو بھی کے پھول دے گئے تھے...."

"گو بھی کے پھول؟"

"ڈراڈرینگ دوم میں جھانک کر دیکھئے۔"

میں نے ڈرائینگ دوم میں جھانک کر دیکھا تو ایک کونے میں گو بھی کے پھولوں کا ڈھیر لگا تھا کم از کم دو تین درجن تو ہوں گے.... ان صاحب کے پاس ایک ریڑھا تھا اور وہ گو بھی کے پھول

سے لڑا ہوا تھا پورے بلاک میں بانٹ کر گئے ہیں: میری بگم نے بتایا۔

میں ایک پرانا کپڑا لے کر باہر گیا اور گنجے امیدوار کے ملازم نے میرے کتے کو خشک کیا اور

کہنے لگا: "کوئی کتا بالکل تیار ہے.... پھوڑ دوں؟"

"پھوڑ دو۔"

اس نے گتے کو پھوڑا تو وہ کم قتل کچی مٹی میں ہا کر پوٹیاں لینے لگا اور پہلے سے زیادہ گندہ ہو گیا۔

"آپ فکر نہ کریں میرا ملازم کل آکر اسے دوبارہ ہنلا دے گا...." وہ صاحب بے حد ملائت سے بولنے اور اس خاکسار کو یاد رکھیے گا.... "نام تو آپ جانتے ہیں ناں؟"

"بالکل جی۔ میرا وٹ آپ کے لئے ہے آپ فکر نہ کریں.... اور کتا ہنلانے کا شکریہ۔" انہوں نے جھٹک کر ہاتھ لایا اور چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد ایک اور حضرت آگئے.... "میں جمہوریت پسند ہوں...." وہ دانت نکال کر بولے۔

"اچھا.... بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔"

"میں جمہوریت پسند ہوں۔" انہوں نے پھر سرگوشی کے اعلازمیں کہا: "میں بھی آپ ہی کو تلاش کر رہا تھا۔"

"کیوں؟" وہ گھبرا گئے۔

"مجھے بھی تھوڑی سی جمہوریت چاہیے تھی اور آپ ساری کی ساری لے گئے تھے۔"

"جی؟...." وہ ذرا پریشان ہوئے۔ بہر حال مجھے یاد رکھیے گا.... اور وہ جو گو بھی بانٹ

بھرتے تھے ان سے وٹ نہ دیئے گئے.... دراصل آج صبح وہ سبزی منڈی میں گو بھی کا ریڑھا فروخت کرنے کے لیے لے گیا تھا چونکہ ان دنوں گو بھی کا ریٹ بہت نیچے گر گیا ہے اس لیے اس نے اپنے علاقے کے دو ٹروں میں بانٹ دی تھی....

یہ تو گل کا قصہ ہے اور آج صبح سے پھر گھنٹی بجتی ہے اور کوئی صاحب چاول یا مسموم وغیرہ
کا برتن اٹھائے کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ میاں صاحب نے دیگ دی تھی، یہ قریش صاحب کی طرف
سے ہے، یہ نان صاحب نے بھجوائی ہے....

”اور جو نہی چاولوں والی برتن واپس کرتے ہیں اس کی امیدوار صاحب بھی نازل ہو جاتے
ہیں۔ وہ چاول پہنچ گئے ناں؟ میں نے ملازموں سے کہا تھا کہ پہلے میرے بھائی کے گھر پہنچا دیں۔
”کوئی بھائی کے؟“ میں پریشان ہو کر پوچھتا ہوں۔

”وہ اس ہلاک میں آپ ہی تو ہمارے بھائی ہیں.... بس خیالی رکھئے گا۔“

”جی ہاں....“ میں عاجزی سے کہتا ہوں۔ ”اور چاولوں کے لیے شکریہ....“ ویسے آپ
اس علاقے کے مسائل حل کرنے کے لیے کیا کریں گے؟

”کون سے مسائل؟“ وہ ہنس کر کہتے ہیں۔ ”یہاں تو اللہ کے فضل سے کوئی مسئلہ ہی
نہیں؟....“

”اور یہ جو ٹوٹی ہوئی سڑک ہے اور بھول کے بغیر کچھ میں اور اب تے ہوئے گڑ میں اور....
چلڈرن پارک میں اور دم مچاتے کرکٹ کے شوقین نوجوان ہیں.... یہ مسائل نہیں ہیں؟“

”اچھا یہ مسائل؟.... یہ حل ہو جائیں گے بالکل ہو جائیں گے؟“ انہوں نے سر ہلایا اور
چلے گئے۔ ساتھ دلے پھاٹک پر دستک دی۔ ہمارے ہمسائے باہر آئے تو ان کی آواز مجھے تک
پہنچی۔ ”وہ چاول پہنچ گئے ناں؟ میں نے ملازموں سے کہا تھا کہ پہلے میرے بھائی کے گھر پہنچا
دیں....“

ہمارے علاقے میں ایک اور صاحب بھی امیدوار ہیں۔ معافی کیجئے گا کینڈی ڈیٹ ہیں۔
ان سے پوچھئے کہ کیا آپ بھی امیدوار ہیں تو جواب میں کہیں گے کہ جی نہیں میں تو کینڈی ڈیٹ ہوں۔
.... ان کینڈی ڈیٹ صاحب کو الیکشن میں کھڑا ہو جانے چاہیے۔ تقریباً دس برس پیشتر
یہ کسی الیکشن میں کھڑے ہوئے اور پھر بیٹھے نہیں کھڑے ہی رہے۔ الیکشن ہار جاتی اداروں کا ہوا

قومی اور صوبائی اسمبلیوں کا یہ صاحب کھڑے رہتے ہیں اور یوں کھڑے رہتے ہیں کہ ایک ہی مرتبہ
ہزاروں لوگوں سے تصویر چھپوائے ہیں اور ہر بار ان کو دیواروں پر خود ہی چپا کر دیتے ہیں۔ اس
پوسٹر میں کینڈی ڈیٹ برائے.... چھپا ہوا ہے اور وہ الیکشن کی مناسبت سے ہمارے کے آگے
کوئسٹر، ایم پی اے، ایم این اے وغیرہ ہاتھ سے کھینچتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی الیکشن
نہیں ہوتا اور وہ اپنی بودیت دور کرنے کی خاطر دیواروں پر پوسٹر بہر طور لگا دیتے ہیں۔

اس الیکشن کہانی کا کلائمکس ابھی تھوڑی دیر پہلے پیش آیا ہے اور اسی لئے میں نے یہ کالم لکھا
ہے.... سب سے پہلے تو وہ مجھے صاحب تشریف لائے جنہوں نے کئی ہفتوں پہلے اپنی ذاتی سپروائزر
میں اور کہنے لگے ”آپ سے یہ امید نہ تھی، ادیب اور صحافی تو قوم کا سرمایہ ہوتے ہیں اور آپ....
مجھ سے اپنے نجس اور ناپاک کتے نہلاتے رہے....“

میں نے پوچھا کہ جناب ہوا کیا ہے؟

انتہائی فحشے کے عالم میں کہنے لگے ”ووٹروں کی فہرست میں آپ کا تو نام ہی نہیں ہے؟“
میں نے سر جھکا کر کہا ”اں پہلے ہال روڈ پر رہتا تھا یہاں آیا تو دوڑ ساتھ لے کر نہیں آیا؟“
”تو پھر خواہ مخواہ کتے نہلاتے رہے ہم سے“ وہ غضبناک حالت میں پھلے گئے۔

پھر وہ گویا والے حضرت تشریف لے گئے اور وہ بھی فحشے میں اپنی گویاں اٹھا کر لے
گئے.... ظاہر ہے اب چاول بھی نہیں آئیں گے.... دیکھیں ہم جمہوریت کا تلاش میں در بدر ہو
رہے ہیں اور ہمارا ووٹ ہی نہیں ہے۔

میں کاروں کا سوال ہے بابا

میں ان دنوں میں کاروں کی تلاش میں ہوں.....

جی ہاں دو کاروں کا توبندوبست ہو گیا ہے باقی رہ گئیں میں تو میں ان کی تلاش میں ہوں۔ شہر کے غیر حضرات اور دریا دل حضرات کی طرف دیکھ رہا ہوں کہ وہ میری مدد کو آئیں۔ مجھے یہ پیرس نہیں کہ میں کاریں درکار ہیں۔ بے کوئی سخی بابا جو میری مشکل حل کر دے؟.....

قصہ دراصل یہ ہے کہ چائے ایک مرتبہ پھر چپکے سے پوری رازداری سے ہنگی ہو گئی ہے اور اسی وجہ سے میں کاروں کی تلاش میں ہوں۔ ہر دوسرے ہفتے جب چائے کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے تو میں اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتا تھا کہ میں اب دن میں چھ پالیوں کی بجائے صرف ساڑھے پانچ پی لوں گا تو گھر پر بجٹ میں کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن صاحبہ چھوری سے جاتا ہے چائے سے نہیں جاتا۔ میرا مطلب ہے چائے ایک ایسی لت ہے جس کی پیالیوں میں کمی نہیں ہو سکتی اسے آپ شرفا کی ہیروئن بھی کہہ سکتے ہیں لیکن ہیروئن کی طرح اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے ملک بھر میں کوئی کلینک کوئی ہسپتال نہیں ہے اس لئے اس کے شیدائی اسے پینے پر مجبور ہیں اور چائے کھینچنے والے ان کی مجبوری سے ہمیشہ فائدہ بالکل ناجائز فائدہ اٹھاتی رہتی ہیں۔ میں شاید مومنوع سے ہٹا جا رہا ہوں دراصل صبح سے صرف دو پیالی چائے پی ہے اس لئے حاضر دماغی دھیرے دھیرے غائب دماغی ہو رہی ہے بہر حال جو بھی چائے ہنگی ہوئی میری بیوی نے گھر پر بجٹ کو بیلنس کرنے کے لئے خرچ رقم کا مطالبہ کر دیا.....

”تم اچھی طرح جانتی ہو بیگم کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا میرے پاس پیسے ہوتے تو

میں بیٹے کے سلیپر پہنے رہتا ہوں اب وہ ہر دو منٹ کے بعد اکر کہتا ہے کہ آتو ذرا میرے سلیپر دیجئے گھنٹی بجی ہے میں نے باہر جا کر دیکھنا ہے کہ کون ہے اور خاص طور پر اس وقت کہتا ہے جب میں کسی نوجوان ادیب کو جو دیت کے فلسفے پر لکھ کر دے رہا ہوتا ہوں۔ قصہ مختصر میں کسی سے مزید قرض نہیں لے سکتا۔“
”تو پھر کوئی کرب سیکھ لو۔“ وہ اطمینان بھری آواز میں بولی۔

”کرب؟ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس سے بڑا کرب اور کیا ہو گا کہ میں قلم کے ذریعے روزی کماؤں۔ کیا یہ کرب کم ہے کہ لاہور کی مال روڈ پر صبح کے وقت حادثہ کئے بغیر ڈرائیو کر سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں اب تک زخمی ہوں جبکہ ہر روز مجھے بتایا جاتا ہے کہ کسی قربانی سے دیرین نہیں کر سکتے۔ جان قربان کر دیں گے۔ خون کا آخری قطرہ بہا دیں گے۔ ہمارا خون رنگ لائے گا دھیرہ دھیرہ اور میں نے ابھی تک قربانی نہیں دی اور خون کا کوئی بھی قطرہ نہیں بہایا سوائے شکر کرتے ہوئے تو کیا یہ سب کرب نہیں؟“

”ہاں چائے کے حوالے سے بات کر رہی تھی۔“ بیگم ہنس کر کہنے لگی۔

”چائے کے حوالے سے؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ چائے کے ساتھ کیا کرب ہو سکتا ہے؟“

”سنو؟“ وہ منقریب ہو کر بولی۔ ”ایک کار ہمارے پاس ہے اور دوسری بھائی جان سے مانگ میں گئے.....“

”کیا دنیا کے گرو کاروں کی دودھ منقہ کرنے کا ارادہ ہے کیا؟“

”سنو تو سہی..... اور تمہارا پرانا موٹر سائیکل ابھی تک ستری کی دکان پر پڑا ہے، زنگ لکھا رہا ہے اور اس کی قیمت پانچ سو سے زیادہ نہیں ملے گی تو تم یہ کر دو کہ کہیں سے میں کاروں کا اور بندوبست کرو اور اپنے موٹر سائیکل پر سوار ہو کر ان کاروں کے اوپر سے پھلانگ لگا دو، ہماری تمام مالی مشکلات حل ہو جائیں گی.....“

”لیکن میں تو..... میں ہر کھانے لگا..... میں تو..... میں یہ کیسے کر سکتا ہوں؟“

ساری عمر تم نے موٹر سائیکل پر گزار دی ہے اتنا ذرا سا کام بھی نہیں کر سکتے! سنو.....
جب تک کوئی شخص کرتب نہ دکھائے اس کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا..... سیاست کا بار بار
دنیا داری میں کرتب دکھانے والے ہی سامنے آتے ہیں۔ تم اگر عالم چنا ہوتے تو میں تمہارے
کندھوں پر چڑھ کر ٹھونٹے۔ یعنی اور نہیں درجنوں ملازمین اور نقد رقم دی جاتی۔ اگر تم ایک چلا
مار لیتے تو دینار ہی دینار..... اب کم از کم یہ تو کرو کہ بائیس کاروں پر سے اپنے موٹر سائیکل پر چڑھ
کر چھلانگ لگا دو اس سلطان گولڈن کی طرح..... یوں ساری عمر رندق حلال کے لئے دھکے کھانا
رہو گے اور کوئی نہیں پوچھے گا۔

”لیکن بیگم ایک قباحت ہے.....“ میں نے سر کھاتے ہوئے کہا۔ اگر میں بائیس کاروں
کو عبور نہ کر سکا اور درمیان ہی میں کریش کر گیا تو؟

”تو بھی کچھ نہیں ہو گا۔ گولڈن بھی پہلے تو گر پڑا تھا لیکن انعام پھر بھی مل گیا۔ اب حساب
لگاؤ کہ بائیس کاروں کو عبور کرنے کے اسے ساڑھے چار لاکھ وصول ہوئے۔ یعنی فی کار تقریباً
ہزار روپیہ تو اگر تم تین چار کو بھی عبور کر جاؤ تو اتنی رقم مل جائے گی جتنی تم ڈرامے اکالم اور کنایاں
لکھ کر برسوں میں کماتے ہو کیا خیال ہے؟“

تو خواتین حضرات وہ دن اور آج کا دن میں کاریں جچ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔
کا بندوبست ہو گیا ہے اور باقی بیس کے لئے جدوجہد کر رہا ہوں۔ آپ بھی میری مدد کیجئے اگر
میں جیت گیا تو آپ کو چینی کھانا کھلاؤں گا اور اپنے نام کے ساتھ گولڈن لگاؤں گا..... کیا
خیال ہے؟

”نیا سال مبارک“

ہر شخص کا ایک ذاتی اور مخصوص ”نیا سال“ ہوتا ہے۔ نہ صرف ہر شخص کا بلکہ ہر قوم کا نیا سال مختلف
ہوتا ہے۔ مثلاً انڈیائی نئے سال کو خوش آمد کہنے کے جو طریقے ہیں وہ افغانستان سے خاتمے نامے
پر واقع ہوتے ہیں۔ ان میں ایک رسم ایسی ہے جو انگلستان میں رائلش پریسیر پاکستانی اور دیگر غیر ملکی
نوجوانوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ ساڑھے گیارہ بجے شب کے قریب جوان حضرات
گھروں سے باہر نکلتے ہیں اور شہر یا قصبے کے مرکزی چوک میں چلے جاتے ہیں۔ جہاں انگریز حضرات
نئے سال کو خوش آمد کہنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ یہ خواتین حضرات خمار کی ایسی حالتوں میں ہوتے ہیں
جہاں سے ان کو ان کی خبر تک نہیں آتی اور حالات اتنے دگرگوں ہوتے ہیں کہ اگلی صبح کو کسی کو کچھ یاد
نہیں آتا کہ کون کہاں تھا کیسے تھا کس طرح تھا اور کس کے ساتھ تھا۔ چنانچہ اس صورت حال کا فائدہ
غیر ملکی حضرات کو ہوتا ہے جو کم از کم اس لمحے کے لئے باہوش رہتے ہیں۔ ان مرکزی چوکوں میں پبلک
منہ اٹھانے کھڑی ہوتی ہے اور کچھ اور پبلک ان پر منہ جھکائے کھڑی ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے
جیسے سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ بارہ بجتے ہیں ہی تمام خواتین و حضرات کے بھی بارہ بج جاتے ہیں
بلکہ خوش حواس کے معاملے میں تو ان کے بارہ کب کے بج چکے ہوتے ہیں اور نئے سال کے آتے
نہ ان کے بارہ بجتے چلے جاتے ہیں اور یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب آپ کسی بھی قانون کو پہلی نوا بڑ
کہہ سکتے ہیں اور زبان سے کہہ سکتے ہیں۔ کیسے کہہ سکتے ہیں اس کی تفصیل میں جانا مناسب نہیں لیکن
اسے کہا نامناسب طریقہ سے جاتا ہے۔ چنانچہ یہ سادہ دل پاکستانی سارا سال اس لمحے کے منتظر
رہتے ہیں۔ ان کا اخلاق ملاحظہ فرمائیے کہ انگریز خواتین کو صرف پہلی نوا بڑ کہنے کے لئے سارا

کی پہلی تاریخ ہے اور سن ۸۸۸ کا آغاز ہو چکا ہے؟

”نہیں جب.....“ سہولے نے سر ہلایا اور زور زور سے ہلایا: ”میں تو ان پر ہڑت آدمی ہوں باؤ جی تاریخ کا مجھے کچھ پتہ نہیں۔“

”عجیب شخص، نئے سال کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اچھا یہ بتاؤ کہ نئے سال کے سب سے پہلے کیا ارادہ ہے یہی کہ اس برس تمہاری کیا خواہش ہے؟“

”میری خواہش جی؟“ سہولے نے سوچتے ہوئے کہا ”یاؤ جی میرا ارادہ تو یہ ہے کہ مجھے اس سال کی طرح حق سلال کی روزی دینا جائے اور آج شام سے پہلے میرے سارے مائے فرزندت ہو جائیں یہ میری خواہش ہے۔“

واقعی عجیب شخص ہے میں نے مایوسی سے سر ہلایا تا اس بھرتی مارکیٹ میں نیوایر منیا بائیر بازار سن میں گانا سننے گیا نہ ہنگی تریں کاروں میں شراب پی کر گھوما اور یہ بھی نہیں جانتا کہ آج نئے سال کا پہلا دن ہے اور خواہش کیا کر رہا ہے؟ میں یہی کہ اللہ میاں حق سلال کی روزی دینا ہے اور شام سے پہلے سارے مائے فرزندت ہو جائیں عجیب شخص ہے۔

”خریدا ہوا جن واپس نہیں ہوگا“

میں نہایت پریشان حال بد حال بیٹھا تھا اور شاید قدرے آبدیدہ بھی تھا کہ خلیفہ غنائی آگئے اور انہیں ریکارڈ میں لے کر نہایت سرد آہ بھری اور اس کی سردی سے نابلہ تھوڑا سا ہلکے اور پھر ایک بھر بھری لے کر لو لے۔

”آؤ ہوا کیا ہے؟“

میں نے ایک ٹھنڈی ٹھنڈی آہ بھر کر ناک پر دھال رکھا اور ایک لمبی شول کر کے کہنے لگا۔

”زندگی کیا ہے غم کا دریا ہے۔“

اس پر خلیفہ ناراض ہو گئے ”ایک تو تم ناشکرے بہت ہو اور یہ فقرہ کہ زندگی کیا ہے غم کا دریا ہے تو تمہارا کلمہ کلام ہو گیا ہے؟“

”نہیں خلیفہ؟“ میں نے سر ہلایا ”میں کلمہ کلام تو گزرا نہیں ہوتا ہے اور ایک عرصے سے

ہے.....“

”بہر حال اب کیا ہوا ہے؟“ وہ ناک پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

”ہونا کیا ہے گزرا نہیں ہوتا.....“ سواری خلیفہ گزراہ تو ہو رہا ہے، لیکن ذرا بیک وقت فائدہ سا ہو

رہا ہے..... دودھ والا گہر رہا ہے کہ پیے زیادہ کرو اور میں نے اندازہ لگایا ہے کہ اگر ایک فیروز کھوئی بڑھاؤں تو وہ ہر ماہ سود دے گا بوجھ بڑھ جائے گا..... یہ سود یہ کہاں سے آئے گا؟“

”کہاں سے آئے گا؟“ خلیفہ کہہ کر بولے۔ ”کہاں ہے سود دے گا کیا سہیت ہے۔ تم بوجھ گھٹا آدمی ہو سود دے گئے ناک کرتے ہو۔“ ”میاں ان دنوں تو شرفاز لٹن اور امریکہ وغیرہ کا سمیرا لگاتے ہیں اور وہاں آکر ایک کوٹھی دو بکیر وادوں میں زمین خرید کر بقیہ عمر راہ اٹنی ہی گزار دیتے ہیں.....“

”اور اگر پکڑے جائیں تو؟“

”تو بھی بقیہ زندگی یاد اپنی میں گزارتے ہیں لیکن ذرا جیل میں گزارتے ہیں۔“ خلیفہ مسکرایا۔
 بڑی کایاں مسکراہٹ مسکرایا۔

”نہیں خلیفہ میری“ دہائی برہان کو دود کرنے کے بے کوئی اور طریقہ سوچو..... میں جیل جانے کے لیے بہت شہور آدمی ہوں بدنامی ہوگی۔“

خلیفہ نے ایک نلک نلک قہقہہ لگایا: ”ارے تم کہاں کے شہور ہو..... یہاں تو بڑا بڑا نامور شخص اور بڑا خاندانی شخص ان کاموں میں پکڑا گیا۔ اور جو نہیں پکڑا گیا وہ بھی کیا ہرے؟ اور اور بڑا تھا.....“

”نہیں کوئی اور طریقہ سوچو میرا سچ چٹ گزارہ نہیں ہوتا.....“

خلیفہ سوچ میں پڑ گیا اور خامی دیر پڑا رہا۔ میں نلک نلک آکر اٹھا یا تو مسکرا کر کہنے لگا: ”تم ایک مدد جن خرید لو۔“

”جن؟.....“ میں نے نہ نہ کہوں کر پوچھا ”وہ جو شراب ہوتی ہے؟“

”نہیں نہیں وہ جو ہوتی نہیں ہے بلکہ سچ چٹ کا جن ہوتا ہے.....“

”میں ایک جن خرید لوں؟ میں نے ایک زہر آلود مسکراہٹ کے ساتھ کہا ”کسی روز انارکلی باؤں اور ہر دوکان سے پوچھوں کہ جناب عالی آپ کے پاس ایک عدد جن ہوگا براۓ فروخت مجھے ذرا سستا سا جن چاہیئے اور بہت بڑا بھی نہ ہو۔ میں میڈیم سائز کا دو..... شکل موٹ سے بہت نرا وہ جن نہ لگے..... یہ کہوں؟“

خلیفہ سر ہلانے لگا جیسے میرے مستقبل سے مایوس ہو گیا ہو: ”میں سنجیدگی سے مشورہ دے رہا ہوں اور تم سن کرے ہو رہے ہو..... اچھا تو پھر ٹھیک ہے تمہاری زندگی غم کا دریا ہی رہے رہے گی میں پلٹتا ہوں: ”یہ کہہ کر وہ آٹھ کھڑا ہوا لیکن پھر دھڑم سے بیٹھ گیا۔ کہو کہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا تھا۔ ناراض نہ ہو جایا کرو خلیفہ جی ہم حالات کے سائے ہوئے لوگ ہیں۔ آپ کو کہا پتہ کہ اکثر اوقات ہماری جیب میں دس روپے بھی نہیں ہوتے۔ پہلے خرید لیتے ہیں جن.....“

اپنی دنوں خرید لوں یا ذرا احتیاط کروں شاید ان کی کلیئر نس سیل لگ جائے کہ پہلے آئے پہلے پائے کی بنیاد پر ہر قسم اور ہر سائز کے جن محدود شاک ہے آپ کی پسند کا جن..... جنوں کی دلائی..... خرید اہوا جن واپس نہیں کیا جائے گا وغیرہ وغیرہ.....“
 خلیفہ پھر ناراض ہو کر آٹھ لگا لیکن میں نے اس کا کندھا دبا کر پھر ٹھٹھا لیا: ”نہیں بالکل سنجیدگی سے بتاؤ کہ جن کہاں سے خریدوں؟“

”لو سنو.....“ خلیفہ کہنے لگا: ”میرے ایک دوست ہیں بٹ صاحب..... محکمہ اوقاف میں کام کرتے ہیں اور محکمے کی جانب سے مختلف مزاروں اور درگاہوں وغیرہ پر جا کر سب کتاب کرتے ہیں۔ چند برس پیشتر محکمے نے ان سے کہا کہ سندھ کے ایک دور افتادہ علاقے میں جن فروخت کرے ہیں.....“

”کھلے بندوں جن فروخت ہو رہے تھے؟“

”تم سنئے ہو یا میں جاؤں؟“ خلیفہ پھر گرمی کھا گیا: ”تو بٹ صاحب ایک بس پر سوار ہو کر ایک چھوٹے سے قصبے میں پہنچے وہاں سے دریافت کیا کہ یہ جن کہاں شتے ہیں تو انہوں نے ایک کپے راستے پر مثال دیا۔ بٹ صاحب کو کئی کلومیٹر پیدل چلنا پڑا اور جب وہ جن شوٹر پر پہنچے تو گرمی، بھوک اور پیاس سے مڑھال ہو چکے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک کچی کوٹھی کے اندر ایک صاحب آتی پاتی مارے بیٹھے تھے۔ اور جن فروخت کر رہے تھے باہر جن خریدنے والوں کا جھوم تھا۔ ایک کارندہ ایک ایک شخص کو اندر بھیجتا تھا اور وہ شخص جب باہر آتا تو اس نے مٹھیاں بند کر کے آسمان کی جانب اٹھائی ہوتی تھیں اور خوشی کی دھجے نمرے لگا رہا ہوتا تھا۔ جب بٹ صاحب اندر گئے تو جن فروٹیں بنے پوچھا کہ..... کتنے لوگ؟“

”بھاؤ کیا بت؟“ بٹ صاحب نے پوچھا۔

”پانچ روپے کا جوڑا۔“ انہوں نے کہا۔

”یہ تو بہت مہنگا ہے۔“ بٹ صاحب نے اعتراض کیا۔

”سچے جاؤ۔“ ان صاحب نے گرج کر کہا۔ اس پر بٹ صاحب نے اپنی روپے نکال کر پیش

کر دیئے۔ ان صاحب نے پانچ سو پے جیب میں ڈالے اور اس پاس کی ہوا میں ہاتھ چلانے لگے۔
 بایاں ہاتھ چلاتے ہوئے بولے "پکڑ لیا" پھر دایاں ہاتھ چلانے لگے۔ بالآخر وہاں بھی کامیاب
 ہوئے اور کہنے لگے "پکڑ لیا" اب کیفیت یہ تھی کہ ان صاحب نے اپنی دونوں ہنڈیاں بٹ صاحب
 کے سامنے کیں اور کہنے لگے "سو سنبھال تو" بٹ صاحب نے اگرچہ بہت بیوقوف محسوس کیا اپنے آپ
 کو لیکن اپنی ہنڈیاں بند کر کے ان دونوں جنوں کو پکڑ لیا..... "بھوٹے میں کوئی پھوٹا سا جن نہیں ملے گا"
 بٹ صاحب نے کہا اور وہ صاحب پھر گرجے "پٹے جاؤ یہ..... چنانچہ بٹ صاحب اپنی ہنڈیوں میں جن
 پکڑے باہر آ گئے..... ان کا کہنا ہے کہ لوگ کی شرک تک اسی طرح ہنڈیاں بند کر کے پٹے آنے میں ہے
 ان میں کوئی شے بند ہو..... اور وہاں سے بس میں سوار ہو کر جنوں کو گھر لے جاتے ہیں۔ اب صاحب
 بس میں سوار ہونے لگے تو فطری گھٹکی کھل گئی اور انہوں نے "ہائے میرا جن۔ ہائے میرا جن" کا شور
 مچایا۔ وہاں سے واپس گئے اور ایک اور خرید کر لے آئے.....
 یہ کہانی سن کر خلیفہ نے چپ ہو گئے تب میں نے ان کے کندھے پر ایک دھپ رسید کی اور پوچھا
 "خلیفہ اگر میں بھی جنوں کا ایک جوڑا خرید لاؤں تو میری مشکلات حل ہو سکتی ہیں؟ وہ بے تو میری
 مشکلات حل کرنے کے لئے درجن بھر جن رکھا رکھوں گے.....
 "ہو تو سکتی ہیں" خلیفہ نے سر ہلایا۔ لیکن پہلا یہ ہے کہ جن ختم ہو گئے ہیں۔
 "جن ختم ہو گئے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میری باری جن بھی ختم ہو جائیں۔"
 بٹ صاحب کچھ عرصہ پہلے وہاں گئے تھے اور وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ جن فروش مال بنا
 کر جا چکا تھا..... اچھا بھئی خدا حافظ..... خلیفہ جی آٹھے اور مجھے اسی طرح پریشان
 حال، بد حال اور بے حال بیٹھا چھوڑ کر چلے گئے..... خوانین و حضرات اب میرا کیا ہو گا؟
 میری باری آئی ہے تو جن نہیں ملے..... دیکھیں مجھے یقین سے کہ پاکستان میں کہیں نہ کہیں اس
 وقت بہت اعلیٰ قسم کے جن فروخت ہو رہے ہیں جو کہ حل جائیں تو میری مشکلات حل کر دیں گے
 کہا آپ مجھے اس بن سکر کا پتہ رکھنا نہ کہتے ہیں! پلنر.....

”شیر چاہیے شیر“

مگر روز گرامنڈی کی طرف جانے کا اتفاق ہوا تو چوک میں بے حد جھوم تھا اور دو پارسیاں گئے پھاڑ
 ہمارے نعرے لگا رہی تھیں ایک اور پارٹی بھی تھی۔ یہ وہ ذرا ہمارا شمار تھی اس لئے نہایت ناقص
 سے نعرے لگاتی تھیں۔ ان دونوں بددلیاتی ایکشنزوں کی گہرائی ہے اور یہ اجتماع اسی سلسلے میں تھا۔ میں
 قریب ہوا تو یوں لگا جیسے ایکشن لاہور کے نہیں بلکہ چڑیا گھر میں ہو رہے ہیں۔

ایک جانب سے نعرہ لگتا "ساڈا نیوٹا اور غلام جناب میں گلا پھاڑ کر کہتے" "آؤ آؤ آؤ"
 پھر ایک اور نعرہ بلند ہوتا "آگیا میدان دہش" اور قبیہ پیک شہت جالو کا شور مچا کر بھنگر ڈالنے
 لگی۔

یہ تو ایک پارٹی تھی۔ اب دوسری پارٹی میدان میں آکر کہتی۔

"ساڈا نیوٹا تہاڈا نیوٹا..... کیر لا ای اوئے، کیر لا ای اوئے"

"مکھ لے دے نعرے دجن گے..... کیر لا زمرہ باد"

یہ تو بے ہو گیا کہ ایک پارٹی کسی نیوٹا صاحب کی حمایت میں چیخ رہی ہے اور دوسری کر لا صاحب
 کی بھگڑ رہی ہے۔ البتہ دوسری نالوان پارٹی اُردو میں نعرے لگا رہی تھی کہ پھوٹوں سے یہ..... چراغ
 بجھایا نہ جائے گا..... پھوٹوں سے یہ.....

..... تمام نعرہ جات نہایت سنجیدگی سے لگاتے جا رہے تھے اور نہایت شائستگی سے..... جھگڑا
 ڈھکا جاتا تھا۔ ان نعرہ بازوں میں بھولا ریڑھی والا بھی پان فروش پیش پیش تھے۔
 "بھولے یہ کیا ہو رہا ہے بھئی" میں نے پوچھا۔

”ساڈھا نیولا آوے ای آوے“ بھولا ہاتھ کھڑے کر کے کہنے لگا۔
”کیوں میاں بچی کیا ہو رہا ہے؟“

”ساڈھا کرلا..... آوے ای آوے.....“ بچی بھی پر جوش انداز میں نعرہ مار کر بولا۔
”یہ تم لوگوں نے کوئی پرائیویٹ نمونے اور کمرے پال رکھے ہیں جنہیں بلا ہے ہو؟“
”نہیں باڈی.....“ بھولا ہنس کر کہنے لگا۔ ”یہ ذرا سخی ہو رہا ہے دوٹوں کے لئے..... ہیں نمونے کے ساتھ ہوں اور بچی کر لے کے ساتھ ہے.....“
”اور یہ میسرے پارٹی کس کی ہے؟“

”یہ جی دیوا پارٹی ہے..... آپ کو پتہ ہے ناکہ دیوا بھی کھڑا ہو گیا ہے.....؟“
”نہیں مجھے تو نہیں پتہ۔“

”اچھے اخبار والے ہو سیاست کا کچھ پتہ ہی نہیں..... بہر حال اچھا ہی ہوا کہ آپ سے ملاقات ہو گئی۔“ بھولا کہنے لگا۔ ”ہم تو آپ کے گھر جانے والے تھے۔ آپ سے ایک کام ہے۔“
”اپنے امیدوار کی تصویر اخبار میں شائع کروانا چاہتے ہو.....؟“

”نہیں جی.....“ بچی کہنے لگا۔ ”ایک اور کام ہے..... آڈ سانسے والی ہٹی پر بیٹھتے ہیں۔ ہم سانسے والی ہٹی کے تھڑے پر جا بیٹھے..... یہ ایک مخصوص اور خوبصورت گولڈنڈی سردیوں کی صبح تھی۔ دھوپ میں نرمی تھی اور آس پاس ایک ہلکا سا شور تھا۔ ریڑھی دلے پھیل سجاتے کھڑے تھے اور ٹانگوں کے گھوڑے اترا اتر کر چلتے تھے۔“

”ہاں جی کیا کام ہے؟“ میں نے بھولے سے پوچھا۔

”جی نہیں ایک شیر چاہیے“ بچی بولا۔ ”شیر“ میں نے بے یقینی سے کہا۔ ”سچ کا شیر؟ پنجاب کا کوئی ایک شیر.....“

”جناب پنجاب کا کوئی شیر نہیں چاہیے سچ کا شیر چاہیے۔“

”اچھا“ میں نے سر ہلایا۔ ”آپ کو شیر چاہیے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ شیر بھی لڑو میٹھاں والے

کی طرح کہتے ہیں کہ جی چاہا تو ایک عدد خرید لیا..... اور ویسے آپ کریں گے کیا شیر کا؟“
”ہم جی نمونے کو اس پر بٹھا کر اس کا جلوس نکال دیں گے.....“ بھولا پڑ مسرتہ لہجے میں بولا۔

”ایڈیشن کے دن اپنے نمونے کے ساتھ باندھ دیں گے۔“
”اور جی نمونے کو بھی شیر کی سواری کر لیں گے۔“

”ایک ہی شیر پر کر لائیں اور نیولا بھی!“
”کسی کو کیا پتہ کہ ایک ہی شیر ہے یا دو الگ الگ ہیں..... ہمارے ملک میں شیروں کو کوئی نہیں

پہچانتا۔“

”یہ کچھ شیر کی بے عزتی نہیں کہ ایک نیولا یا کرلا اس پر سواری کرے؟“

”ہاں شیر سے پوچھ کر اس پر نمونے کو بٹھانے؟..... اسے کیا پتہ کہ اس پر کیا بیٹھا ہے؟“
”اور کیا نیولا شیر پر بیٹھ جائے گا؟“

”ہم نے اس سے پوچھ لیا ہے وہ کہتا ہے کہ میں عوام کی خاطر شیر تو کیا اتنی بگڑے اور کدے پر بھی بیٹھ سکتا ہوں۔“

”یہ میرے دلے امیدوار نے شرط پیش کی ہے..... وہ کہتا ہے کہ میں شیر پر بیٹھ جاؤں گا لیکن پہلے میری آنکھوں پر ہٹی باندھنا ہوگی تاکہ مجھے پتہ ہی نہ چلے کہ میں شیر پر بیٹھا ہوں یا کدے پر.....“

”اچھا یہ تو طے ہو گیا کہ تم لوگوں کو ایک عدد شیر کی ضرورت ہے اور تم اسے خریدنے پر تھے ہوئے ہو..... لیکن تمہیں یہ کس نے بتایا کہ میں شیروں کا بیوپاری ہوں..... میں تو خود کچھ گڈڑ ہوں کہ سر جھکا کر بیٹھا ہوں اور بونے کی توفیق نہیں رکھتا.....“

”کیا آپ شیروں سے ڈرتے ہیں؟“

”اگر نہیں“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”بیویوں والے شیروں سے کیا ڈریں گے؟..... مجھے خود ایک مرتبہ شیر پالنے کا خیال آیا تھا لیکن پھر سوچا کہ بیوی کی موجودگی میں تو یہ ہے کہ ایک گھر میں دو شیر نہیں رہ سکتے۔ ویسے بھگت سرائی بیکم صاحبہ کے رعب داب کا یہ عالم ہے کہ اگر شیر دو چار دن ہمارے گھر

رہ جائے تو اُسے مان جاؤں گا یہی کہ ایک روز شیر صاحب الماری کے اوپر چڑھ کر بیٹھے رہیں گے اور دم دبا کر تھر تھر کانپ رہے ہوں گے اور نیچے ہماری ہلکے کھڑی دیں گی اور کہہ رہی ہوں گی کہ اگر شیر بڑا بچے آکر کر سراسمانا کر دے تو دل کہیں کے..... شیر پنہ پھرتے ہو..... اور شیر تھر تھر کانپتے ہوئے کہے گا کہ تم ساجر میں آپ کا خاوند نہیں ہوں جو یوں برس رہی ہیں عزت دار شیر ہوں کچھ تو خیال کریں.....

”باؤ جی آپ ہماری بات سنیں میں نہ اڑاؤں“ بھولا ناراغی ہو گیا ”آپ ہمیں شیر لے دیں“

”ہاں باؤ جی..... اخبار میں لکھ ہے کہ پاکستان کے چڑیا گھروں میں شیروں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے کہ اگر شیر بہت پیدا ہو رہے ہیں اور اس وجہ سے چڑیا گھروں میں گتائش سے زیادہ شیر ہیں..... اور جناب ہو سیکر ٹری ہیں جنگلات کے..... انہوں نے کہا ہے کہ یہ شیر کسی شرفین کو دیئے جا سکتے ہیں..... یہ دیکھیے“ بچی نے اخبار کی کنگ جیب نکال کر میرے سامنے رکھ دی..... ”واقعی ہی کچھ کھا تھا“

”تو تم خود جا کر سیکر ٹری جنگلات سے شیر لو مجھے کیا کہتے ہو“

”وہ جی کھا ہوا ہے کہ یہ شیر کسی شرفین کو دیئے جا سکتے ہیں..... ہم جی شرفین تو بیت ہیں لیکن ہماری سفارش کوئی نہیں..... آپ فوٹو سفارش کر دیں“ یہ عجیب بات تھی کہ پاکستان میں شیر فالو ہو گئے تھے سرپس ہو گئے تھے والا کہ گدسوں کے بارے میں یہ بیان زیادہ قابل فہم ہو سکتا تھا..... اگرچہ میری سفارش کچھ بہت بڑی نہیں ہے لیکن میں سیکر ٹری جنگلات سے سفارش کرتا ہوں کہ وہ ایک عدد سرپس شیر بھولے اور پکی کو عنایت کر دیں وہ بے حد شرفین ہیں اور شیر پر کرے اور نیوے کو بٹھا کر بلوس نکالنا چاہتے ہیں کہ نہ کہ اب شیروں کے ساتھ ہی کچھ ہو گا“

”پائلٹ اور پیلٹ“

اسلام آباد کے بین الاقوامی ایئر پورٹ سے جیٹ جہازہ ناگ اونچی کر کے فضا میں بلند ہوتا چلا گیا پھر اس نے ایک پچرنگا کر اپنا رخ شمال سے موڑ کر جنوب کی طرف کر دیا اور اعلیٰ مان سے پرواز کرنے لگا اس نے جہاز کے سپیکر میں سے آواز آئی خواتین و حضرات آپ کا کپٹن آپ سے مخاطب ہے۔ اس وقت ہم سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر ہیں۔ ہماری رفتار ساٹھ سے سات سو میل فی گھنٹہ ہے اور انشاسا اسی منٹ میں ہم لاہور پہنچ جائیں گے..... امید ہے آپ کا سفر خوشگوار گزرے گا عکریہ..... اس اعلان کو انہوں نے فوراً سے سنا جو پہلی بار سفر کر رہے تھے اور جو صفر کرتے رہتے تھے وہ جاہاں لینے رہے کہ کب اعلان ختم ہوا اور وہ ذرا ادنگھڑیں میرے برابر میں ایک لمبی خیم نور جان جین اور نیلی نیان میں پھنسا بیٹھا تھا۔ اس کی انگوٹھی میں ایک بڑا پتھر تھا اور گھڑی سونے کی تھی اور وہ ان دونوں کی نمائش مناسب طریقے سے کر رہا تھا۔

”آپ کا کیا مشغلہ ہے“ میں نے دریافت کیا۔

”ہیں؟“ اس کا منہ کھل گیا..... ”میں کوئی مشغلہ نہیں کرتا جی اللہ پاکائے مشغلے سے“

”نہیں میرا مطلب ہے کہ آپ کیا کاروبار کرتے ہیں؟“

”میں پیلٹ ہوں.....“ اس نے مسکرا کر کہا..... اب یہ لفظ میرے بچے نہ پڑا۔

”کیا ہیں جی؟“

”یہ جیٹ نہیں ہوتا جو جہاز پہلا تا ہے“

”یعنی آپ پائلٹ ہیں..... یعنی کمال ہے“ میں نے اپنی حیرت پر قابو پانے ہوئے کہا۔

”جی ہاں بکمال ہے“ وہ بھی مسکرایا۔

”کہاں پر ہیں آپ یہ..... پیٹ؟“

”نیویارک میں.....“ اس نے اطمینان سے جواب دیا اور میرا منہ کھل گیا کہ یہ نوجوان جو باتنامہ بھاگتا ہے اور..... یعنی کمال ہے۔

”خواتین و حضرات! ایک مرتبہ پھر پیٹ میرا مطلب ہے پامٹ کی آواز آئی“ ہم سب مرتعق ہوٹھو ہمارے گزردہ دریا کے جہلم پر سے گزردہ ہیں۔ اس کے بعد دیلئے جناب پر سے گزریں گے جو دکھائی دے رہا ہے اور باہر درجہ حرارت..... اندر درجہ حرارت..... بندی..... وہ بون چا گیا تب معلوم ہوا کہ یہ باتولی پامٹ ہے۔ لاہور اور اسلام آباد کے درمیان ہوائی سفر کے دوران میں مختلف جہازوں اور جہاز اڑانے والوں کی نصحت سے خاما واقف ہو چکا تھا انہیں میں باتولی پامٹ ملے تھے جو جہاز کے فضا میں بند ہوتے ہی آپ کو ہر قسم کا زمینی، آسمانی معلومات فراہم کرتے جاتے تھے اور جب تک جہاز لاہور ایئر پورٹ پر لینڈ نہیں کر جاتا تھا تو صرف جاری رہتے تھے ایک لمبا سے یہ بہت مناسب اور خوشگوار طریقہ تھا کہ ہمارے میں سفر کرنے والے غیر ملکی پاکستان کو اور اس کے دریاؤں کو جان لیتے تھے۔“

”یہ چپ نہیں کر سکتا“ میرے برابر کے ہیٹ صاحب نے کہا۔

”وہ جہاز کا کپتان ہے جناب جو چاہے کرسم اُسے کیسے منج کر سکتے ہیں۔ ویسے بھی وہ غریب آپ کو اتنے تردد سے معلومات ہم پہنچا رہا ہے آپ کو اس کا شکریہ گزار ہونا چاہیے۔“

اس دوران جہاز کو دو چار جھٹکے گئے۔

”خطرناک ہو رہا ہے۔“

میں نے اسے بتایا کہ معاملہ تو پہلے ہفتے خطرناک ہوا تھا۔ میں لاہور سے اسلام آباد جا رہا تھا اور اس بار جہاز ایئر لائن ٹائپ کا تھا۔ یہ جہاز مجھے بڑی الجھن میں ڈال دیتا ہے۔ اس میں بیٹھے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ کسی ہارات کے ساتھ آئے ہوئے ہیں اور گاؤں کے کسی دارے میں بیٹھے ہوئے ہیں یہ اتنا بڑا ہے کہ پہلے تو یقین ہی نہیں آتا کہ یہ پوری عمارت فضا میں بند ہو سکتی ہے

نہیں..... یہی خیال رہتا ہے کہ رن واپس بھاگتے ہوئے یہ پرواز تو کیا کرے گا بلکہ ہائی روڈ ہی اسلام آباد پہنچ جائے گا۔ بہر حال یہ ایئر لائن فضا میں بند ہوئی اور اسی لمحے ایک تاریک طوفانی بادل کھر پیٹ میں آگئی۔ پہلے کچھ جھٹکے پھٹکے جھٹکے جنہیں مسافروں نے اٹھائے کیا پھر ذرا زوردار جھٹکے اور پھر ایک ایسا زلزلہ نما جھٹکا جس کی شدت سے سامان کے دروازے کھل گئے اور سامان مسافر لیا

کے سردوں پر اور جنہیں..... میرے سامنے حفاظتی بیچ میں جکڑی ایئر ہوٹس ڈس کے مارے آنکھیں نہیں کھول رہی تھی اور ہر جھٹکے پر وہ اتنا بڑا سامنہ بناتی تھی جیسے بس آخری سانس ہو..... اسی دوران ایئر لائن فضا میں جیسے رکی اور پھر ایک عمارت کی طرح گرتی چلی گئی..... میں یہاں پر گزریہ نہیں کہوں گا کہ میں بڑی لاہور وادی ادب کے فکری سے میٹھا رہا بلکہ میں یہ کہوں گا کہ بہر حال روح فنا ہو رہی تھی بلکہ شاید ہر جھٹکا..... پتہ نہیں یہ ایئر لائن کتنے کونٹ نیچے آئی لیکن گناہ یہ تھا کہ ماؤنٹ ایورسٹ سے نیچے گر رہی ہے اور اب رکنے کی نہیں..... لیکن یہ رکنے لگی تھی تو کالم کھد رہا ہوں..... یہ کوئی ایئر پکٹ تھی! سلام آباد تک سرخ روشنی جتنی بجتی رہی اور ہم حفاظتی پیشوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہے۔ صورت حال ذرا بہتر ہوئی تو مجھ سے اگلی نشست پر براجمان ایک صاحب جو پرواز کے آغاز میں سیاست اور فلسفے کے بارے میں بڑے سنجیدہ ہو رہے تھے کہنے لگے ”نوجوان مروانے گئے تھے کیپٹن صاحب..... دیکھو جی کتنی زیادتی ہے۔ اب مجھے اور آپ کو تو علم ہے کہ زیادہ خطرہ نہیں ہے لیکن باقی مسافروں کو کیا پتہ کہ کب کیا ہونے والا ہے۔ پامٹ کو چاہیے تھا کہ ساتھ ساتھ بتا جاتا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں..... انہوں نے اپنی پیشانی سے پتھر بھر سینہ بونچے ہوئے ایک گہرا سانس لیا اور اسی لمحے پھر ایک جھٹکا لگا تو لڑے..... اُنکے بریک لائے۔“

تو معاملہ خطرناک تھا اب تو ذرا ہلکے پھٹکے جھوٹے جھٹکے بارے کھے..... تو آپ پیٹ کریں! میں نے اپنے ہم سفر سے پوچھا۔

”آہو“ اس نے آنکھیں بند کر دیں ہونے کہا کہ کوئی جھٹکا ابھی تک لگ رہا ہے۔

”آہو خود پیٹ ہیں تو پھر آپ کو تو نہیں ڈرنا چاہیے۔“

میرے ہاتھ میں کنٹرول ہوتا تو میں نہ ڈرتا۔ کنٹرول تو اس نامانیم کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ہیٹ صاحب بڑی دلچسپ چیز تھے قدرے ناخواندہ تھے اور مزید وارہ سے پیسے نمبر بارک پہنچ کر اپنی ہمت اور کوشش سے مقامی فلائنگ کلب میں سٹیج لے کر باقاعدہ ہیٹ بن گئے تھے ان دنوں پاکستان آئے ہوئے تھے اور کئی درزے کے سٹے میں اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔

..... دیا گئے راوی کو جو در کے جہاز کوٹ مکتبت اور ڈائن شپ سے پرواز کرتے تھے اور پڑ پڑا ہوا ترنے لگا۔ جب جہاز کے پیچے زمین کے ساتھ گئے تو ایک زوردار جھٹکا لگا جو خاصا شدید تھا۔ "اے نامریم....." ہیٹ کہنے لگے "رنگ پر کنٹرول نہیں اس کا....." اسی لئے جھٹکا لگا ہے۔ جہاز کو مارنا تھا اس نے؟

اور پورٹ پر خدا حافظ کہتے ہوئے میں نے ان سے پوچھا "یہ لینڈنگ کے وقت اتنا شدید کیوں لگتا تھا؟"

"جذبہ باقی پیلٹ ہے" وہ کہنے لگے "ای سے باتیں زیادہ کرتا تھا۔ اور اسی لئے لینڈنگ ٹھیک نہیں کی..... جہاز چلانے والے کو جذبہ باقی نہیں ہونا چاہیے" مجھے اس موہن دوا نے کسے حال مقیم نمبر بارک ہیٹ کی یہ بات اچھی لگی..... جہاز چلانے والے کو جذبہ باقی نہیں ہونا چاہیے۔

تلاش گمشدہ کتابت اور بلی جات اور نیولا جات

لوٹے کیپر کی طوطا کہانی داسے کالم کی درجہ سے مجھے تلاش گمشدہ کتابت اور بلی جات اور نیولا جات اور ہندو ہاتھ کے بارے میں اتنے دھیر سارے خطوط موصول ہوئے ہیں کہ یقین جانیئے میرے ہاتھوں کے لوٹے بھی رگتے ہیں اور یہ والے لوٹے واپس نہیں آئیں گے۔ ان خطوط میں ایسے ایسے شک اور آہ و دغاں سے جھرجھرجھٹ ہیں کہ میں انہیں پڑھ کر غامض دیرنگ ایک کونے میں کسی اداس کونے کی طرح بیٹھا رہا..... میرا خیال تھا کہ یورپ اور انگلستان میں ہی جانوروں سے محبت کرنے والے پاسے جاتے ہیں۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ سوات گوجرانو اور بدین میں بھی جانوروں سے عشق کرنے والوں کی کمی نہیں..... تو جو حفظ فرمائیں سوات کی ایک خانو کا خط جو اپنی بی بی کے ہم میں اتنی بد حال ہیں کہ انہیں بلڈ پریشر ہو گیا ہے۔ وہ کہتی ہیں "تار بھائی ہاں خدا آپ کا بھلا کرے کہ آپ نے آخر کار کوئی اچھا کالم لکھا ہے۔ پورے ملک میں اس قسم کا کوئی انتظام نہیں کہ اگر کسی شخص کا کوئی جانور گم ہو جائے تو اس کو تلاش کرنے کا شجر ہو۔ دیکھئے ناں یہ جو جنگلی جانوروں کے تحفظ کا محکمہ ہے تو یہ بلیوں اور گھٹوں کا تحفظ کیوں نہیں کرتا۔ جو جانور جنگلی ہیں ان کے بارے میں یہ بہت فکر مند ہیں اور جو جانور ہمارے پاس رہتے ہیں اور ہماری خدمت کرتے ہیں ان کی انہیں کوئی پرواہ نہیں۔ میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ جی میری بی بی گم ہو گئی ہے اور آج گم نہیں ہوئی چھ ماہ ہو گئے ہیں۔ اور میں نے بہت کوشش کی کہ مل جائے۔ بھائی ہاں وہ کہنے کو تو بلی تھی لیکن کسی سہیلی سے کم نہ تھی۔ میں اپنی رز کی باتیں اس کے ساتھ کرتی تھی..... کیا اسے تلاش کرنے میں آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟ اگر آپ میری بی بی کو تلاش کر دیں تو آپ کا نام تاریخ میں سنہری حرفوں میں لکھا جائے گا۔"

ان دھوکے خط کے آخر میں بی کا حلیہ بیان کیا ہے اور وہ ایسا ہے کہ کسی بھی بی کا ہو سکتا ہے۔

بلکہ کسی کتے کا بھی ہو سکتا ہے۔ شہ جاتی جان اس کی دم بہت موٹی ہے اور گھنے دار ہے اور دانستہ مفید
منہ بڑا خوب صورت ہے..... وغیرہ وغیرہ۔ گو بنو امار کے ایک ریٹائرڈ ٹیچر نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں
کالپسند یہ نولہ گم ہو گیا ہے۔ یہ نولہ بہت سست مند تھا اور ان کے صحن میں رہتا تھا۔ جب وہ بازو کرتا تھا
توان کے ساتھ پتا ہوا آتا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ نولہ ان کے محلے کے رگوں نے چرایا ہے اور یہ کہ ان
انہیں واپس دلا یا جائے۔ ان ریٹائرڈ ٹیچر نے بھی آخر میں اپنے نولہ جی کا علیہ بیان کیا ہے۔ اس کیلئے
پر چل جاتا ہے کہ نولہ کیا ہوتا ہے۔ ان صاحب سے بھی میں ہی گزارش کروں گا کہ چند ناگزیر وجوہات کی بنا
پر میں ان کے نولہ کی بازیابی میں معاون ثابت نہیں ہو سکتا۔ پشاد کے دو بچوں نے اپنے نو برڈ کے
میں لکھا ہے کہ وہ اڑ گئے ہیں اور کیا پیار سے انکل ان کو تلاش کر سکتے ہیں۔

برادر ہادی اقبال آفرین ہے تم پر کہ تم نے اپنی ایک کتیا کی خاطر اعلیٰ ترین حکام کے دروازے
دنگ دے دے کر دھیلے کر دیئے۔ اگرچہ پولیس اور عوام نے آپ کا مذاق اڑایا، لیکن آپ اپنے دست و پا
پر ہونے رہے اور انصاف حاصل کرنے کے لیے بلکہ اپنی کتیا حاصل کرنے کے لیے دن رات ایک کر رہے۔
حاصل حوم انسان ایک کتے کو صرف ایک کتا سمجھتے ہیں۔ اس کی قدر تو اس کے مالک سے ہو جیے..... ماہرین
تو یہی کہتے ہیں کہ جی کیا ہوا اگر کتیا چوری ہو گئی لیکن انہیں کیا پتا کہ اس لیڈی میں کیا کیا نسو بیات تھیں..... ان
کی دم کتنی شاندار تھی اور گھر آنے پر وہ کیسے پیار سے ہف ہف کر کے بھوکتی تھی اور قدموں میں خوشام
پیار سے بچو تھا۔ یہ پیار سے انکل اس شے میں کچھ نہیں کر سکتے..... وہ ہا کھوں پرندوں میں سے
تھا۔ یہ دو نو برڈ تلاش کرنے سے نا تری۔ کچھ غیر سنجیدہ قسم کے خد بھی ہیں۔ ان سے چند انتہا سی
داخلہ کیجئے.....

"نادر صاحب آپ یہ فرمائیں اگر آپ گندہ چیزیں تلاش کرنے کے ماہر ہیں تو ایک تو قومی تشویش
خویش کر دیجئے۔ اور اس کے علاوہ پوری قوم کے گندہ خواں خوش کر دیجئے۔"
جناب گزارش یہ ہے کہ میرا اگرچہ گھر سے ناراض ہو کر کہیں چلا گیا ہے آپ اسے کہیں کہہ دیا
آجائے۔ اسے کچھ نہیں کہا جائے گا.....

ان تمام غفلتوں میں سے ایک خط انتہائی سنجیدہ اور تفصیلی ہے اور حافظ آباد کے جاوید اقبال صاحب
لکھا ہوا ہے اور خط کے ہمراہ شناختی کارڈ کی کاپی اور ایک مدد ایف آئی آر کی نقل بھی ارسال کی گئی ہے۔
جاوید اقبال صاحب کے خط کے چیدہ چیدہ حصے داخلہ کیجئے۔
پولیس کا فرض ہے مدد آپ کی۔
سستا اور سہل انصاف؟؟؟

جوتے شیراز، سہل مگر پولیس سے چوری کی ایف آئی آر درج کرانا مشکل۔
کئی سال تک ایف آئی آر کے اندراج کی تھکا دینے والی لگ و دو کے بعد پولیس حکام تھکا
منع گزرتا، انے مزنان کے ساتھ ملی بھگت اور ساز باز کر کے مزنان کو ناجائز تحفظ فراہم کرنے کے لیے
چوری شدہ کتیا کا ناجائز طور پر ایک دعویدار ہی نیا کھڑا کر دیا۔
پولیس کا فرض سرگیری اور جرائم کی پرورش کرنا ہے یا کہ ان کا قلع قمع کرنا۔

قابل احترام جناب مصباح الدین جامی صاحب آئی جی پنجاب سے چوری شدہ کتیا کی بازیابی کی اپیل
میں ایک صوبہ بیک آفیسر سول اور اس کے علاوہ گورنمنٹ ملازم ہونے کے نامے سے بھی غلط بیانی
اور کذب و افتر کے نتائج و عواقب سے پوری طرح آگاہ ہوں۔ مورخہ ۸۵-۱۰-۱۶ کو جب کہ میں اپنی
وزارت کے سلسلہ میں چھاپہ میں مقیم تھا، میری اعلیٰ اور قیمتی نسل کی "جرمن شیپرڈ ڈوگ کوئڈ بریڈ" کتیا میری
رہائش واقع سناڑاج بھائیہ سے چھاپہ کے ایک نواحی گاؤں کے چیرمین (جس کے ہمیشہ ہی سے تھانہ
کے ہر ایک تبدیل ہو کر آنے جانے والے پولیس حکام سے نہایت ہی گہرے اور خصوصی مراسم رہے ہیں)
نے چھپکی کردہ والی تھی۔ سبھی کلاں ماضی بعید میں میری کتیا کی دیکھ بھال پر مامور تھا۔ اس لیے کتیا اس سے
بہت ہی زیادہ مالوں تھی۔ مگر چوری کے وقوع سے تقریباً مہینہ بھر قبل اسے کتیا سے علیحدہ کر دیا گیا
تھا۔ میں اعلیٰ پولیس حکام خصوصاً قابل احترام جناب آئی جی پنجاب سے اپیل کرتا ہوں کہ میری تفتیش تھانہ
پولیس حکام کی بجائے کسی انتہائی غیر جانبدار اور ایماندار پولیس افسر سے کروا کر میری چوری شدہ کتیا مزنان
سے برآمد کر والی جائے اور تھانہ پولیس حکام کو بے جا طور پر مزنان کی جرم پوشی سے باز رہنے کی سختی سے

اور فیصلہ کن ہدایات جاری فرمائی جاویں تاکہ قانون کی عملداری کا احساس ایسا گرہا اور میری دلورنگی ہو اور کم از کم اعلیٰ پولیس حکام کی فرض شناسی غیر جانبداری اور غیر چمکدار ایمانداری پر حوام انسان کا پیش پختہ ہو۔ اس انتہائی طویل اور تفصیلات سے بھرپور خط کے ساتھ اس ایف آئی آر کی ایک نقل بھی ہے جو کتیا کی گمشدگی کے بعد بعد کو شش درج کرواتا گئی۔

جانی جاوید اقبال میں تمہارے ساتھ ہوں۔ دراصل ہم دونوں کا غم مشترک ہے۔ میں اس سے پیشتر اپنے غم کا اظہار اس لیے نہیں کرتا تھا کہ کہیں لوگ میرا مذاق نہ اڑائیں۔ لیکن آپ تو میرے لیے ہمیشہ راہ ثابت ہوئے اور تاریخ میں میرا نہیں آپ کا نام نہری حروف میں لکھا جائے گا۔ مینی ایک ایسا شخص جس نے اپنی کتیا کے لیے زندگی وقف کر دی۔ اب میری داستان الم بھی سینے.... میرا ایک کتاب کرتا تھا۔ سیاہ رنگ اور ایسٹن نسل کا یعنی تقریباً آپ کی کتیا کا جانی.... کیونکہ یڈی جرن شیڈو ٹی تو یہ کتاب جس کا نام شیریں تھا پورے ساڑھے چار برس بعد چوری ہو گیا.... پتہ نہیں کون لے گیا.... گھر سے باہر نکلا اور کسی سنگ مل نے انوار کر لیا اور شدید فروخت کر دیا۔ بچے اسے یاد کرتے ہیں۔ ہم یاد کرتے ہیں.... کسی کو اپنا غم بتاتے نہیں تھے لیکن اب جانی جاوید اقبال کی داستان سن کر حوصلہ ہوا ہے کہ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں.....

ایک روز کسی مغز نے اصرار کی کہ فلاں کو مٹی کے اندر ہے اور میں نے خود دیکھا ہے۔ بے... اس تھا۔ چنانچہ میں شام کے وقت اس کو مٹی کے قریب گیا۔ دیوار کے قریب کھڑا ہوا کہ چپکے چپکے شیریں شیریں پکارنے لگا.... میں بے حد آہستہ سے اور سرگوشی کے انداز میں پکارتا تھا تاکہ مرنے والا سن سکے۔ یکدم ایک موچوں والے صاحب باہر آ گئے اور مجھے تقریباً گردن سے پکڑ کر بولے۔ "اوئے کس کو بلاتا ہے؟"

میں نے عرض کیا شیریں کو۔

کہنے لگے کیوں.... آئندہ بلایا تو مانگیں توڑ دوں گا۔ غضب خدا کا دن رات شیریں شیریں ہوتی رہتی ہے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ شیریں ان کی دختر نیک اختر کا نام ہے تو جانی جاوید ہمارے ساتھ تو یہ ہوا۔ اب گھر مٹا سونا ہے.... اخباروں میں اشتہار دیکھ کر ایسے لوگوں کے پاس گئے جن کے پاس کتورے برتنے فروخت تھے۔ چونکہ مجھے بھی آپ کی طرح ایسٹن ہی پسند ہیں اس لیے اسٹیشن کتورے حاصل کرنے کے لیے دن رات ایک کر دیا۔

زندگی میں پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ اگر نسل ابھی ہو تو کتے کا بھی جادو تیز ہوتا ہے۔ یعنی ایک صاحب نے صرف چار ہزار روپے قیمت بتائی ایک اور صاحب کہنے لگے کہ آپ دو ہزار دے دیجئے گا۔ دہانے بکھنے اور اداکاری کرنے سے تو بہتر ہے کہ انسان کتورے فروشی شروع کر دے۔ کیونکہ نیک اختر سے جو چیک ملتا ہے اس کے ساتھ تو ایک کتورے بھی نہیں خریداجا سکتا۔ چنانچہ اب ہم کتے کے بغیر ہیں اور اپنے شیریں کا انتظار کرتے ہیں۔ کیونکہ نیا کتہ خریدنا ہمارے بس کی بات نہیں.... کسی روز بازار سے کوئی دگ کتورے آئیں گے اور اس کی تہہ بیت کر لیں گے۔

جانی جاوید اقبال میری ساری بہندیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب آپ کی کتیا آپ کے پاس ہوگی۔ اور آپ بھی دعا کیجئے کہ میرا شیریں بھی واپس آجائے.... اور اس موقع پر ایک شعر یاد آگیا اور پتہ نہیں کیوں یاد آگیا۔ آپ بھی سن لیجئے۔

دل کے پھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چہ رخ سے

”گڈ مارنگ سرعید مبارک“

ہم عید گاہ کے راستے پر چل رہے تھے اور ہمارے دونوں جانب انواع و اقسام کے گداگر ڈاکٹ
آنر پیش کر رہے تھے۔ اپنے مٹے مٹے بازوؤں کے ساتھ لمبے نور آنکھوں سے اور ”جلا ہو باؤبی“
عید مبارک“ سینا تینوں مکھ مکھ مبارکوں دے جا دے جا لیکن قابل رحم میرا مطلب ہے
قابل فہم طور پر ابھی ان کی غبار میں وہ گرمی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ جس کے لیے انہوں نے پورا سال تیار کیا
تھی۔ یہ گرمی گداگری نماز عید کے بعد دیکھنے میں آتی تھی۔ عید کی نماز کا اصل لطف تبھی آتا ہے اگر
انسان سپر گھٹیا، ازار بند اڑسنا، ٹوپی تاش کرتا اور منہ میں کھیس یا چادر وغیرہ دابے جاگم جاگ
عید گاہ میں پہنچے۔ اور لوگ صاف سیدھی کر رہے ہوں اور وہ بمشکل جگہ پیدا کر کے پہلی تکبیر پر ہاتھ اٹھالے
چنانچہ میں اپنے بال بچوں کے ہمراہ اسی طرح عید کی نماز سے لطف اندوز ہوا۔

ہر سال کی طرح اس برس بھی ہمارے بوڑھے اور ضعیف امام مسجد نے نماز عید کی امامت کر دائی۔
لیکن اس مرتبہ وہ دھڑکیں مار مار کر روتے نہیں بلکہ صرف قدرے گلوگیر ہوئے۔ ان کے رونے کا تقد
کچھ یوں ہے کہ ہر برس عیدین کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے وہ یکدم خاموش ہو جاتے اس پر تمام نمازی
حضرات جلن جاتے کہ وقت آگیا ہے بلکہ کھسکھس رہی ہوئی کہ اب یہ روئیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا۔
وہ یکدم دھڑکیں مار مار کر رونے لگتے اور حاضرین سے درخواست بھی کرتے جلتے کہ اے مسلمان جانیو!
کہ میں اب اتنا ضعیف اور بوڑھا ہو چکا ہوں کہ اگلی عید پر ملاقات نہیں ہو سکتی بالکل نہیں ہو سکتی۔ اتنے
اُسے اب آپ سے ملاقات نہیں ہوگی۔

اس پر حاضرین میں سے چند ایک بہ آواز بلند کہتے کہ مولانا! آپ اس طرح ناامید نہ ہوں انشاء اللہ

اگلی عید پر آپ زندہ ہوں گے اور ہمیشہ کی طرح امامت کرائیں گے۔ لیکن مولانا اس پر مزید گلوگیر ہو جاتے
اور کہتے ہیں نہیں۔ برادران اسلام! اب میری قسمت کہاں کہ اگلے برس تک زندہ رہوں۔ آپ مجھ گنہگار
کے لیے دعا کیجئے گا۔ کچھ نمازی آپ دیدہ ہو جاتے کیونکہ سب لوگ ان کے خلوص اور نیک نیتی کے مدح
ہیں۔ کوئی شخص کھڑا ہو کر کہتا کہ مولانا آپ فکر نہ کریں۔ آپ انشاء اللہ اس پر مولانا چپ ہو جاتے
مگر آہستہ آہستہ اپنے آنسو پونچھتے جاتے اور بالکل آخر میں وہ یکدم سر اٹھا کر کہتے۔ ”نہیں برادران اگلی عید
پر آپ سے ملاقات نہیں ہوگی۔ میں آپ سب کو خدا حافظ کہتا ہوں۔“ اور خدا کا کرنا کیا ہوتا کہ مولوی
مصاب اپنی تمام تر ضعیفی، تقاہت اور عمر رسیدگی کے باوجود اگلی عید پر ہم سے ملاقات کرنے کے لیے
موجود ہوتے اور ایک مرتبہ پھر روتے ہوئے ہم سے درخواست کرتے کہ اے مسلمان جانیو! لیکن اس
مرتبہ شاید وہ کچھ شرمندہ تھے کہ ہر مرتبہ رو دھو کر کہتا جو کچھ ہوں ”وہ کچھ ہوتا نہیں۔ اور خواہ مخواہ
لوگوں کو آبدیہ کرتا ہوں۔ اس لیے انہوں نے اپنی خرابی صحت اور فوتیدگی وغیرہ کا بالکل ذکر نہیں کیا۔
لوگ انتظار کرتے رہے۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا اللہ انہیں صحت دے اور ہمت دے کہ وہ آئندہ عید
کو بھی ہمارے درمیان موجود ہوں۔ اور ہمیں نماز پڑھائیں۔ اور آئندہ عید کون سی دور ہے۔

جیسے کے اختتام پر میں مزدوری اور ناگزیر قسم کی عید مبارکیں وصول کر کے اپنی درمی صحت جلدی
سے باہر کی طرف بھاگا کیونکہ پبلک انر ہسپتال کے میڈل کر پیدیاں توڑ دیتی ہے۔ اور باہر گداگر تھے
اور لوہے جو بن پر تھے

ایک برقع پوش عورت بار بار اپنے بچوں کے ہاتھ کو اوپر کر کے میٹھا کرنے کی کوشش کر
رہی تھی تاکہ بچوں کے جیسے بچا پانچ ہے اور بچہ بھی جس کی نظر غنبدوں پر تھی بھول جاتا اور ہاتھ سیدھا کر
دیتا اور مسلسل مار کھاتا چلا جاتا۔

ایک گداگر کو دیکھا کہ اس نے چادر بھیلائی۔ پھر جیب سے پانچ پانچ کے درجنوں کڑکتے نوٹ نکال
کر اس پر چھو دیئے۔ اور پھر ”ہے بابا ہے بابا“۔

کچھ حضرات نوٹوں کی گڈیاں لے کر کھڑے تھے اور گداگوں کے غول ان کا معاصرہ کیے ہوئے تھے

صاحب نوٹ ہوا میں اچھا رہے تھے اور گداگر بچے انہیں لوٹ رہے تھے۔

ٹوٹے ہوئے یا توڑے ہوئے اعضاء کی نمائش ہو رہی تھی اور رحمت حضرات ان پر نوٹوں کی بارش کر رہے تھے۔ عید کی نماز پڑھنا اور خطبہ سننا یا گدا گروں کے جھوم میں سے گزرنے کوئی نئی بات نہیں لیکن ایک نئی بات ہوئی جس کی وجہ سے میں یہ کالم لکھنے پر مجبور ہوا۔ گدا گروں کے ہاتھوں سے نوٹ سمیٹ رہے تھے اور خدا جھوٹا بھانے ہر ایک کے سامنے جو نوٹ تھے وہ ہمارے پارک میں شفقت کرنے والے بوڑھے مالی کی کئی تختوں کے برابر تھے۔ اور نوٹ میٹھے کے ساتھ ساتھ وہ جھوم جھوم کر فخر سے بھی لگا رہے تھے۔ اور اُسے دیتا جاسینا.... عید مبارک.... باڈی باڈی.... صاحب جی صاحب جی.... صاحب جی.... تیرے بچے جیسے.... دے جانے کا وعدہ.... گڈ مارنگ سر عید مبارک۔“

چند قدم آگے جا کر مجھے احساس ہوا کہ میں نے کیا سنا تھا.... گڈ مارنگ سر عید مبارک! میں نے پلٹ کر دیکھا، جہاں گدا گروں، مردوں اور بچوں کے چہرے تھے اور وہ شرم چاہ رہے تھے۔ ان میں سے کس نے نہایت نفیس پیجے میں گڈ مارنگ سر عید مبارک کہا تھا۔ اتنے میں قرشی صاحب آگئے۔ ”واہ واہ تندر صاحب.... عید مبارک؟“ وہ انگ ہونے تو فان صاحب.... پھر میرے صاحب.... لڑکیا سب سے عید ملنا گھر واپس پہنچ گیا۔

ان میں وہ کون سا گدا گروں تھا جس نے گڈ مارنگ سر عید مبارک کہا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ گدا گروں کے سامنے پڑے نوٹوں کے ڈھیر دیکھ کر مجھے ان پر رشک آیا تھا۔ اور یہ میں خود ہی تھا جس نے اپنے آپ کو گڈ مارنگ عید مبارک کہا تھا.... میں خود ہی گدا گروں تھا۔ یا میری خواہش تھی کہ لاش میں بھی گدا گروں ہوتا.... آپ ہی بتائیے کیا آپ نے عید کی صبح کو یہ آواز سنی تھی کہ.... گڈ مارنگ سر عید مبارک۔

”میں نے سگریٹ چھوڑ رکھے ہیں“

آج.... اس وقت مجھے سگریٹ چھوڑے ہوئے پورے چار دن گیارہ گھنٹے ہیں منٹ اور کچھ سیکنڈ ہوئے ہیں۔

مجھے ہر بار یہ مشورہ دیا جا رہا ہے کہ سگریٹ کے بارے میں مت سوچو۔ اس کے بارے میں مت لکھو ورنہ یہ پھر سے تم پر حملہ آور ہو جائے گا۔ تمہیں اس کا خیال آئے گا۔ اس کی خوشبو زبان سے چھوٹے گی۔ تمہیں ملنا آئے گی اور تم سگریٹ کے اس پکیٹ کو نکال لاؤ گے جس میں ابھی پانچ چھ سگریٹ باقی ہیں۔ یہ سگریٹ پورے ہار دن گیارہ گھنٹے ہیں منٹ اور.... نہیں کیس منٹ پرانے ہیں اور ماضی میں کبھی ایسا نہیں ہوا پچھلے برس میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے سگریٹ خریدیے ہوں۔ پکیٹ کھولا اور.... اور اس میں سے چند سگریٹ لے کر بغیر چار دن گیارہ گھنٹے اور بائیس منٹ تک یونہی پڑے رہیں.... اور پرانے ہونے میں نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا.... لیکن اس مرتبہ ہوا ہے اور میں آپ سب کو اس کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں.... نہیں نہیں کوئی یکسر نہیں۔ اس کے نقصانات کی تفصیل نہیں.... صرف پچھلے چار روز کے محسوسات آپ کے سامنے بیان کروں گا تاکہ آپ کو بھی معلوم ہو کہ سگریٹ آسانی سے نہیں چھوڑے جاسکتے۔ وہ لوگ جو بڑے فخر سے یہ کہتے ہیں کہ جناب سگریٹ کا کیا ہے جب پاہا چھوڑ دیا.... وہ لوگ مصمت کہتے ہیں کہ وہ سگریٹ کو میں پچیس منٹ تک واقعی چھوڑ دیتے ہیں۔ اور میری طرح کے کئی حضرات جو ال خیال سے اپنے آپ کو خوش رکھتے ہیں کہ دس بارہ سگریٹ روزانہ تو بہت کم ہیں۔ جب بھی پاہا ہے گا جھوٹ دیں گے.... جی نہیں آپ سگریٹ نہیں چھوڑ سکتے یہ ایک ہزار پایہ ہے جو آپ کو چھوڑا ہے اور یہ آپ کے بدن کو آسانی سے نہیں چھوڑتا۔ واصل جب آپ سگریٹ چھوڑنا چاہتے ہیں۔

صرف اس لمحے زندگی میں پہلی مرتبہ آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ آپ تو ٹکڑوں کی غلامی میں ہیں۔ آپ کا بطن اور آپ کا ذہن ٹکڑوں کا بدن ہے ٹکڑوں کا ذہن ہے..... آپ کا کچھ نہیں۔ آپ صرف غلامی میں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ سگریٹ کیوں چھوڑے جائیں۔ یہ آپ کی زندگی کا حصہ ہیں۔ چائے، پانی، سگریٹ، آپ ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ سگریٹ کے بغیر مرے نہیں آتا..... اور بھی لوگ پیتے ہیں، ابھی تک یہ طے نہیں ہوا کہ کیا واقعی کینسر سگریٹ نوشی کی وجہ سے جسم میں پھیلتا ہے اور ہم نے بے شمار ایسے کنسر بھی دیکھے ہیں جنہوں نے ساری عمر سگریٹ کا ایک کش بھی نہیں لگایا اور کینسر کی وجہ سے پھر لگ گئے۔ ذہن پہلے نے جب فیڈرل مشینری کی جانب سگریٹ کا پیکٹ بڑھایا تو مشینری نے بڑے فخریہ بلکہ تکبر سے کہا تھا کہ نہ میں شراب پیتا ہوں اور نہ میں سگریٹ پیتا ہوں اور میں..... سو فیصد فٹ ہوں..... اس پر چڑھنے اپنی موٹی ناک چڑھا کر کہا تھا، میں شراب پیتا ہوں اور سگریٹ نوشی بھی جی بھر کے کرتا ہوں اور میں دو فیصد فٹ ہوں! اب پتہ نہیں چرچل کے اس بیان میں کتنے فیصد سچائی ہے۔ لیکن ایک بات سب سے کہ اس میں قسمت اور فطرت کا عمل دخل بہت ہوتا ہے..... تو سگریٹ کیوں چھوڑے جائیں؟

میں آپ کو اپنی وجوہات بتاتا ہوں۔

سب سے اہم مسئلہ اقتصاد ہے ایک اچھے برائے کی دینا تیرو روپے میں ملتی ہے روزانہ تیرو روپے کے حساب سے تقریباً چار سو روپے ماہانہ آپ کا دھویں کا خرچ ہے..... دھویں کے اس خرچ کو چلانے کے لیے آپ ادھر ادھر سے چھوٹی چھوٹی پچتیں کرتے رہتے ہیں۔ ہر وقت آپ کے ذہن میں اگلے پیکٹ کی دستیابی کا مسئلہ سر اٹھاتا رہتا ہے۔ پہلے تو رقم کا بندوبست اس کے بعد اپنے ہر دو گرام میں اتنا وقت بچا رکھنا کہ جس میں آپ کسی مخصوص دکان میں جا کر سگریٹ خریدیں گے۔ یہ سگریٹ آپ یوں تو کہیں سے بھی خرید سکتے ہیں لیکن ہر سگریٹ پینے والے کا ایک خاص اذہ ہوتا ہے اور اسے وہیں سے سگریٹ خریدنے میں لطف آتا ہے۔ سگریٹ نوشی کا دوسرا مسئلہ ہے اس کی مکمل غلامی۔ آپ بے شک اس حقیقت سے منہ موڑیں۔ سگریٹ آپ کا آقا بن جاتا ہے۔ آپ کی پوری زندگی کی منصوبہ بندی سگریٹ کے حوالے سے ہوتی ہے۔ مثلاً آپ ہر وقت اپنے سگریٹوں کو گنتے رہتے ہیں۔ گھر میں شام

گزارنے کے لیے باج کافی ہوں گے۔ صبح کے لیے تین دو کار ہیں..... چنانچہ گھر میں قدم رکھنے تک آپ ان کو گنتے رہتے ہیں اگر وہ آٹھ کی بجائے سات رہ گئے ہیں تو آپ کی جان پر بن گئی کہ اب کیا کر

آپ کے ذہن کا ایک حصہ صرف سگریٹوں کا حساب کتاب کرتا رہتا ہے۔ آپ گھر سے نکلتے ہیں تو مختلف کام سگریٹوں کے چمانے سے ناپے جاتے ہیں۔ فلاں دفتر میں جاؤ گا تو وہاں زیادہ سے زیادہ دو سگریٹ پیوں گا تو کام ہو جائے گا۔ فلاں جگہ ایک سگریٹ پینے کے بعد وہ کھڑا ہوں گا..... فلاں دوست کو ملنے جا رہا ہوں تو زیادہ سے زیادہ تین سگریٹ..... اس طرح آپ اگر کوئی بوتلی پیتے ہیں پھانسی نوش کرتے ہیں یا کھانا کھاتے ہیں تو آپ اس کے ذائقے سے لطف اندوز نہیں ہو رہے ہوتے بلکہ اس بات پر خوش ہو رہے ہوتے ہیں کہ یہ کھانے یا پینے کے بعد میں سگریٹ پیوں گا۔ چنانچہ یہاں بھی آپ سگریٹ کی غلامی میں ہیں۔

سگریٹ کے ساتھ تھوڑی سی شرمندگی بھی ہوتی ہے۔ آپ کسی کے ہاں جہاں ہیں اور صبح سویرے جب عادت اپنے گھر میں صبح مادے نکالنا چاہتے ہیں..... یہ آپ کی مجبوری ہے۔ صبح سویرے۔ دنوں دنوں..... اہم اہم..... کھوں کھوں کر کے اپنا گلا صاف کرنا اور کئی مرتبہ رات کو بہت دیر تک کھانا اپنے فم میں اور اپنے ہموں کو تنگ کرنا۔

میزائل ہے کہ میں اتنے اچھے دلائل نہیں دے سکا اور یہ دلائل کسی کو سگریٹ سے دور لے جانے کے لیے زیادہ وزنی نہیں ہیں۔ دراصل میرے پاس کوئی خاص وجہ..... کوئی وزنی دلیل، کوئی اخلاقی حجاز وغیرہ بالکل نہیں ہے۔ میں نے سگریٹ صرف اس لیے چھوڑے ہیں تاکہ دیکھا جائے کہ کیا سگریٹ چھوڑ سکتے ہیں اور اگر میں ان کو چھوڑ دوں تو میری زندگی میں کیا تبدیلی رونما ہوگی..... اب میں آپ کو متھلاتا ہوں کہ سگریٹ سے دور ہونے پر مجھ پر کیا گزری۔ پہلا دن سب سے خطرناک اور سب سے مشکل ہوتا ہے۔ پہلے تین گھنٹے تو آپ بچوں کی طرح خوش ہوتے ہیں کچھ جذبہ تفاخر ہوتا ہے کہ دیکھا میں نے سگریٹ چھوڑ دی ہے اور کیا تیر ملا ہے یہ کچھ کچھ اس کیفیت کے قریب ہے جو سفر پر روانگی کے اولین لمحات میں آپ ہر اس وقت وارد ہوتی ہے۔ جب ریل گاڑی پلیٹ فارم چھوڑتی ہے اور آپ گردن

باہر نکال نکال کر دیکھنے گئے ہیں۔ دوپہر کے وقت آپ کچھ کچھ بے چین ہونے لگے ہیں۔ جیسے پہلے پر روزہ دار بے چین ہوتا ہے اور پھر شام تک آپ بڑے حائل میں رہتے ہیں۔ آپ کا بدن ٹکڑیوں میں ہے۔ آپ اٹھیں چمکتے ہیں۔ دانت چمکتے ہیں۔ بے بے سانس لیتے ہیں اور آپ کی سوجھ میں کہ نہیں آتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کب تک ہوتا رہے گا۔ اگر آپ باقاعدہ میڈیکل کے ساتھ جاتے ہیں تو پھر آپ کاغذ ہی حافظہ۔

سگریٹ کے بغیر باقاعدہ میڈیکل ہوتے ہیں لگتا ہے جیسے آپ ہتھیار کے بغیر میدان جنگ میں رہے ہیں..... دوسرا دن آپ کو پریشان کرتا ہے۔ کچھ کچھ دیران کرتا ہے کیونکہ آپ دنیا کی باقی آبادی سے الگ ہو چکے ہوتے ہیں۔ تیسرا دن کچھ ماف کی کیفیتوں کا دن ہوتا ہے۔ کچھ خیر جاندار سا۔ یہاں ٹکڑی پیچھے ہٹتی ہے اور اب آپ پر منحصر ہوتا ہے کہ آپ دل کڑا کر کے سگریٹ سے دفعہ رہنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں یا آپ کو سگریٹ ملگا لیتے ہیں اور ہاں..... سگریٹ چھوڑنے کے بعد آپ کو جو کچھ لگتی ہے۔ گشہ ذائقے واپس آتے ہیں تو انسان زیادہ کھانے لگتا ہے۔ ہر وقت کھانے پینے کو ہی چاہتا ہے..... جو تھوڑے کچھ کچھ چند لمحے آتے ہیں جب آپ مکمل طور پر بھول جاتے ہیں، کہ سگریٹ کا وجود ہے یا کبھی آپ سگریٹ پیا کرتے تھے۔ سگریٹ کی کشش پہنچ میں سے غائب ہونے لگتی ہے۔ شدید ہے کہ جو تھوڑا دن بھی بے حد خطرناک ہوتا ہے۔ انسان یہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ سگریٹ کی قید سے چھوٹ گیا۔ اس کی غلامی سے آزاد ہو گیا اور قدر سے لاپرواہ ہو جاتا ہے اور کسی کو نہ لے میں صرف ایک کش لگانے کے لیے اپنا سارا ریکارڈ خراب کر لیتا ہے۔

آج..... اس وقت مجھے سگریٹ چھوڑے ہوئے چار دن بارہ گھنٹے اور پانچ منٹ ہو چکے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں بالآخر کامیاب ہوں گا یا ٹکڑیوں کا جادو مجھ پر غالب آجائے گا۔ لیکن میں ایک عجیب و غریب تجربے میں سے گزر رہا ہوں کیا سگریٹ چھوڑنے کے بعد میری زندگی پیسے سے بہتر ہو جائے گی یا میں ایک بہتر انسان بن جاؤں گا؟ کیا مسرت میرے قریب آجائے گی..... کیا ہو جائے گا مجھے کچھ معلوم نہیں کہ کیا ہو گا۔ لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ مجھے غلامی پسند نہیں۔ اب دیکھتے کہ میں کتنا

دوسرا آزاد ہوتا ہوں..... اور کیا یہ آزادی مجھے اس بھی آتی ہے یا نہیں۔ فی الحال تو یہ ہے کہ میں پہلے چار دن بارہ گھنٹے اور پچاس منٹ سے گھر میں بیٹھا ہوں اور کہیں باہر نہیں گیا۔ بچے میرے قریب سے گزرتے ہوئے دھڑکتے ہیں۔ میں نہیں جانتا ہوں تو وہ چونک جاتے ہیں۔ میرا کوئی فن آنا ہے تو سرگوشیوں میں بتایا جاتا ہے کہ دراصل انہوں نے سگریٹ چھوڑ رکھے ہیں۔ اس لیے احتیاط سے بات کیجئے گا۔

بھلی کامیاب ٹیک کرنے والا آیا تو اسے کہہ دیا گیا کہ فی الحال آپ یہ کام نہ کریں۔ کیونکہ اب تو سگریٹ چھوڑ رکھے ہیں۔

آج صبح میری بیگم نے بچوں سے پوچھا کہ اگر بھنڈیاں پکائی جائیں تو ٹھیک ہے۔ ان تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر سنجیدگی سے کہا: بھنڈیاں کیسے پک سکتی ہیں؟ اب تو سگریٹ چھوڑ رکھے ہیں۔ ایک اور دشواری جو مجھے درپیش ہے وہ یہ ہے کہ میں جو بھی بات کرتا ہوں میرے اہل خانہ بھید سنبھال لیتے ہیں اور وہ فی الحال شکل بنا کر مجھے دیکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں: ہاں آپ نے سگریٹ چھوڑ رکھے ہیں؟ مثلاً اگر میں یہ کہوں کہ میں بھی اس گھر کا ایک فرد ہوں۔ کسی کو میرا بھی دھیان رکھنا چاہیے۔ میرے بچوں کا، میرا تو یہ کہا جاتا ہے کہ بس سگریٹ چھوڑ رکھے ہیں ناں اس لیے ایسی باتیں کرتے ہیں۔ اور اگر میں یہ کہوں کہ اگر انسان کی عمر زیادہ ہو جائے اور وہ بال بچوں والا ہو جائے تو بھی اسے محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو مجھ سے بھی کہا جاتا ہے کہ دراصل آپ نے سگریٹ چھوڑ دی ہے اس لیے ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہیں کہ ہمارا ہاں شاید درست بھی ہے کہ میں پہلے اس قسم کی باتیں نہیں کرتا تھا۔ شاید اس لیے کہ سگریٹ میرا خیال رکھتا تھا۔ میرے ساتھ رہتا تھا۔ میرا رفیق تھا اور اب میں اکیلا ہوں۔ اور یہ تنہائی رفاقت اور چاہت لگتی ہے۔ اور یہ چیزیں اس زمانے میں کم کم ہیں۔ میرا خیال ہے اب میں دل کی بات کہہ سکوں گا جو سوچتا ہوں وہ نکھ سکوں گا۔ جو چاہتا ہوں اس کا اعلان کر سکوں گا۔ کیونکہ جیسا کہ آپ جانتے ہیں میں نے سگریٹ چھوڑنے کے لیے اس قدر اسی لیے اوٹ پٹانگ باتیں کرتا رہتا ہوں۔

”نباتی مریض اور گملا بازی“

بچپن میں ایک کارٹون دیکھا تھا کہ حق و دوق صحرا ہے نہ بندہ نہ پرندہ۔ البتہ ایک جنگلی ٹینک زندہ تھا اور چار لمبے اور اس بیابان میں ایک ٹھکانا پھول کھلا ہے جو بالکل ٹینک کے راستے میں سرخائے اس کی جانب خوفزدہ ہو کر دیکھ رہا ہے تب ٹینک اپنا راستہ بدلتا ہے تاکہ وہ پھول اس کے آہنی دھڑتے روندنا نہ جائے۔ اس وقت بات سمجھ میں نہ آئی۔ مگر گزرتے ہوئے ٹینک کو کی مرزوت تھی کہ ایک نفول سے پھول کے لیے گریٹر بدل کر اپنا راستہ بدلے۔ لیکن اب پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں پھول اور ٹینک کمال خوبصورتی اور معصومیت کے منظر ہیں۔ کیا کوئی شخص کھیل کود میں مشغول کسی ننھے ننھے بچے کو ٹینک کے نیچے کھیل سکتا ہے.....؟ تو پھر پھول بھی کھلا نہیں جاسکتا۔

اگرچہ میری روزی کا انحصار کسی حد تک پھولوں پر تھا۔ بلکہ پھولوں کے رعبوں پر تھا۔ لیکن مجھے فانی طور پر ان سے کوئی لمبی چوڑی دلچسپی نہ تھی..... پھول اور پودے میرے لیے زندگی کے پس منظر کا ایک حصہ تھے۔ زندگی کا حصہ نہ تھے..... پھولوں ہوا کہ..... ایک بندہ فیث میں ایام زندگی بسر کرتے کرتے ایک چھوٹا سا مکان نصیب میں آیا۔ جس کے پھولوں میں تھوڑی سی زمین بھی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس خالی زمین کو سرسبز ہونا چاہیئے۔ چنانچہ زریوں کا رخ کیا..... چند دنوں کے اندر اندر میں ایک ”نباتی مریض“ بن چکا تھا۔ گھر سے نکلتا اور کسی نہ کسی زری میں گھس جاتا۔ شام کو واپسی پر بھی میں اس وقت تک پودہ دیکھ جھکا رہتا۔ جب تک تاریکی ان کو مجھ سے جدا نہ کر دیتی..... اب میں صرف پودوں اور پھولوں کے بارے میں ہی باتیں کرتا تھا۔ فی دی کے شہار میں ”ہم چم چکے“ والی خاتون کو دیکھنے کی بجائے پس منظر میں سے پھولوں پر ہی نگاہ پڑتی۔ لاہور کی سڑکوں کے کنارے گئے درخت اور پودے اب میرے لیے زندہ ہو گئے۔ میں ہر روز

ان کی بدلتی ہوئی حالت کو غور سے دیکھتا۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ کون سا درخت کون سے ہفتے پھول دے گا۔ اور میں اپنے سارے کام کاج چھوڑ کر اسے دیکھنے جاتا۔ اپنی دونوں ایک اور راز مجھ پر آشکارا ہوا۔ جناح باغ میں مجھے بے شمار خنوں اور جھاڑیوں کو کاٹھ کباڑ ہی سمجھتا تھا۔ چند ایک تو اچھے لگتے۔ لیکن باقیوں کے بارے میں یہ کہہ دینی کہ آخر ان کو یہاں کیوں لگایا گیا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ دن گزرنے سے دنوں کے بدلنے سے میں نے دیکھا کہ سال میں کوئی نہ کوئی وقت ایسا ضرور آتا ہے جب وہ درخت جسے میں کاٹھ کباڑ سمجھتا تھا پھول دینے لگتا ہے اور اس پر آتا ہے پتہ جو بن آتا ہے کہ چند دنوں کے لیے وہ پورے باغ میں حسین ترین درخت بن جاتا ہے۔ چنانچہ وہ بے مقصد نہیں ہوتا۔ اس طرح انسانوں کی زندگی ہوتی ہے۔ کوئی بھی شخص بے مصرف پیدا نہیں ہوتا۔ اس پر کچھ دن ایسے آتے ہیں جب وہ اپنے ہونے کا اپنی اہمیت کا اعوان کرتا ہے..... ہاں اسے دیکھنے کے لیے ایک ہمدرد نظر درکار ہے۔

پھول اور پھولوں میں دلچسپی کی وجہ سے میں ان لوگوں کی تلاش میں رہنے لگا جو میری طرح ”مریض“ تھے۔ مریض تو بہت تھے۔ لیکن ”معالج“ تلاش کرنے میں بہت دشواری پیش آئی۔ ایک روز میرے والد صاحب کہنے لگے کہ تم سارا دن میرا سر کھاتے رہتے ہو کہ جی فلاں پودا کہاں سے ملتا ہے۔ کب پھول دیتا ہے۔ یہاں پاکستان میں الگ سنگٹا ہے یا نہیں..... تو چودھری خورشید کے پاس چلے جاؤ۔ میرے قلم ترین دوستوں میں سے ہیں۔ چنانچہ میں چودھری خورشید کے پاس پہنچ گیا۔ ان کا گھر میرے لیے دنیا کا خوبصورت ترین گھر تھا۔ کیونکہ ان کے عجیب و غریب اور قد سے پر اسرار باغ میں میں نے ایسے ایسے پودے اور پھول دیکھے جو اس سے قبل صرف کتابوں میں دیکھے تھے..... جن کے بارے میں یقین نہیں آتا تھا کہ یہ سچے ہی نظروں کے سامنے لگتا ہے یا نہیں۔ چودھری خورشید بھی خاصے پر اسرار تھے۔ استاد اللہ بخش کے شاگرد اور ان کی ٹرینڈیشن میں تربیت کرنے والے محقق۔ اسرار علم ٹیکس اور ماہر نباتات و پودہ جات و پھول جات وغیرہ..... میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک صاحب تشریف لائے۔ نہایت حقیدت سے بات چیت کیا اور کہنے لگے کہ چودھری صاحب انکا سچا بہن ہے کیا ہوا؟ فلاں پام جو گئے میں لگایا تھا۔ اس کا ایک بیج بھوٹ آیا۔ چودھری صاحب اچھل پڑے۔ چودھری صاحب کو دیکھتے ہیں۔ ایک اور صاحب آئے کہنے لگے جناب کیا کروں۔ جس ابدال کی ریت نہیں ملتی تو کیا

گوجران کی ریت استعمل کر لوں..... چودھری صاحب کہنے لگے نہ نہ یہ غضب نہ کرنا۔ ریت تو حسن ابدال ہی کی چاہیے..... وہ صاحب اسٹے اور حسن ابدال کی طرف روانہ ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ لیکش کی کسی خاص قسم کے بڑے موٹی ریت کا کار ہے۔ جو صرف حسن ابدال ہی میں ملتی ہے..... ایک روز ایک حضرت جہتے ہوئے آئے اور کہنے لگے چودھری صاحب پھر ہو گیا ہے..... چودھری صاحب نے انہیں بہت بہت مبارک باد دی۔ میں نے پوچھا جناب لڑکا ہوا ہے یا لڑکی؟ وہ حضرت بے حد ناراض ہوئے۔ اگر میں چودھری صاحب کی پناہ میں نہ ہوتا تو یقیناً جہنم میں سید کر دیتے۔ بعد میں پتہ چلا کہ ان کے کسی نہایت کیا ب نسل کے پودے کی جڑ سے ایک شاخ جھوٹی ہے۔ یعنی اس پودے کا ایک اور بچہ بن گیا ہے۔ اکثر اوقات پودوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے چودھری صاحب کچھ اس قسم کا بیان دیتے۔ اس کی پردہ پوشی ٹھیک نہیں ہوئی۔ آپ نے اس کی خدمت نہیں کی۔ اس کی خوراک کا دھیان رکھیے ورنہ مر جائے گا..... اگر پودا ایک جگہ خوش ہے تو اسے وہاں سے شفقت مت کیجئے۔ ورنہ نذرین ہو کر مر جھاجائے گا.....

ایک اور صاحب تشریف لائے اور پودوں کے بارے میں کچھ پوچھا۔ چودھری صاحب کہنے لگے۔ آپ کے پاس جگہ تو ہے نہیں پھر کیا کریں گے۔ وہ صاحب بوسے میں گملا بازی کر دیں گے..... میں چاہتا ہوں کہ ہالی میرے ہاتھ سے جھوٹے لگی..... کیا بازی کریں گے؟ میں نے پوچھا۔ ”گملا بازی“ وہ کہنے لگے۔ پودے گول ہیں گاؤں گا۔ چودھری صاحب کے پاس آنے والے تقریباً تمام حضرات۔ نباتاتی مرعین ہوتے ہیں..... یہ جو نباتاتی مرعین ہوتے ہیں۔ تقریباً علاج ہوتے ہیں۔ ان کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ وہ حقیر سا، کتا ہوتا ہے..... کیونکہ ہر وقت جھکا جھکا رہتا ہے اور چھوٹی پودوں کو دیکھتا رہتا ہے..... میں تو کئی کے ایک غریب گھڑی ساز کو جانتا ہوں، جو نباتاتی مرعین ہے اور مقامی کہلا اور اس کے پودے فاندان کی گھڑیاں اس مشورہ پر ٹھیک ہے کہ وہ اسے ہر برس میں لگے بنا کر دے..... ایک روایت کے مطابق ایک ایسے مرعین تھے جو بکھر مرعین تھے اور فوت ہونے کو تھے۔ فوتیگی سے پیشتر فرمایا کہ اس جہان سے چلے جانے کا کوئی ٹکڑہ نہیں صرف یہ ٹکڑہ ہے کہ ان دنوں گلاب کا موسم نہیں اور لوگ میری قبر پر گیند سے کچھ پھول ڈالیں گے۔ جو مجھے پسند نہیں..... اور وہ بے حد فرماؤ رہی تھی۔ انہوں نے کسی نہ کسی طرح گلاب کے پھولوں کا انتظام کر دیا اور جنگ لایا

فی الحقیقت خوشی فوت ہو گئے.....
اس روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اپنی اولاد کو اپنا پسندیدہ پھول بنائیے۔ ورنہ وہ انتظام کر دیں گے۔
نوائین حضرات! اس موضوع پر میں ساری عمر لکھ سکتا ہوں کیونکہ ”مرعین“ ہوں۔ لیکن فی الحال اجازت ہوتا ہوں۔ کیونکہ میرا ہمدرد کیویا اور میرے ڈبل ٹونیا میرا انتظار کر رہے ہیں۔ خدا حافظ!

”ماچس ہوگی آپ کے پاس؟“

ان دنوں اخبارات میں ماچسوں کا بہت تذکرہ ہے۔

پچھلے ماہ اسلام آباد میں ایک پاکستانی صاحب نے ”ماچسوں کا شو“ منعقد کیا جس میں ہزاروں چیس نمائش کے لئے رکھی گئیں۔ رشید ہے کہ یہ دنیا میں ماچسوں کا دوسرا سب سے بڑا ذخیرہ ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ ماچس موسوف خود سگریٹ ٹک نہیں پیتے..... میراجی پانا ہے کہیں ان صاحب سے جا کر پوچھوں کہ..... ماچس ہوگی آپ کے پاس؟

بھلے دنوں کی بات ہے کہ لاہور ٹیلیوژن سے ”ایک حقیقت ایک فسانہ“ نام کا ایک پاپولر ڈرامہ سیریل ٹیلی کاسٹ ہوتا تھا۔ جس میں رپورٹر کا نام امجد ہوا کرتا تھا اور ایڈیٹر صاحب اپنے آپ کو ”انچارج“ کہلاتا کرتے تھے۔ انچارج صاحب ایک مجبوظ الحواس قسم کے شخص تھے جو ہر وقت بولائے پھرتے تھے۔ اور ان کا تکیہ کلام ”وقت کم ہے اور مقابلہ سخت“ بے حد پسند کیا جاتا تھا۔ ان انچارج صاحب کے ہونٹوں سے ایک ان جلا سگریٹ ٹک رہا ہوتا تھا۔ اور جوہن امجد ان کے کمرے میں داخل ہوتا تو وہ ہمیشہ ایک ہی فرمائش کرنے کے..... ”ماچس ہوگی تمہارے پاس!.....“ انچارج کا یہ کردار شاعر قادی نے ادا کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک انتہائی ڈرامائی اور سنجیدہ منظر میں طاہرہ نقوی مرحومہ آنکھوں میں آنسو لئے رپورٹر کو اپنی دردناک کہانی سنارہی تھی۔ پورے ماحول میں سوگواری تھی اور طاہرہ اپنے کردار میں ڈوبی روئے جی جا رہی تھی۔ انچارج صاحب جو بالکل خاموش کھڑے تھے انتہائی رونی شکل بنا کر آگے بڑھے اور طاہرہ

سے کہنے لگے..... ”ماچس ہوگی آپ کے پاس؟“ اس پر طاہرہ نقوی یکدم کھکھلا کر ہنس دی اور وہاں پر موجود تمام حضرات بے اختیار مسکرائے گئے۔ منظر دوبارہ شروع ہوا۔ لیکن اب طاہرہ نقوی سے سنجیدہ نہیں ہوا جاتا تھا۔ چنانچہ طے یہ پایا کہ یسین دوسرے دن پراٹھا رکھا جائے اور یہ کہ شاعر قادی اس ایسے منظر میں ”ماچس ہوگی آپ کے پاس“ بالکل نہیں کہیں گے..... ویسے جی تو میرا پتا ہے لیکن منظر قادی کا جتنا ہے کہ وہ ان اسلام آباد والے ”ماچس کلکٹر“ سے جا کر پوچھیں کہ ”ماچس ہوگی آپ کے پاس؟“

اب ہم فرمیں کر لیتے ہیں کہ معاشرے کے دیگر افراد کو بھی ”ماچس کی ضرورت ہے“ کیونکہ ضرورت ہے تو لحاظ فرمائیے۔

ایک شاعر۔ ”ماچس ہوگی آپ کے پاس“..... کیوں میں نے باقی تمام شاعروں کے دیوان جلا دیں (شاعر کی بجائے کالم نگار وغیرہ بھی استعمال ہو سکتا ہے)

ایک سیاست دان۔ ”ماچس ہوگی آپ کے پاس“..... کیوں؟ میں نے بقیہ سیاسی پارٹیوں کے منشور کو آگ لگانا ہے۔

لاہور کا رپورٹر شین اور ایڈیٹر وغیرہ۔ ”ماچس ہوگی آپ کے پاس“..... کیوں؟ ہم نے اخباروں میں اپنے خلاف چھپنے والی شکایتوں کو دیا سلائی دکھانی ہے۔

ایک اداکارہ..... ”ماچس“..... کیوں؟..... فلاں اداکارہ کا ہیئر سٹائل بہت خوبصورت ہے میں نے اس کا جھانسا سٹڑنا ہے۔

ایک بی بی جلالو..... ”ماچس“..... کیوں؟ میں نے مجھ میں چٹھکاری ڈالنی ہے۔

ایک سپر باور..... ”ماچس“..... لبنان کے لیے درکار ہے۔

ایک عام آدمی..... ”ماچس ہوگی آپ کے پاس“..... کیوں کیا کرنی ہے؟..... کمال ہے..... میں تو صرف اپنا سگریٹ سلگنا چاہتا ہوں.....

آپ جہاں گئے ہوں گے کہ مندرجہ بالا فہرست انتہائی طویل ہو سکتی ہے اور آپ اپنی من مرضی

کے کرداروں کے بارے میں سوچ سکتے ہیں کہ وہ ماچس کو کس طرح استعمال کریں گے۔ البتہ یہ جاننے میں بھی حق بجانب ہوں گے کہ میاں آج نہیں ماچسوں کے بارے میں کالم لکھنے کا کوئی نیا موضوع یہ ہے کہ اپنے ہمسائے ملک ہندوستان کے شہر دہلی میں صرف ماچس نہ ہونے کی بنا پر ایک ہندو شاعر منسوبہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ ہوا یوں کہ ایک ساس اور سسرانی نو بیاہتا جو سے فرمائش کرتے رہتے تھے کہ رانی جی تم ذرا اپنے ماں باپ کے گھر جاؤ اور ان سے مبلغ دس ہزار روپے مانگ کر آؤ ہمیں ضرورت ہے۔ بد قسمتی سے رانی جی کے ماں باپ بے حد غریب تھے۔ چنانچہ ساس اور سسرالہ یہ معصوم خواہش پوری نہ ہو سکی اور انہوں نے نالائقی بہو پڑھنی کا تیل جھڑکا تاکہ اس کا قہہ پاگیا جاسکے..... آگ لگانے کے لئے ماچس درکار ہوتی ہے اور وہ اس وقت گھر میں موجود نہ تھی۔ سب لوگ تلاش کرتے رہے اور اتنی دیر میں ہمایوں کو خبر ہو گئی اور ہو کو آگ نہ لگائی جاسکی..... میرا خیال ہے کہ جب وہ گلی محلے میں ماچس ڈھونڈ رہے تھے اور کہتے پھرتے کہ ماچس ہوئی آپس کے پاس تو کسی نے پوچھا ہوگا کہ کرنی کیسا ہے تو انہوں نے اطمینان سے جواب دیا ہوگا کہ..... بس ہوا دلی کو آگ لگانی ہے۔

”میں بھی انٹرنیشنل ہونا چاہتا ہوں“

ان دنوں میں بے حد ادا اس ہوں کیونکہ میں ابھی تک انٹر میڈیٹ "نہیں ہوا..... میرے بیشتر دوست
اللہ آشنا ہو گئے ہیں لیکن میں نہیں ہو سکا اور اسی لئے میں ادا اس ہوں، رنجیدہ ہوں کہ میں ابھی تک انٹر میڈیٹ
کمری نہیں ہوا۔

میں نہیں ہوا۔
 اور تیشہ وہ لوگ کرتے ہیں جو کسی نامے میں پاکستان میں پائے جاتے ہیں لیکن اب کبھی دوسری کبھی کینڈا،
 اور بگڑا اور کبھی ناروے اور کبھی ناروے سے خبر آتی ہے کہ وہ وہاں پائے جاتے ہیں اور پھر ایک بیان دیتے
 ہیں کہ خواتین و حضرات میں ان دونوں ملک غیر میں پاکستان کا نام روشن کر رہا ہوں اور بہت زیادہ روشن کر
 رہا ہوں۔ اللہ کے فضل سے وہاں میری اتنی آڑ بھگت ہوئی کہ میں تو کبھی پاکستان نہ آتا اور پاکستانی حوام کو کبھی
 منہ نہ دکاتا لیکن پھر بھی میں پاکستان واپس آیا ہوں کیونکہ عزت میری نہیں پاکستان کی ہوئی ہے..... ان لوگوں
 میں گوکار سر فہرست ہیں..... مثلاً سال دو سال بعد ملکی و شہرینیشن کے آس پاس شوکت علی سے ملاقات ہو
 جاتی ہے اور میں اسے مشکلی سے پہچانتا ہوں۔ وہ بسم اللہ اسم اللہ کرتا ہوا آگے آتا ہے اور بنگلہ ہو جاتا
 ہے۔ "شوکت جی! کہا ہونے ہو، نہ کسی فکشن میں: شیلو ویرنیر۔"

”جہنم نے کہاں ہو گیا ہے تارڑ بھائی.....! پس آپ کے قدموں میں..... دراصل آج صبح شارجہ سے آئے ہوں۔ کل رات البرٹ ہال لندن میں پروگرام ہے۔ پھر کینیڈا کے مکھڑا انتظار کر رہے ہیں۔“

”اُم سے تو کینیڈا کے مکھڑا ہی اچھے ہیں کہ تمہاری گائیکی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔“

مشرعہ نہ کرو تاہم صاحب..... بس دوما کے لیے افریقہ جانے ہے۔ پھر اگلے مینک..... یوں
 بھی پاکستان کا نام روشن کر رہا ہے..... دن رات یہی کام کر رہا ہوں نام روشن کرنے کا۔

مشرعہ نہ کرو تاہم صاحب..... بس دوما کے لیے افریقہ جانے ہے۔ پھر اگلے مینک..... یوں
 بھی پاکستان کا نام روشن کر رہا ہے..... دن رات یہی کام کر رہا ہوں نام روشن کرنے کا۔

کبھی غلام علی سے ملاقات ہو جاتی ہے چار چھ ماہ بعد۔

”اور ہو..... تارڑ صاحب! بڑا پیار آپ نے مجھے دیا، ہندوستان گیا تو وہاں بھی لوگوں نے بڑا پیار دیا۔ کل بھٹی میں کنسرٹ تھا..... ہر کوں کویت جا رہا ہوں..... اللہ نے بڑی عزت دلہیہ..... امریکہ سے واپسی پر ملاقات ہوئی۔“

مہدی حسن نے باقاعدہ اپنے جیسے کو پاکستان کے سپرد کر دیا ہے کہ آپ فی الحال اس کے لئے گزارہ کریں میں ذرا باہر کے ملکوں میں اپنا نام روشن کر آؤں..... مہدی حسن صاحب کی آواز سے ہم ایک زمانہ ہو گیا کیونکہ وہ بھی انٹرنیشنل ہو چکے ہیں.....

اپنے ڈرامہ سیریل ”ہزاروں راستے“ کے لئے مجید امجد صاحب کی نظم ”ہزاروں راستے“ میں منتریں پڑھ کر ڈرامہ کو کافی تھیں فیصلہ ہوا کہ مہنا کی آواز مناسب رہے گی۔ معلوم ہوا کہ وہ تو دو ہی لڑکی ہیں۔ وہ واپس آئیں تو نظم ریکارڈ ہوئی۔ دو روز بعد ان کی پھر ضرورت پڑی تو پتہ چلا کہ امریکہ جی کی ہیں۔ یوں گنتا ہے کہ جیسے بارہوگ پاکستان میں صرف سانس لینے آتے ہیں اور پھر واپس جا کر اس کا نام روشن کرنے لگ جاتے ہیں۔ اب اگر آپ مہدی حسن، شوقت علی، غلام علی وغیرہ کو سنا پاتے ہیں تو کینڈا اور امریکہ جا کر بیٹھے۔ موسیقی کا ایک ہر گرام ہونے لگا تو تیاں چوہہ رسی کی تلاش ہوئی وہ جہتہ نہیں کون سے ملک میں نام روشن کر رہی تھیں۔ منجی بیگم تو خیر سے رہتی ہی باہر کے ملکوں میں ہیں۔ جی جانتا ہے کہ ان خواتین و حضرات سے رزخواست کی جائے کہ پاکستان کا نام ماشاء اللہ بہت زیادہ روشن کر چکے اب وطن واپس آئے اور چشم مار روشن کیجئے۔ اداکاروں کی بھی یہی حالت ہے۔ نیپال اور سری لنکا تو دیکر اینڈ پر جاتے ہیں ورنہ تمام شوٹنگیں غیر ممکن ہیں ہوتی ہیں۔ گلوکاروں کے ساتھ اداکار بھی انٹرنیشنل ہو گئے۔ یہاں تک تو معاملہ ٹھیک تھا لیکن میرے اداس ہونے کی وجہ اس ہے اور وہ یہ کہ پاکستانی ادیب اور شاعر بھی انٹرنیشنل ہو گئے ہیں۔ اس بن الاقوامیت کا آغاز تو ہندوستان کے مشاعرے میں ہوا۔ ان کمرشل مشاعروں کا کوئی بوجھ پار کی پاکستان آتا ہے تو محب الوطن شاعر حضرات اسے سزا دیکھنا پر مجھاتے ہیں۔ وہ اتنا ناچا ہوتا ہے تو بھی نہیں آتا۔ بھٹائے رکھتے ہیں۔ اب مشاعروں کا دامن کاہل

روح ہو گیا ہے..... کینڈا، امریکہ، کویت، دبئی، ناروے وغیرہ میں شاعرے ہو رہے ہیں اور پاکستانی شاعر و شاعریوں کے حساب سے انٹرنیشنل ہوتے جا رہے ہیں۔ ان مشاعروں میں شرکت کے لئے سفارتیں بھیجی جاتی ہیں۔ بزرگ شاعر اپنے بچہ لوگ کو آگے آگے کر رہے ہیں کہ جی میری جگہ اسے لے جلیئے ان میں سے کچھ ظاہر ہے۔ اعلیٰ شاعر ہیں اور کچھ شاعر کے میک آپ میں ہیں..... یہ حضرات بھی پاکستان کا نام روشن کرنے جاتے ہیں۔ اب مجھے سخت شرمندگی ہو رہی ہے کہ میں اپنے وطن سے محبت کے اتنے بے باک دعوے کرتا ہوں لیکن ہاتھ بہا تھو دھوے گھر بیٹھا ہوں اور اس کا نام روشن نہیں کر رہا..... میرا مسئلہ یہ بھی ہے کہ میں گلوکار نہیں ہوں اور شاعر بھی نہیں ہوں، تو پھر کیا کروں۔ میرے دل میں انٹرنیشنل بن کر وطن کی خدمت کرنے کی خواہش ہے۔ میری آرزو ہے کہ میں بھی پاکستان کا نام روشن کروں اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ پاکستان میں رہ کر پاکستان کا نام روشن نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ یہاں کے لوگوں میں وہ ذوق نہیں ہے۔ ان کے پتے اتنا پیہ نہیں ہے اور یوں بھی گھر کی طرف ہی جاتے ہیں۔ باہر کے لوگ بڑے بھدار ہیں اور عزت کرنے والے ہوتے ہیں اداکار پاکستان کا نام روشن کرنے کے بہت سارے طریقے ہیں..... ان خواتین و حضرات میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ کسی نہ کسی طریقے سے مجھے انٹرنیشنل کر وادیں۔ یعنی باہر بھیجا دیں۔ باہر جا کر کیا کروں گا اس کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن ایک بات طے ہے کہ میں باہر جا کر کسی نہ کسی طریقے سے پاکستان کا نام روشن کر ہی دوں گا۔ مجھے امید ہے کہ باقی حضرات جو اتنے عرصے سے اسی کام کی پیروی کر رہے ہیں میرے لئے کچھ نہ کچھ گنجائش رکھی ہوگی۔ کیونکہ اگر میں وہاں پہنچا اور پاکستان کا نام پوری طرح روشن نہ ہوا تو پھر میں کروں گا.....؟

”ماؤنٹ ایورسٹ پر یادیں“

چند برس پیشتر ایک یورپی اخبار میں ایک ایسے کوہ پیما کا تفصیلی انٹرویو چھپا تھا جس کی زندگی کی واحد خواہش بس یہ تھی کہ وہ کسی طرح ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی پر پہنچ جائے۔ اس خواہش کے حصول کے لئے وہ ہر سال نیپال جاتا تھا۔ ایورسٹ پر چڑھنے کی کوشش کرتا تھا اور ہمیشہ لڑھکتا ہوا واپس لوٹ کر پہنچ جاتا تھا۔ ان صاحب سے دریافت کیا گیا کہ جناب شریمان رنگ اور سراپہ مند گیری کے ہونے کی وجہ سے انہیں تو درجنوں حضرات اس چوٹی کو سر کر چکے ہیں۔ اس کا غرور خاک میں ملا چکے ہیں تو پھر آپ اپنی جان جو کھول میں کیوں ڈالتے ہیں۔ یورپ کے نرسے چھوڑ کر نیپال کے دیوانوں میں کیوں دھکے کھاتے پھرتے ہیں؟..... کوہ پیما صاحب نے جواب میں کہا کہ میں دراصل صرف ایورسٹ کی چوٹی سر کرنا نہیں چاہتا بلکہ وہاں جا کر دنیا کی اس بند ترین جگہ پر کچھ ایسے کائنات، کچھ ایسے خطوط رکھ کر آنا چاہتا ہوں جن کے باسے میں میری خواہش ہے کہ وہ تا ابد محفوظ رہیں اور کوئی انسانی آنکھ انہیں نہ دیکھ سکے..... وہ کائنات کہا تھے۔ وہ خطوط کس کے تھے اس کے باسے میں انہوں نے لب کشائی نہیں کی البتہ ان کے انٹرویو سے مجھے کالج کے زمانے کی وہ کوہ پیما ضرور یاد آگئی جو سو لہ ہزار فٹ بندرتی گئی چوٹی کو سر کرنے کے لیے آزاد کشمیر گئی تھی اور جس کے نو جوان ارکان میں میں بھی شامل تھا۔ مجھے یاد ہے کہ رات گھینیر کو پورے گھوڑے کے جب چوٹی پر پہنچے تو وہاں ایک چھوٹا سا پتھر ملا میراں تھا۔ جہاں ہم سب لوگ تھکاؤ کی وجہ سے ہلپتے ہوئے لیٹ گئے۔ البتہ جاوید اثر غائب ہو گیا۔ جب ہم چوٹی کی دوڑ کر جانب اترنے لگے تو جاوید بھی ہلپتا ہو گیا۔ میں نے پوچھا کہاں چلے گئے تھے؟ کہنے لگا میں سب کی نظروں سے چھپ کر چوٹی کے ایک کونے میں ایک پتھر کے نیچے کچھ چیزیں رکھ کر آیا ہوں۔ اگر زندگی رہی تو میں اس پہاڑ کی طرف دوبارہ آیا تو

دیکھوں گا کہ وہ چیزیں یہاں موجود ہیں یا نہیں..... جاوید نے بھی اس کوہ پیما کی طرح مزید تفصیل بتانے سے انکار کر دیا۔ رتی گئی کی چوٹی پر گئے ہوئے مجھے اتنیس برس گزر چکے ہیں۔ جاوید ان دنوں امریکی شہری ہے اور کبھی پاکستان واپس نہیں آتا۔ اس کی چیزیں شاید ابھی تک وہیں پڑی ہوں۔ کبھی کبھار میرا جی چاہتا ہے کہ گئی گئی کی چوٹی پر جا کر دیکھوں تو بھی کہ اس نے وہاں کیا رکھا تھا.....

ہر انسان کے دل میں ایک عجیب و غریب خواہش ہوتی ہے۔ ایک ایسی خواہش جس کا بظاہر کوئی جواز نہیں ہوتا کوئی نام نہ نہیں ہوتا اور وہ یہ کہ وہ اپنی چند ذاتی اشیاء یا کسی جگہ چھپا کر رکھے جہاں انہیں کوئی دیکھ نہ سکے کوئی تلاش نہ کر سکے۔ مصری اوسایا تہذیبوں میں اہم افراد کی مقبروں کے خفیہ تہذیبوں میں خزانے رکھے جاتے تھے۔ چولستان اور موہنجودارو میں بھی ایسی قبریں ملی ہیں جن میں مدفونہ ضروریات کے ظروف بچے ہوئے تھے۔ یہ درست ہے کہ ان لوگوں کے عقیدے کے مطابق ان کے ساتھ دفن کی جانے والی اشیاء ان کے اگلے جنم کی ضروریات کے لیے ہوتی تھیں۔ لیکن اس عمل میں بھی ان چیزوں کو دوسروں سے چھپانے کا عمل ہوتا تھا..... لیکن یہ سب کچھ چھپ نہ سکا۔ حضرت انسان نے کھدائی کر کر کے ان پوشیدہ اشیاء کو بھی نکال لیا اور تاریکی سے دن کی روشنی میں لا رکھا۔ زمین کی گہرائیوں میں دفن اشیاء تو خفا ہر کردی گئیں لیکن دنیا کی بند ترین جوشیاں ابھی محفوظ تھیں۔ وہاں پہنچنا آسان نہ تھا..... لیکن نیپال کی ایک خبر کے مطابق ماؤنٹ ایورسٹ بھی اب محفوظ نہیں رہی۔ ایک خبر میں ہم صرف اس قصہ کے لئے ماؤنٹ ایورسٹ کو بھی گئی کہ وہاں جگہ اور چوٹی پر چڑھنے کا ٹھکانہ کی صفائی کر کے آجائے۔ یہ کاٹھ کباڑ ان کوہ پیماؤں کا چھوڑا ہوا ہے جو اس چوٹی کو سر کرنے میں کامیاب ہو گئے اور پھر نشانی کے طور پر وہاں کچھ نہ کچھ چھوڑ آئے۔ پچھلے برسوں میں اس نے زیادہ کوہ پیماؤں نے اس چوٹی پر قدم رکھا تھا کہ ان کی چھوڑی ہوئی نشانیوں سے وہاں ایک خاصا جگہ بارڈر بن چکا ہے۔ یہ بڑا وہاں پر جگہ تو صرف اتنی سی ہے کہ بندہ اس پر کھڑا ہو کر ایک آدھ تصویر اتروائے اور واپس آجائے۔ اب بھی ہوا ہوا کہ کسی کوہ پیما نے شکایت کی ہوگی کہ جناب میں تو اپنے تئیں ایورسٹ پر گیا تھا لیکن وہاں جا کر معلوم ہوا کہ لاہور کا رپورٹیشن کے کسی نمائندے میں آ گیا ہوں جہاں ب کوٹے کرکٹ کے

ڈھیر تھے۔

ماضی کے کوہِ بھاؤں نے بڑے چاؤ سے دہان اپنی نشانیاں رکھی ہوں گی۔ اس یقین کے ساتھ کہ اب یہاں کوئی نہیں آئے گا اور یہ تابدا انہی برنوں میں مدفون رہیں گی اور ان کے حوالے سے نام بھی تابدا زمرہ رہیں گے۔ انہیں کیا پتہ کہ کسی معز وہاں ایک بھاڑو سردار دست بردار کر دیا جاسکے گا جادو جاکر ماؤنٹ ایورسٹ پر بھاڑو سے آؤ وہاں بہت کاٹھ کباڑ جمع ہے۔ پتہ نہیں وہ کیا اور کوئی نشانیاں تھیں جو کہ کوہِ بھاؤں نے دنیا کے اس بلند ترین مقام پر رکھیں اور خود واپس اپنے اپنے گھر کو چلے گئے..... بیٹر کے مین ہو گئے۔ نعتیے ہوں گے۔ پرچم ہوں گے، پتہ نہیں کیا کیا ہوگا..... زیادہ تصویریں بھی ہوں..... ان چہروں کی تصویریں جو انہیں جان سے زیادہ عزیز تھے اس لیے تو وہ ان ایورسٹ پر رکھنے کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈال کر..... ایسے خطوط جو فیروں کے لئے نہیں تھے..... ان سب کے ظاہر ہونے کا خطرہ تھا..... لیکن یہ خطرہ فی الحال ٹل گیا ہے کیونکہ صفائی کے اس کام پر معذور مہم کے دودکن ایورسٹ پر چڑھنے کی کوشش میں ہلاک ہو گئے ہیں اور مہم واپس آگئی ہے..... ایورسٹ نے فی الحال اپنے بھیدوں کو محفوظ رکھا ہے۔ اپنے راز و دل پر سے برقا فی پردہ نہیں ہٹایا..... دنیا میں کم از کم کوئی تو ایسی جگہ ہونی چاہیے جہاں انسان اپنی یادیں رکھے اور تاباں برنیں پڑی ہیں کی کا کیا پتہ..... ایٹمی جنگ سے انسان کی تمام نشانیاں مٹ جائیں..... اور صرف وہی باقی رہ جائیں جو بلند ترین چوٹیوں پر محفوظ ہیں:

”ہائے میری مرغابیاں“

شاہ جی آئے اور ان کے ہمراہ مرزا صاحب بھی آ گئے۔

شاہ جی اتنے عرصے بعد آئے تھے کہ ان کی گردنوں پر کس ٹاپ کی مونچیں ڈھلک چکی تھیں اور مرزا صاحب کا اٹھنا سو بیٹر سکڑ کر ان کی ٹوند کو نمایاں کر رہا تھا۔ یہ دونوں حضرات میرے دوست ہیں اور بڑے استاد ہیں..... یہ استاد لاہوری محاورے کے مطابق نہیں بلکہ معلم ہونے کے حوالے سے ہیں اور اگر میرے دوست ہیں تو پھر ادیب بھی ہیں۔

ایک زمانے میں احمد وہ زمانہ قدیم نہیں بس سات آٹھ برس پیشین کا قعر ہے۔ ہم لوگ بڑی باکامدگی سے ملتے تھے..... پھر شاہ جی نے اپنے آپ کو ذرا مصروف کر لیا اور مشہور کر لیا اور مرزا صاحب پتہ نہیں کس غلطی کو پرہیز کر اس نتیجے پر پہنچے کہ زندگی کیا ہے غم کا دریا ہے۔ اس لیے زندگی سے دور ہونے کے لیے دوستوں سے دور ہو گئے اور ہاں یہ بھی ہوا کہ ہمیں زندگی نے بھی جکڑ لیا اپنا قیدی بنالیا۔ ہم معذرت کے معمولات میں اس بُری طرح سے غرق ہوئے کہ ابھرنے کا نام تک نہ لیا۔ شاید مل اسچی اسی کا نام ہے کہ انسان مسلسل کام کرتا چلا جائے اور باقی ہر شے سے دور ہو جائے..... بہر حال اس روز شاہ جی کے جی میں ہانے کیا آئی کہ آگئے اور ساتھ ساتھ مرزا صاحب بھی چلے آئے۔

”اوتھے یار.....“ شاہ جی نے ایک دل دوز ہو کا بھر کر مجھے مجھے سے لگا لیا۔ ”بڑا جی چاہتا تھا ملے کو..... لیکن.....“ اور اس ”لیکن“ کے بعد انہوں نے اپنی مصروفیات کی ایک لمبی فہرست سنائی۔ اسی طرح مرزا صاحب ذرا ٹٹکتے ہوئے بیچے میں بوسے۔ ”چھوڑی جی.....“ اور پھر ایک نیم دکاندا لٹھ لٹایا..... مرزا صاحب نے بھی مصروفیات کا حوالہ دیا۔

شاہ جی بڑی رونی صورت بنا کر بیٹھے تھے۔ یکدم میز پر مٹکا مار کر بولے۔ "اوتے یار.... کیا ہو گیا؟"
 آزاد ہو گئے ہیں۔ چھانسی پانے والوں کے گلے آزاد ہو گئے ہیں۔ ہم کب آزاد ہوں گے؟"
 "انسان زنجیروں میں جکڑا ہوا پیدا ہوا تھا۔" مرزا صاحب نے ارشاد کیا۔

"کوئی نہیں پیدا ہوا تھا زنجیروں میں؟" یہ زنجیریں ہم نے خود پہنی ہیں؟ شاہ جی گرجا کر آواز دیا
 کی کوشش میں کچھ بے وقوف ہو گئے۔ "ہم آزاد ہو سکتے ہیں؟"
 "کس طرح؟" میں نے دریافت کیا۔

"سر دیوں کی نرم دھوپ میں بیٹھ کر۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"مذاق کرتے ہو؟" مرزا صاحب نے گھوٹا۔

"نہیں مرزا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اوتے یار ہم اپنی اپنی مصروفیتوں میں قید ہو گئے ہیں۔ ٹھیک
 ہے ہم سب آسودہ حال ہونے کی کوشش کر رہے ہیں اور شہرت پر کانٹیاں ڈال رہے ہیں لیکن غلام
 یہ زندگی تو نہیں اور بقول کے زندگی کیا ہے غم کا دریا ہے؟"

"نہیں تو یہ سر دیوں کی نرم دھوپ میں بیٹھ کر ہم کب آزاد ہو جائیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"فدا و ماخ پر زور دو اور بتاؤ کہ ان دنوں کیا موسم ہے اور کون سا مہینہ ہے؟" شاہ نے نہیں
 چڑکائی۔ یہ اس کا کمال ہے وہ اتنی بھاری موزنجھول کو مسکراتے ہوئے ایسے چہرہ دکاتا ہے۔ جیسے ان میں کوئی
 بغیر اچھن گیا ہو۔

"یار کیا فضول سوال پوچھا ہے۔" مرزا صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔ "موسم سرد ہے اور مہینہ دسمبر کا۔"

"بالکل..... یہ دہی جبین ہے جس کے بارے میں سوشل مدیٹی نے کہا تھا کہ اسے کہنا دسمبر آگیا ہے"

اور میں تم سے کہتا ہوں کہ دسمبر آگیا ہے اور ذرا دسمبر کے ان دنوں کے بارے میں سوچو جب ہم اتنے
 مصروف نہیں ہوا کرتے تھے اور سر دیوں کی نرم دھوپ میں بیٹھ کر ایسے پرسکون اور آسودہ محسوس کرتے
 تھے کہ جہاں تباہ بھی دیکھ لیتے تو ہمارے ساتھ بیٹھ کر اپنے فن میں ڈوب کر سراخ زندگی پالیتے۔"

"بات یہ ہے چودھری صاحب..... کہ دسمبر کی دھوپ چارون کی ہے۔ کچھ یاد ہے ہم ان کو پوچھا

میں ایک بار اپنی بیگلوں کے ہمراہ شتر پور گئے تھے اور راستے میں سرسوں کے کھیتوں سے ساگ چوری کیا تھا۔
 اور پھر اوروں کے باغ کے کنارے بیٹھ کر اس سنہری دھوپ میں شلجم اور گاجر کی کھائی تھیں..... ہائے
 ہائے کیا زندگی تھی؟"

"اگر گاجر کی کھانا زندگی ہے تو ہم یقیناً خرگوشوں پر رشک کر سکتے ہیں۔" مرزا صاحب مسکراتے۔

"یاد مذاق نہ کرو میں بہت سنجیدہ ہوں..... دسمبر کی دھوپ چارون کی ہوتی ہے۔"

"ہاں....." میں نے بھی سر ہلایا "اور دسمبر کی اس نرم اور آسودگی میں گھلی ہوئی دھوپ میں

اگر آپ کہیں دریا سے چناب کے قافلہ آباد بیراج پر چلے جائیں تو وہاں دریا کے ساتھ سیوں تک جھیلوں
 کا ایک سلسلہ ہے اور ان میں جا بجا سرکنڈے اور جنگلی گھاس ہے جو سرسراہتی ہے اور سورج کی کرنیں جھیلوں
 کے پانیوں کو اس طرح گرم کرتی ہیں کہ ان پر تیرتی ہزاروں مرغیاں اڑ گھٹنے لگتی ہیں۔"

"مرغیاں اڑ گھٹنے لگتی ہیں؟" شاہ نے فرہ لگایا۔ "ہائے ہائے غلامو وہیں چلو۔ ابھی چلو۔ بس مجھے
 ہجرت دو کہ میں سن سے بوری اکھ والیا....." کی کیٹ گھر سے لے آؤں۔"

"شاہ جی....." میں نے ناراض ہو کر کہا۔ "مرغیوں کو یہ کیٹ پسند نہیں۔"

"نہیں تو نہ سہی....." شاہ جی نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے۔ "دوستوں کو پسند نہیں تو نہ سہی۔"

"چودھری صاحب یہ جو قافلہ آباد کا آپ نقشہ کھینچ رہے ہیں۔ تو کیا یہ سچ مچ ایسا ہے یا زرب
 داستان کا سلسلہ ہے؟"

"مرزا صاحب..... آپ ان دنوں وہاں جاتیں تو سہی..... تاکہ نظر دھوپ میں لیٹا پانی اور نہر کے
 سرکنڈے اور ہوا اور خاموشی اور اس خاموشی میں کہیں ادھر کہیں ادھر مرغیوں کی ڈاریں، پانیوں پر ہلکورے
 لپکتی ہوئیں؟"

"ہائے میری مرغیاں" شاہ جی نے "ہائے میری انگوٹھیاں" کی نان پر اپنا راجھا راجھی کیا۔

مرزا صاحب نے شاہ جی کو چپ ہونے کے لیے کہا اور پھر اپنے گھنگھریالے بالوں میں انگلیاں
 جھٹک کر کہنے لگے۔ "شاہ ٹھیک کہتا ہے ہم قید ہو چکے ہیں۔ ہمیں آزاد ہونا چاہیئے، اور یہ کام ہمیں خود

کنا ہو گا۔ اس کے لیے ایٹمی انٹر نیشنل ہماری مدد نہیں کرے گی۔“

”بالکل! شاہ جی نے مونچھوں پر تاؤ دیا۔“ سب کچھ چھوڑ دو۔ گھر بار چھوڑ دو اور ایک دن کے لیے
قلاو ایک دن کے لیے نادہ آباد چلتے ہیں۔“

”نادہ آباد نہیں شاہ جی قلاہ آباد....“

”ہاں وہی۔ کاروں پر چلتے ہیں۔ ٹوٹن مارکیٹ سے ہنٹریف کا ایک کلونہ یہ لیں گے اور ایلے
ہوئے اٹھے چس اور....“

”کچھ گلاب جامن بھی....“ مرزا صاحب نے کہا۔

”نہیں یاد مجھے گلاب جامن پسند نہیں۔“ میں نے کہا۔

”مجھے تو ہیں۔“ مرزا صاحب ناراض ہونے لگے۔ گلاب جامن کے بغیر نہیں جانا۔“

”ہاں تو....“ گلاب جامن اور بیگلوں سے کہیں گے کہ پرلٹے اور رائڈے۔“

”نہیں نہیں۔“ مرزا صاحب اچھل پڑے۔ بیگلوں کو تو بتانا ہی نہیں۔ وہ کہیں گی میں بھی ساتھ لے کر

جاؤ۔ ہم آزاد ہونا چاہتے ہیں ایک روز کے لیے اور اپنی زنجیریں ساتھ لے کر چلیں؟ نہیں نہیں۔“

”اچھا تو بیگمیں نہیں جائیں گی؟“ شاہ جی نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے دوست کہتے ہیں تو ٹھیک ہے

ویسے یہ نادہ آباد میرا مطلب ہے قادر آباد کو لاہور سے راستہ کون سا جاتا ہے۔“

”لاہور سے گوجرانوالہ....“ وہاں سے علی اور چٹھہ کی طرف۔“

”گوجرانوالہ....؟ اٹتے اٹتے مرزا صاحب چڑے۔“

”کیا مطلب مرزا صاحب چڑے؟“ مرزا صاحب چونکے۔

”میرا مطلب ہے وہاں دوست چڑے شتے ہیں۔ روسی چڑے وہ بھی کھائیں گے۔“

”نہیں نہیں اگر گوجرانوالہ میں ہم روسٹ چڑے وغیرہ کھانے کے لیے بیٹھ گئے تو دیر ہو جائے گی

اور یوں بھی خند آنے لگے گی۔“

”پہلے پیک کرالیں گے۔“ شاہ جی نے خوش ہو کر کہا۔ ”تو بس ٹھیک ہے۔ کب کا یہ دیکھنا

کلی چلیں؟“
”کل! یار کل تو میرے بیٹے کا پہلا سٹیڈ اپ امتحان ہے۔ اسے کار چاہیے۔ پرسوں نہ چلیں؟“ میں

نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ مرزا صاحب بولے۔ ”لیکن گلاب جامن ضرور ساتھ لے جانے ہیں۔“

”یاد بات یہ ہے۔“ شاہ جی نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ ”پرسوں تو ٹی وی ٹائم والے میرا انٹر ویو لینے

آ رہے ہیں پرسوں نہیں....“ مجھے کے روز بہتر رہے گا چھٹی بھی ہے۔“

”اوتے نہیں بھئی۔“ مرزا صاحب کہنے لگے۔ ”بڑی مشکل سے سیریل کا آئیڈیا منظور ہوا ہے۔ جمعہ کے

روز تو میری ٹینگ ہے ہمدردیوں کے ساتھ۔“

”تو ہفتے کے روز لے کر لیتے ہیں۔ کیونکہ اس روز سب فارغ ہوں گے ٹھیک ہے؟“

”یار ہفتے کے روز تو میں اسلام آباد چلا جاتا ہوں۔ صبح کی نشریات کی میزبانی کے سلسلہ میں....“

میں نے جھپٹتے ہوئے کہا۔

”تو صبر اگے ہفتے سہی۔“

”بالکل اگے ہفتے۔“

”ہاں مزور....“ ہر صورت آزاد ہونا ہے۔ دسمبر کی دھوپ چار دن کی ہوتی ہے۔“

”اٹتے اٹتے مرزا فایاں۔“ شاہ جی خوش ہو رہے تھے۔ لیکن نہیں، وہ جانتے تھے کہ دسمبر کی دھوپ کے

چار دنوں میں سے ایک دن ختم ہو رہا ہے اور دوسرے دن میں معروف ہوں۔ تیسرے دن وہ خود کہیں نہیں

جاسکتے اور چوتھے روز مرزا صاحب کی ٹینگ ہے.... چار دن تمام!

”پاکی باسٹرو“

پچھلے دنوں اخباروں میں چھوٹی چھوٹی دو خبریں تھیں۔

ایک تو یہ تھی کہ کوئی شخص ایک طویل مدت کے بعد ممالک غیر سے پاکستان آیا اور خاص طور پر ہونے والے کے لیے آیا اور جوہنی وہ اشریورٹ پر اتر اس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ اور ایک اور خبر تھی کہ ایک کرکٹ میچ کے دوران انگلستان کی کاؤنٹی ڈرہسٹر شائر کے تماشاخیوں نے عمران خان اور پاکستانی ٹیزو بھٹا شہری ریحان علی خاں پر آواز سے کہے اور انہیں گالیاں دیں۔ عمران خان نے ریحان علی خاں کو گالیاں دینے کے واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ مجھ سے زیادہ اس واقعہ کا دکھ ریحان علی خاں کو ہوا ہو گا کیونکہ ان کے والدین تو پاکستان سے آئے تھے لیکن وہ خود انگلستان میں ہی پیدا ہوا تھا۔

شاید عمران خان یہ کہنا چاہتے تھے کہ بھائی ہم تو ہومسے ہی پاکستانی اور کالے (انگریز) ملک ہمارے ہیں کہ عمران بیشتر گوردوں سے زیادہ گورے ہیں (لیکن ریحان بے چارہ تو یہیں پیدا ہوا۔ اس کے پاس برطانوی شہریت ہے۔ وہ اپنے آپ کو برطانوی کہتا ہے۔ اس بے چارے کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہوگی کہ یہ تماشاخی مجھے کیوں گالیاں دے رہے ہیں۔ میں تو ان کا ہم وطن ہوں۔۔۔۔۔ میں یہ کالم ریحان علی خاں ایسے لوگوں کے لیے لکھ رہا ہوں جو یہ نہیں جانتے کہ انگریز ان کو کیوں گالیاں دیتے ہیں اور یہ کالم ان کے لیے بھی ہے جو ایک طویل مدت تک اپنے ملک سے جدا رہتے ہیں اور اس کی جانب آتے ہیں تو بڑا پورٹ پر ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی مٹی کے قریب پہنچ کر مٹی ہو جاتے ہیں۔

انگلستان میں خاص طور پر انہوں نے پاکستانی آباد ہیں اور بہت عرصے سے آباد ہیں۔ ان میں سے بیشتر کی اولاد انگلستان کی ”جم پل“ ہے۔ انہوں نے پاکستان کو تصویروں فلموں، اپنے بزرگوں کی باتوں میں

دیکھا ہے۔ اور شاید کبھی ایک مرتبہ کسی مختصر البیڈ سے میں یہاں آئے اور ”اوہ یہ کتنا گندہ ملک ہے۔“ اور ”دیکھ میں تو یہاں نہیں رہ سکتی“ کہہ کر واپس چلے گئے۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ بنیادی طور پر یہاں رہنے والے جو اپنے آپ کو اپنے آس پاس کے مطابق ڈھال لیتا ہے اور پھر اسے اس ماحول کی اتنی مدت ہو جاتی ہے کہ وہ کہیں اور جا کر رہائش پذیر ہونے میں وقت محسوس کرتا ہے۔ ہمارے ایک دوست لکھتا ہے کہ وہ پاکستان میں تعمیر شدہ ایک ایسے عالی شان محل میں گئے جو عرب بھائیوں نے اپنے شکا کا کہا ہے کہ وہ پاکستان میں تعمیر شدہ ایک ایسے عالی شان محل میں گئے جو عرب بھائیوں نے اپنے شکا کے خیمے کے مقابل کے طور پر بنوایا تھا۔ اس میں لاکھوں کمروں کے عالی شان فانوس ہیں اور رنگ سرسبز کا یہ محل مرکزی طور پر اشریورٹ کنڈیشنڈ ہے۔ ایک صبح انہوں نے یہ دیکھا کہ عرب بھائی چوری چھپے باہر نکلتے ہیں اور ریت کے ٹیوں پر لوٹیلے کر اور کچھ دیر سستا کر پھر اندر چلے جاتے ہیں۔ یعنی وہ اس شاندار محل میں آرام محسوس نہیں کرتے بلکہ ریت پر لیٹنے میں ان کو راحت ملتی ہے۔

چنانچہ ایسے نوجوان جو انگلستان میں پیدا ہوئے اور پہلے برسے ذہنی طور پر بالکل انگریز ہیں اور یہ قابل فہم ہے کیونکہ جس ماحول میں وہ آنکھیں کھولیں گے اسی کو اپنا لیں گے۔ یہ نوجوان ٹکے اور ٹکیاں مکمل طور پر انگریز محسوس کرتے ہیں اور صرف اس وقت انہیں تھوڑا سا شک ”ہوتا ہے۔ جب وہ آئینہ دیکھتے ہیں کہ ہم تو اتنے گورے نہیں۔ درنہ وہ اس فرق کو بالکل محسوس نہیں کرتے۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ ان کے ساتھ وہی کچھ ہونے لگتا ہے جو ریحان علی خاں کے ساتھ ہوا۔ بے شک پاکستانی ٹیزو اور ٹکیوں کے ساتھ ہوا ہے۔۔۔ ہر کالی رنگت والے کے ساتھ ہوا ہے۔ بے شک آپ کے دادا جان انگلستان آئے تھے اور غامبی خاندان کے دوستوں میں سے تھے اور وہ شاید انگریز فوج میں بڑے عہدہ پر تھے اور پھر آپ کے والد لندن کے شہر میں تولد ہوئے اور پھر آپ بھی وہیں پیدا ہوئے اور آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ ہندوستان پاکستان کہہ کر جو جانا لگتا ہے لیکن اس کے باوجود آپ کبھی بھی برطانوی نہیں بن سکتے۔

بے شک سوائے انگریزی کے آپ کو کوئی اور زبان نہ پوئیں اور آکسفورڈ سے انگریزی اور جیٹیکشن کے پروفیسر ہیں۔ آپ پاکی باسٹرو بن جائیں گے۔ میں بھلے زمانوں میں انگلستان ہوا کرتا تھا۔ ابھی نسلی منافرت

نے جس میں نہیں پکڑی تھیں۔ اس کے باوجود ہم ان کے لیے ایک عجوبہ تھے۔ ہم فراموشی کی بات کرتے تو وہ حیران رہ جاتے کہ اچھا پاکستانی ہو کہ بھی اتنے عقلمند ہو۔ اگر ہم انگریزی کا کوئی اچھا فقرہ بولتے تو بہت داد ملتی کہ ویل دن۔ آپ نے صرف ایک دو سال یہاں رہ کر اتنی اچھی انگریزی سیکھ لی۔ اب ہم انہیں کیا بتاتے کہ مائی باپ ایک دو سال نہیں، ہم تو سینکڑوں برسوں سے انگریزی سیکھ رہے ہیں۔ جب ہم پیدا ہوتے ہیں تو "سیڈم" اور "میں بیٹھ جاؤں پاپا" کہنا شروع کر دیتے ہیں اور "ٹوٹل ٹوٹل نسل سنار" گاتے ہیں اور پھر ساری عمر درست گرامر اور درست تلفظ پر قربان کر دیتے ہیں۔ ہم شیلیکیر کو شیلیکیر کے ہم وطنوں سے زیادہ جانتے ہیں اور اس کے باوجود وہ ہمیں ان پڑھ ہی سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔ کئی جاننے والے ہیں جو انگریزی میں شاعری کرتے ہیں کہانیاں لکھتے ہیں اور بہت اچھا لکھتے ہیں اور میں ہمیشہ ان کی خدمت میں گزارش کرتا ہوں کہ مائی میرے انگریزی زبان میں لکھنے والے ادیبوں کی ایک فہرست تیار کی جائے تو اس میں دس ہزار نام ہوں تو اس میں آپ کا نام نہیں آسکے گا۔۔۔۔۔ اپنی زبانوں میں لکھنے۔ یہاں تو سودو سو کی فہرست بنی تو آپ اس میں ہوں گے ہم لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ہم غیر ملکیوں کی فہرست میں کبھی نہیں آئیں گے صرف اپنی فہرست میں ہی نام پائیں گے۔

ریحان علی خان کو اسی لیے بہت دکھ ہوا ہو گا کہ اس کے خیال میں وہ برطانوی تھا اتنا ہی برطانوی جتنا کہ ایک عام انگریز۔ شاید اس سے بہتر کہ وہ پڑھا لکھا تھا۔ شکل میں بھی بہتر تھا اور خاص ہے کاؤچی کرکٹ کھیتا تھا اور ایک معروف کھڑی تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے گایاں دی گئیں۔۔۔۔۔ اور بے معلوم ہے کہ وہ گانیاں کیا ہوں گی۔۔۔۔۔ یہی کہ کالے لوگو اپنے وطن واپس جاؤ۔۔۔۔۔ پاکستانی باسٹوڈن وغیرہ۔۔۔۔۔ تو ریحان نے سوچا ہو گا کہ میں تو یہاں کا رہنے والا ہوں۔ لیکن ریحان صاحب آپ وہاں کے رہنے والے نہیں ہیں۔۔۔۔۔ آپ اپنی تمام تر قابلیت اور خوش شکلی اور برطانوی شہریت کے باوجود کسی نالی میں گرے ہوئے شراب میں دھت ان پڑھا اور احمق انگریز کی ایک انگلی کے برابر نہیں ہو سکتے۔ یہ تو اپنا وطن ہے۔ اس کی مٹی ہے اس کی دھول ہے جو انسان کو عزت دیتی ہے۔ اسے سب کے برابر

بناتی ہے۔ ایک حوالہ ہے ایک پہچان ہے جس کے بغیر آپ کو گایاں پڑتی ہیں۔ شام میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ کوئی پچاس برس پہلے پنجاب سے ادھر گئے۔ کسی عرب دوشیزا پر مرٹے داد دیں کے اور اسی کے ہو رہے۔ جب میری ملاقات ہوئی تو ان کے درجنوں بچے پوتیاں اور ظاہر ہے اس سے پہلے بیٹے بیٹیاں تھے۔ جس محلے میں رہتے ہیں وہاں انہیں سب "وگ ہندی" کہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی اپنی اولاد انہیں "ہندی" کہتی ہے۔ وہ اردو وغیرہ تقریباً بھول چکے ہیں۔ پچاس برس میں ایک دو مرتبہ گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہندی ہیں۔۔۔۔۔ پہچان تبدیل نہیں ہوتی۔ آپ تبدیل ہو جائیں لیکن آپ کا حوالہ ایک ہی رہتا ہے اور وہ ہے آپ کا وطن۔۔۔۔۔ مجھے افسوس ہے کہ عمران خان اور ریحان کو گایاں دی گئیں صرف ان کی نسل کے مختلف ہونے کی وجہ سے۔۔۔۔۔ لیکن میں تھوڑا سا خوش بھی ہوں کہ ریحان جیسے نوجوان کو یاد رہے گا کہ ان کی نسل کیا ہے۔ ان کا اصل وطن کون سا ہے اور اس کی روایات کیا ہیں۔۔۔۔۔ یہ وطن جیسا بھی ہے یہاں پر تمام تر خرابیوں کے باوجود کوئی آپ کو "پاک باسٹوڈن" کہہ کر نہیں پکارے گا۔

”بازار حسن یا بازار مجبوری“

کیا بازار حسن میں شریف لوگ جاتے ہیں؟

ظاہر ہے یہ ایک انتہائی احمقانہ سوال ہے اور تمام شریف لوگ بازار حسن نہیں گئے کہ جی ہم تو نہیں جاتے اور یہی مناسب جواب ہے کیونکہ شریف لوگ اسی لیے ایک عرصہ تک شریف رہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ انکار کرتے رہتے ہیں۔ اقرار کر لیں تو شریف کیسے کہہ سکتے ہیں؟

بہر حال میں چونکہ ایک ادیب ہوں اور بہت زیادہ شریف آدمی نہیں ہوں اس لیے میں انکار کرتا ہوں کہ میں دوسرے بازار حسن کی سیر کر چکا ہوں۔

ایک بار اور پہلی بار میں اپنے والد صاحب کے ہمراہ وہاں گیا تھا۔

لاحول ولا... آپ غلط سمجھے ہیں۔ جناب میرے والد صاحب مجھے خاص طور پر وہاں لے کر نہیں گئے تھے اور نہ ہی اس علاقے میں ان کی آمد و رفت تھی۔ دراصل آج کے اقبال پارک اور ان دنوں کے منٹو پارک میں کوئی سیاسی جلسہ تھا اور والد صاحب مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ واضح طور پر اس وقت راقم الحروف بچہ تھا اور اتنا بچہ تھا جتنے بچے کو اگر بازار حسن سے گزار دیا جائے تو وہ کچھ نہیں کہتا صرف انگوٹھا چوستا رہتا ہے۔ جلسہ پر ہجوم تھا اور جب ختم ہوا تو ہر جانب زندہ دلاں اور ایک دوسرے کو دھکے مار مار کر راستہ بنا رہے تھے۔ اس لیے والد صاحب نے مجھے ان دھکوں سے بچانے کی خاطر سرکلر روڈ کی بجائے گوالڈی جانی کے لیے ٹی کے راستے کو اختیار کیا۔ میں ان کی انگلی پکڑے چل رہا تھا۔ یہاں بھی بہت زیادہ رش تھا اور یہ رش اسی جلسے میں سے لوٹنے والوں کا تھا۔ میں اگرچہ پر تھا اور اگرچہ مزاج جو تھا وہ بہت شریفانہ تھا اور عاشقانہ ہرگز نہ تھا۔ اس کے باوجود میں نے صوبی کی

علاقہ مختلف ہے یہاں کی خوشبو تیز ہے اور ریڑی نہیں بچ رہے۔ لیکن کہیں کہیں سے موسیقی کی آواز آرہی ہے۔ یہاں گھومنے والے لوگ مختلف ہیں اور بالکونیوں میں براجمان خواتین ”بھی قد سے شوخ لگ رہی ہیں۔ جب میں نے قدرے پر شوق انداز میں ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا تو والد صاحب نے صرف ایک فقرہ کہا ”بیٹے یہاں اچھے لوگ کبھی نہیں آتے۔ یہ فقرہ ہمیشہ میرے ساتھ رہا۔ یوں تو میری سمجھ میں بالکل نہ آیا کہ اچھے لوگ یہاں کیوں نہیں آتے۔ کیونکہ اچھا بھلا خوشبودار علاقہ تھا لیکن میں سر جھکا کر چل رہا اور ہم قطعی ہی دیر میں اس علاقے سے نکل کر مسجد وزیر خاں کی جانب چلے گئے۔

اگرچہ زندگی میں بہت خانہ بدوشی کی لیکن شاید یہ اس فقرے کا اثر تھا جو والد صاحب نے بچپن میں وہاں سے گزرتے ہوئے کہا تھا یا میری ہندوئی تھی کہ میں اس بازار میں کبھی بھی اپنی مرضی سے نہیں گیا۔ جی نہیں، مجھے کبھی زبردستی بھی نہیں لے جایا گیا۔ لیکن بچپن کی اس سیر کے بعد میں ایک مرتبہ اور بازار حسن گیا۔

اشفاق احمد کی ایک بہت خوب صورت سیریز ”ایک محبت سوانح“ میں ٹیلی ویژن پر چل رہی تھی چند مناظر میں میں نے بھی مرکزی کردار ادا کیا۔ اسی سیریز کا ایک ڈرامہ تھا جس میں فاروق منیر مرکزی کردار ادا کر رہے تھے۔ میں ٹیلی ویژن اسٹیشن پہنچا تو معلوم ہوا کہ ڈرامے کے ایک منظر میں فاروق منیر کو بازو میں دیکھا یا جانا ہے اور اشفاق صاحب چاہتے ہیں کہ اس میں حقیقت کا رنگ بھرا جائے اور حقیقت ظاہر ہے وہاں تھی جہاں گھنٹہ دو چھ تک رہے تھے۔ چنانچہ ہمیں بھی ”مجبوراً“ صرف ڈرامے کی خاطر پورے یونٹ کے ساتھ ادھر کا رخ کرنا پڑا۔ جہاں کے باسے میں والد صاحب قبلے فرمایا تھا کہ وہاں شریف آدمی نہیں جاتے۔

شام کا وقت تھا اور ابھی سڑک پر جارہے تھے اور پردے کھینچے جا رہے تھے اور تیز خوشبو میں ابھی کوٹھوں اور کمروں میں نفیس بازار میں نہیں پھیلی تھیں۔ ٹیلی ویژن کے کیمرہ مین نے اپنے زاویے تلاش کیے اور پھر دوسرے منظر کو ہدایت دی کہ آپ اس طرح یہاں داخل ہوں گے۔ آپ بے حد پریشان ہو گئے آپ کے بل بکھرے ہوئے ہیں۔ موٹھیں پھڑک رہی ہیں وغیرہ وغیرہ اور یوں ادھر ادھر

دیکھتے آپ ایک کوٹھے کی سیڑھیوں میں پہلے جلتے ہیں۔ چونکہ ریکارڈنگ میں ابھی کچھ دیر تھی اس لیے ہم نے فزا، ساٹھی انگ، شروع کر دی۔ ہم جہاں سے بھی گزرتے وہاں سے نہایت عزت اور احترام سنائی دیتے۔ مثلاً، آئیے آئیے، تار صاحب، کبھی ہمارے ہاں بھی تشریف لائیں۔

جناب آج آہی گئے ہیں تو ادھر بھی آجائے۔

ادھر آپ فزا جلدی آگئے۔ یہاں تو ابھی درمی جاڑ رہے ہیں۔

بات سنیں۔ آپ مجھے پہچانتے نہیں؟ میں نے آپ کے ساتھ فلاں ڈرائے میں کام کیا تھا۔
دراصل بازار حسن کے لیکن مجھے پتا ہی سمجھ رہے تھے کیونکہ میں بھی ٹیلی ویژن پر کام کرتا تھا۔ ان میں سے بیشتر کا چہرہ ٹیلی ویژن سکرین کی زینت بنتا تھا۔ بہر حال کچھ شرمندگی بھی ہوتی کہ کسی بلدی میں شامل کر رہے ہیں۔ لیکن ایک حقیقت پر غور کیاں کروں گا کہ جن لوگوں نے بلایا یا تو تمیں روانہ کیے تو وہ سراسر خلوص کے پیکر تھے۔ کیونکہ میں بہر طور، گاہک نہ تھا۔ اور مجھ سے کسی فائدے کی امید کے بغیر وہ مجھے مدعو کر رہے تھے اور میرے انکار پر تو تمیں مجبور ہوئے تھے کہ ”وہ بی بی جی نیلے سوٹ والی نے آپ کے لیے بھیجی ہیں۔“

اگرچہ ہم وہاں ایک سرکاری کام کے سلسلہ میں گئے ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود وہاں جہاں تھا کہ کہیں چاہے نہ پڑ جائے..... تو یہ کل دو ملاقاتیں ہیں میری اور بازار حسن کی گزشتہ چارہاں برسوں کے دوران..... میں نے جو کچھ وہاں دیکھا اسے پتہ نہیں کون لوگ بازار حسن کہتے ہیں، مجھے تو وہ بازار مجھوٹا لگا۔

”ہم پاکستان کے یار ہیں“

”یرقان بھائی.....“

”میں نے کہا یرقان بھائی..... سمجھتی ہیں ہوں تمہارا یرقان بھائی..... کیا چپ کارو نہ رکھے ہوئے ہو جو بولتے ہی نہیں اور کیا ہر شے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہو۔ کیا اس سے پیشتر پھول، درخت، عمارتیں اور کھیت نہیں دیکھے جو انہیں اتنے غور سے دیکھ رہے ہو..... یا ربات تو کرو..... کچھ کہو تو بھی کہہ دیا ہوا..... کیا تم ہمارے یار نہیں ہو.....؟“

”میں تو پاکستان کا یار ہوں یرقان بھائی.....“

”شکر ہے تم بولے..... لب کھولے..... لیکن ہوا کیا؟“

”دیکھو ان پھولوں کے رنگ دیکھو..... اتنے چمکیلے اور اتنے شوخ اور اتنے آسمانی رنگ کس دیس میں ہوں گے..... اور یرقان ان درختوں کو تو ایک نظر دیکھو یہ کتنے قدیم اور کتنے مقدس ہیں۔ ان کی پھاڑوں میں ہمارے بزرگ بیٹھتے تھے اور پھر ان کے بزرگ..... ہزاروں سال سے یہ ہم پر سایہ کئے ہوئے ہیں..... اور ان میں کیسے کیسے خوش آواز پرندے بسیرا کرتے ہیں۔ ان کے نغمے کتنے سُریلے ہیں.....؟“

”یرقان بھائی کیا بات ہے شاعری کا شوق چرایا..... تم آج ہر شے کی تعریف کرنے پر کیوں لگے ہوئے ہو.....؟“

”یہ سب کچھ ہے ہی تعریف کے قابل..... کیا دنیا کے کسی ملک میں اتنے سرسبز

کھیت ہیں؟

”ہوں بھی تو ہمیں کیا..... لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایسے سرسبز اور پُر ہمار کھیت میں نے پوری دنیا میں نہیں دیکھے...“

”تم یہ بتاؤ کہ کیا پاکستان میں کوئی ایک شخص ایسا ہوگا جو ان پھولوں اور درختوں اور کھیتوں کی ہمیشہ کے لئے تباہی کی خواہش کرے.....“

”تو یہ کرو..... کیا بات کرتے ہو..... پاکستان کے باہر ہو تو پاکستان کے اندر تو ایسا کوئی شخص نہیں ہو سکتا۔“

”تم یہ بتاؤ کہ گھوڑا اختلافات کو بنیاد بنا کر کیا کبھی گھر کی تباہی کے نعرے لگانے چاہتا ہے؟“

”لو کیا بات کرتے ہو..... گھر تو بنیاد ہوتی ہے اس میں رہتے ہوئے اختلافات تو سمجھ لیتے ہیں..... یہی کہ اس کی ڈکوریشن کسی ہو، لان میں کون سے پھول لگائیں اور وہ کس رنگ کے ہوں..... اس میں اتھارائی کس کے پاس ہو یا یہ کہ گھر چلانے کے طریقے سے بھی اختلاف ہو سکتا ہے لیکن گھر سے تو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر گھر نہ ہو تو ڈکوریشن کہاں ہوگی اور پھول کہاں لگیں گے؟“

”فرقان گھر اور گھوڑے میں بھی کچھ چیزیں مشترک ہوتی ہیں۔“

”گھر اور گھوڑے میں؟“

”ہاں..... گھوڑا ہمیں منزل تک لے جاتا ہے۔ صحرا اور جنگل عبور کر دیتا ہے..... اب

اگر ہم اس بات پر دلگانہ مشروح کر دیں کہ اس گھوڑے پر کون سے رنگ کی اور کون سے ڈیزائن کی کاشی ڈالنی ہے اور اس دوران گھوڑے کی خوراک کا خیال نہ رکھیں تو

پھر کیا ہوگا خزان بھائی؟“

”گھوڑا کمزور ہو جائے گا۔“

”اور اس کے بعد؟“

”گھوڑا مزید کمزور ہو جائے گا۔“

”اور اگر ہم اس کے باوجود آپس میں لڑتے جھگڑتے رہیں کہ گھوڑے پر ہم اس رنگ اور اس ڈیزائن کی کاشی ڈالیں گے اور اس کو خوراک نہ کھلائیں تو بالآخر کیا

ہوگا؟“

”خا ہر ہے گھوڑا بے چارہ مر جائے گا۔“

”اور پھر وہ کاشی کہاں ڈالی جائے گی؟“

”کہیں بھی نہیں۔ کیونکہ گھوڑا ہوگا تو کاشی ڈالی جائے گی ناں؟“

”اللہ تمہارا بھلا کرے..... گھر کا بھی یہی حساب ہے۔ آپ اگر گھر کا خیال نہیں

رکھیں گے تو.....“

لیکن یار تم آج اتنے سنجیدہ موضوع پر کیسے گفتگو کر رہے ہو.....“

بس آج میرا دل بہت دکھی ہے..... پہلے پہل غصہ بھی آیا لیکن اب میرے اندر صرف دکھ ہے..... تم نے بھی سنا ہوگا کہ ایک صاحب کی ایک شہر میں آمد کے موقع پر یہ

نعرے لگائے گئے کہ توڑ دو پاکستان توڑ دو..... اور جو پاکستان کا یار ہے غدار ہے.....

”ہاں میں نے اخباروں میں پڑھا تو ہے لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ ایسے نعرے بھی

لگائے ہیں۔“

”ہاں! اور اس جیسے کے متقلبین نے بھی فوراً تردید کی ہے کہ یہ نعرے ہم نے

برگوزن نہیں لگائے۔“

”تو پھر کس نے لگائے..... کسی نے تو لگائے..... شاید چند لوگوں نے شرارت

کا..... مذاق کیا..... شاید کسی ایک شخص نے ایسا کیا.....“

”نہ یہ شرارت اچھی اور نہ ایسا مذاق۔“

”بہر طور مجھے دکھ اسی بات کا ہے کہ نعرے لگے چاہے ایک شخص نے لگائے
چند افراد نے۔“

”کیا خیال ہے ان افراد کے بارے میں..... ان سے پوچھنا چاہیے۔“
سزا ملنی چاہیے۔“

”میرا خیال ہے اگر ان لوگوں کو کچھ شکایتیں ہیں تو وہ عوام بتائیں..... اگر عوام
سے اختلاف ہے تو بے شک اٹھیں۔ آزادی ہے کہ وہ حکومت کے بارے میں جو مرنے کیس ہیں
اس پاکستان کے بارے میں..... نہیں جناب یہ میرا گھر ہے..... میں اسے توڑنے دلاں
تم خواہ مخواہ بنز باقی ہو رہے ہو.....“

”خواہ مخواہ تو نہیں فرغان بھائی..... میرے پاس بنز باقی ہونے کی بنیاد موجود ہے۔
میں نے ہمسایہ ملک بھی دیکھ رکھے ہیں اور مجھے پتہ ہے کہ قدرت کی جو نعمتیں اور جو خوبصورتی
اس ملک میں ہیں وہ وہاں خواب میں بھی میسر نہیں..... ہندوستان کے باشندے جب ہمارے
ہاں آتے ہیں تو اپنی روایتی پاکستان دشمنی کے باوجود پاکستان کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے
ہیں۔ اس ملک کے صدر مقام میں اگر کوئی پاکستانی جاتا ہے تو دور سے پہچانا جاتا ہے کہ وہ
اس کا رنگ روپ جدا ہوتا ہے۔ اس کی سمت بہتر ہوتی ہے۔ اس کا لباس صاف ستھرا ہوتا
ہے اور وہ سر اٹھا کر چلتا ہے..... سیاسی اور حکومتی ڈھانچوں کے حوالے سے اختلاف کیا
جاسکتا ہے۔ یوں آپ پاکستان کی تاریخ دیکھئے تو یہاں مختلف نظام سلطنت نافذ ہوئے ہیں
کبھی سمدارنی اور کبھی پارلیمانی۔ چنانچہ یہ اختلاف کا حق تو ہر ایک کو حاصل ہے.....“

”تو پھر ان نعرہ بازوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیئے؟“
”اول تو ایسے نعرہ باز موجود ہی نہیں۔ یہ صرف چند افراد کی شرارت ہے۔ جو تو فائدہ ٹھارت
اور اگر خدا نخواستہ ایسے چند افراد موجود ہیں تو ان کو پھانسی دے دینا چاہیئے کہ وہ سامنے آئیں اور ہم
کی طرح ان کی بات سنیں گے۔ وہ ہیں بتائیں تو سہی کہ انہیں یہ نعرہ لگانے کی ضرورت نہیں

پیش آئی۔ انہیں کیا تکلیف ہے؟ ان کے ساتھ کیا زیادتی ہوئی ہے؟..... ہم ان کو
تکلیف دے کر کریں اور زیادتی کا ازالہ کریں.....“

”اور اس نعرے سے جو ہمیں دکھ ہوا ہے اس کا کیا کریں؟“
”نعرے کا جواب تو نعرہ ہی ہو سکتا ہے۔“

”کون سا نعرہ؟“
”یہی کہ..... جی ہاں بالکل درست ہم قبول کرتے ہیں کہ.....“

”ہم پاکستان کے یار ہیں.....“
”یار ہیں؟“

”مائی پھیرے باز“

جب آپ سفر پر نکلتے ہیں تو ایک نئی دنیا میں داخل ہوتے ہیں۔ دراصل دنیا تو وہی ہوتی ہے لیکن وہاں کی زبان، موسم، خوراک اور لوگ مختلف ہوجاتے ہیں اور یوں وہ نئے نئے لگتے ہیں۔۔۔۔۔ سفر کی تصویر بے شمار مختلف رنگوں میں بنتی ہیں۔ ناکامیاں، مشکلات، اداسیاں، مسرتیں، کامیابیاں یہ سب اس میں رنگ بھرتے ہیں۔ لیکن سب سے اہم رنگ سفر کی تصویر کا۔۔۔۔۔ لوگ ہیں، عوام ہیں، وہ کردار ہیں جو اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی زمین پر سرگرداں ملتے ہیں۔ آپ گھر آکر ان کرداروں کو یاد کرتے ہیں تو گویا انہی یادوں میں سفر کرنے لگتے ہیں جہاں ان سے ملاقات ہوئی تھی اور اگر ان کرداروں میں سے کوئی ایک بچہ یا عورت یا پاکستان میں آپ کے شہر میں آپ کے سامنے آکھڑا ہو تو آپ کیا محسوس کریں گے؟ پچھلے برسوں میں دو تین مرتبہ ایسا ہوا کہ سفر کے دوران ملنے والا کوئی نہ کوئی شخص مجھے تلاش کرتا ہوا مجھ تک پہنچ گیا اور جب میں پہچان نہ سکا تو اس نے اپنا تعارف کچھ کچھ اس طرح کر دیا۔ ”یاد ہے جب تم ایران یا ترکی میں غلاں شہر میں گھوم رہے تھے اور ملاقات ہوئی تھی؟“

پچھلے برس ایک ایسا نوجوان میرے پاس پہنچ گیا جس نے دس برس قبل سوئٹزرلینڈ میں مجھے اپنی کارپوریشن دی تھی اور ہم دونوں نے پورا دن اس مختصر جنت میں سفر کرتے ہوئے گزارا تھا۔ اس کی بوی بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ دراصل کراچی سے پشاور جا رہا تھا اور سفر کے دوران کچھ پاکستانی مسافروں کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے اس نے میرا نام لیا

میں اتفاقاً یہ کہ وہ مجھے جانتے تھے۔ انہوں نے اُسے بتایا کہ میں لاہور میں ہوتا ہوں چنانچہ وہ دونوں یہیں آکر گئے اور پھر سٹیویرٹن سٹیشن سے میرا پتہ حاصل کر کے مجھ تک پہنچ گئے۔ مجھے دس برس قبل کا وہ سوس لڑکا یاد نہ تھا۔ لیکن جب اس نے تعارف کر دیا تو پھر آہستہ آہستہ اس کا چہرہ آشنا ہوتا گیا۔ میں نے اپنا سفرنامہ ”خانہ بدوش“ نکال کر اسے وہ دو تین صفحے سنائے جو میں نے اس کے بارے میں لکھے تھے۔ ظاہر ہے میں اس سے مل کر بہت خوش ہوا۔۔۔۔۔ ”خانہ بدوش“ کا ہی ایک اور کردار کل میرے پاس آگیا۔ یہ مائی پھیرے باز تھی۔

مائی پھیرے باز جو ”مسافر خانہ نادر“ امیر کبیر سٹریٹ تھران میں ملی تھی اور دس برس پہلے ملی تھی۔ انتہائی مدبر اور بارعب خاتون جس کے سر کے بال برف سفید تھے۔ جو پورے روزے رکھتی تھی۔ ہر سال حج کرتی تھی۔ نماز قضا نہ کرتی تھی اور ایک ملک سے مال خرید کر دوسرے ملک میں جہا بچتی تھی۔ یعنی سمجھنگ کرتی تھی لیکن تہہ دل سے اس بات پر یقین رکھتی تھی کہ یہ تو کاہل بار ہے۔ ترکی سے کچھ خریدنا اور عراق میں جہاد کان لگائی۔ ہر بڑے شہر میں وہ ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرتی، لاکھوں کوفون کر دیتی اور وہ ہوٹل ہی میں آکے مائی اور ان بھی۔ اس کے بیٹے بھی یہی کام کرتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ بڑی املاں اب کاروبار چھوڑ کر اللہ اللہ کریں۔ لیکن وہ کہتی تھی کہ میں اپنی روزی خورد گاہوں کی تھران میں اس مائی نے مجھے مزیدارسویاں کھلائیں اور پھر دمشق اور استنبول میں رہائش کے سنے ہوٹلوں کے پتے بتائے۔ مائی پھیرے باز ”خانہ بدوش“ کا ایک کردار تھی۔ دس برس بعد کل وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ کھڑی تو نہ تھی۔ کوشش میں تھی کہ کھڑی رہے۔ اس کے سر کے بال سفید تو پہلے ہی تھے لیکن اب وہ کم ہو چکے تھے۔ عینک کے بیٹے بھی دبیز ہو چکے تھے اور اس کے ہاتھ میں ریشہ تھا۔ میں ظاہر ہے اُسے پہچان نہ پایا اس نے کھڑے ہو کر مجھ دیکھا اور آگے بڑھ کر میرے سر پر پیار دیا۔ میں نے سمجھا

شاید کوئی دود کی رشتہ دار خاتون ہے جسے میں پہچان نہیں رہا لیکن ایک احساس ہوتا ہے کہ
چہرہ دیکھا ہوا تھا۔

”مائی پھرے باز؟ میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔

”پنر تم تو خاصے بزرگ ہو گئے ہو۔ وہ مسکرا کر کہنے لگی ”پتہ ہے میں کون ہوں؟ میں نے
انکار میں سر ہلایا لیکن مسکراتے ہوئے اُسے بیٹھے کے لئے کہا۔

”میں آگئی ہوں واپس اپنے مکان میں..... یاد نہیں مجھے تم تہران میں تھے ساؤنا
نادر میں.....“

”ختم ہو گئی پھرے بازی پتر..... پر تو سنا بال بچے راضی بازی؟ دو بیٹے ہیں ناں
تمہارے؟ تم نے اپنے بچے میں تصویریں رکھی ہوئی تھیں۔“

”اب ایک بیٹی بھی ہے۔“ میں نے کہا، میں کچھ نموس ہو رہا تھا کہ میں اس مائی کے
ساتھ کس قسم کی گفتگو کروں اور وہاں میں خوش بھی ہوا کہ میرا سفر زندہ ہو رہا تھا..... اور
آپ کے بیٹوں کا کیا حال ہے؟“

”وہ بھی راضی بازی ہیں خیر سے..... مال، دولت، عزت سب کچھ ان کے پاس
ہے۔ اب ذرا کسٹم والے زیادہ تنگ کرتے ہیں لیکن وہ نکل جاتے ہیں۔ ایران میں تو مولود
خینی آگیا تو وہاں تو کاروبار بند ہو گیا ہے.....“

”آپ پاکستان کیسے آئیں؟“

”بس پتر..... حج کر لئے، کھاکی لیا، اب بیٹے کام نہیں کرنے دیتے۔ انہوں نے
بغداد سے جہاز پر بٹھا دیا اور جہازوں پر تو میری عمر گزری ہے۔ بھی لوگ بڑا دیدار کرتے
ہیں میرا..... کراچی سے لاہور کا جہاز لیا..... یہاں لاہور میں میری ایک بہن ہوا کرتی
تھی خالد زاد..... میں نے سوچا ایک دودن اُس کے پاس رہوں..... تو پتر میں وہاں
پہنچی شاد باغ کے پاس تو پتہ چلا کہ بہن کو مرے ہوئے تو پانچ سال ہو چکے۔ بچے اس کے
مجھے پہچانتے نہیں تھے اور نہ جانتے تھے کہ میں کون ہوں۔ ان کا بھی قصور نہیں ہے میری

ہوئے مجھے وطن سے نکلے ہوئے کبھی دوبارہ آئی نہیں۔ پیسے جو میرے پاس تھے..... شاد باغ
سے نکلی ہوں اور جانے لگی رہوے اسٹیشن پشاور کی گاڑی پکڑنے کے لئے تو ایک دم تہارا
خیال آگیا کہ تم بھی لاہور میں رہتے ہو۔ میں نے سوچا پتہ کرتی جاؤں کہ پتر ٹھیک ہے خیریت
سے ہے..... کہتے سال ہو گئے جب تم تہران آئے تھے؟“

”تقریباً دس سال ہو گئے۔“

”بزرگ ہو گئے ہو۔“ وہ پھر مسکرائی: ”تب تو وہاں داہ بال سے تھے، نو جوان۔“

”ہاں جی..... دس سال بہت ہوتے ہیں۔ تب بھی میں ہاں تو نہیں تھا لیکن.....“

”تم لئے تھے دشمن؟“ اور پھر اس سے اگلے روز وہ بٹول فروخت ہو گیا اور وہاں پر
نئی مارکیٹ تعمیر ہوئی تھی جواب ہو چکی ہے.....“

”ہاں اور اس خندق کے کمرے ایسے تھے کہ دیواروں پر کھٹکوں کا وال پیپر تھا جو
چلتا تھا.....“

مائی پھرے باز ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ میں نے چائے کا پوچھا تو اس نے
انکار کر دیا کھانے کے لئے کہا تو کہنے لگی کہ کھا کے آئی ہوں..... میں نے کہا آئیے گھر چلیں
ادلم ازم ایک دو روز تو میرے پاس رہیں لیکن وہ مسکراتی رہیں اور انکار میں سر
ہلاتی رہیں.....

”آپ بچی پکی پاکستان آگئی ہیں یا واپس جا بیٹھی گی؟“ میں نے پوچھا۔

”میں تہر آ ہی گئی ہوں..... آئی بھی ہوں اور پوترے نے بھی بھیج دیا ہے.....“

”پشاور میں آپ کا گھر تو ہو گا؟“

”وہاں گھر ہوتا تو دودن چھوڑتے....“ وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی: ”وطن چھوڑا
تو بیس سال گزر گئے اب جاؤں گی اپنے محلے۔ وہاں کوئی مکان کرائے پرے کر باقی زندگی
گزار دوں گی۔“

”آپ کا کوئی رشتہ دار یا عزیز تو ہوگا وہاں؟“

”نہ نہ کوئی نہیں.... بس میرے دونوں بیٹے ہیں احد وہ عراق میں ہیں....“

”آپ وہاں بالکل اکیلی رہیں گی؟“ میں نے حیران ہو کر کہا۔

”پتر میں ساری عمر اکیلی ہی رہی ہوں.... اب نہیں۔ چار سال خاوند زندہ رہا اور اب میں اس اور میرے بیٹے نسل گئے.... استنبول، جرجی، تہران، بغداد، دمشق، میں نے بیس برس ان شہروں میں پھیرے لگاتے گزار دیئے۔ سارے سفارت خانوں والے میرا احترام کرتے تھے اور ہم ان کو ان کا حق جو دیتے تھے۔ ایئر پورٹوں پر مجال ہے کسی کسٹم دالے نے مائی کے سامان کو ہاتھ لگایا ہو۔“

”ظاہر ہے اب آپ کی عمر نہیں رہی یوں بین الاقوامی کاروبار کرنے کی.... اس لئے وطن واپس آ گئی ہیں۔“

”نہیں۔“ مائی نے سر ہلایا۔ ”نہیں بات یہ نہیں ہے۔“

”سفر کرنے کے لئے ہمت چاہیے۔ مجھ میں کم ہو گئی ہے تو آپ بھی....“

”ہیں ابھی بالکل ٹھیک ہوں پتر.... پانچ چھ بڑے سوٹ کیس دے دو میں اب

بھی اسی طرح سفر کر سکتی ہوں اور سامان بیچ سکتی ہوں.... تہران سے لے کر استنبول تک کون نہیں جانتا کہ مائی پھیرے باز نے آج تک کسی کے ساتھ دھوکا نہیں کیا۔ جو مال کسی نے مانگا لا کر دیا اور مناسب قیمت پر....“

”آپ بے شک بڑی باہمت ہیں.... تو پھر آپ نے کاروبار کیوں چھوڑ دیا؟“

”تم میرے ایک سوال کا جواب دو پتر.... ایک ملک سے مال خریدنا اور پھر

دوسرے ملک میں جا کر فروخت کر دینا.... کوئی بُری بات ہے؟“

”نہیں.... شاید نہیں۔“

”میں تو کسٹم والوں کو ان کا حق دیتی تھی۔ دیرا بنوانا ہوتا تو سفارت خانوں میں بھی

لوگ میرا خیال رکھتے تھے۔ میں سب کے کام کر دالیتی تھی.... لیکن پتر چاہے کیا ہوا میرے ساتھ....؟ یہاں پہنچ کر مائی نے عینک اتار دی اور آنسوؤں سے بھری ہوئی بوڑھی آنکھوں کو صاف کیا۔ ”میرا ایک پوتا ہے ماشاء اللہ چودہ سال کا ہو گیا ہے.... وہ ایک دن کہنے لگا دادا کا جان آپ سسٹنگ کیوں کرتی ہیں؟ میں تو کانپ گئی۔ میں نے اُسے سمجھایا لیکن وہ نہیں سمجھا کہنا کہ سب لوگ کہتے ہیں کہ تمہارا باپ اور تمہاری دادی سسٹنگ ہیں.... کسٹم والا کو رشوت دے کر مال نکال لاتے ہو.... میں نے بہت کہا کہ یہ کاروبار ہے کسی کا حق نہیں مارنے، دھوکا نہیں دیتے۔ پر وہ نہ مانا.... کہنے لگا دادی اماں آپ کو شرم آتی چاہیے.... پتر مجھے کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا کہ یہ سسٹنگ ہے پر اس روز میرے پوتے نے مجھے شرمندہ کر دیا.... میں نے بیٹوں سے بات کی پر وہ نہیں مانے.... میں نے جہاز پکڑا اور وطن واپس آ گئی۔ یہاں سے میں اپنے پوتے کو خط لکھوں گی کہ تمہاری دادی جان اب سسٹنگ نہیں کرتیں.... ٹھیک کیا نامیں نے؟“

”ہاں مائی جی....“

”اب کبھی باہر جانا ہو تو مجھ سے ایڈریس لے کر جانا ہو ملکوں اور خندقوں کے.... مائی پھر سے باز کو کون نہیں جانتا ادھر کے ملکوں میں....“

اس کے ہاتھوں میں رستہ تھا۔ اُسے ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتا تھا اور اس کا جسم زندگی کی مشقت کرتے کرتے کھوکھلا ہو چکا تھا۔ اسے اب آرام کرنا تھا پشاور کے کسی محلے میں بالکل تنہا.... وہ اٹھی اور لرزاتے ہاتھوں سے میرے سر پر پیار دیا اولاد بھی جتنی ہوئی چلی گئی۔ مجھے یقین ہے کہ مائی پھر سے باز سے کم از کم یہ ملاقات آخری تھی۔

”گائے گھوڑا“ بے کار ہے جی!“

فتح خان آئے تو بہت خوش تھے۔

”مجھے گائے گھوڑا مل گیا ہے۔۔۔“ وہ سرگوشی سے بولے اور مسرت سے مغلوب ہو کر بولے۔۔۔

”آپ کا مطلب ہے کہ آپ کو گائے اور گھوڑا مل گیا ہے۔ کیا آپ کا گائے اور گھوڑا گم گئے تھے؟“

”نہیں نہیں۔۔۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے آج بہت بڑے کے بعد اور بڑی تلاش کے بعد گائے گھوڑا مل گیا ہے۔“

”مبارک ہو۔“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ ایک ایک کر کے ملے ہیں یا دونوں ملے مل گئے ہیں؟

”ایک نہیں تین مل گئے ہیں۔“ وہ مسکراتے پلے جا رہے تھے۔

”گائے اور گھوڑا دو ہو سکتے ہیں تین کیسے ہو گئے؟“

”آہا۔“ انہوں نے میرے کندھے پر ایک دھپ رسید کی۔ اب سمجھا۔ آپ کہہ رہے ہیں۔ حضرت گائے گھوڑا ایک بہت ہی نادر اور پرانے سکے کو کہتے ہیں۔ جن کے ایک جانب گائے بنی ہوتی ہے اور دوسری جانب گھوڑا ہوتا ہے۔“

فتح خان کے میں بہت بیزار تھا۔ بہت نفیس شخص ہیں، دوست ہیں لیکن ہر وقت کوئی کوئی اوٹ پٹانگ شوق پالے رکھتے ہیں اور اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اس شوق کی

درجے بیت جلد کر دیتی ہو جائیں گے۔ ان دنوں موصوف کا رخ سکوں کی طرف ہے۔۔۔۔۔

تقریباً ہر دوسرے دن تشریف لاتے ہیں اور ایک جیب میں سے چند سکے نکال کر میز پر رکھیں گے اور دوسری جیب میں سے ایک عدد و محدب عدد یعنی میگنی فائننگ گلاس نکال کر کہیں گے۔ ”یو تھو ذرا چیک کرو۔۔۔۔ ہندو شاہی ہے۔“

”کیا شاہی ہے؟“ میں حیران ہو کر پوچھوں گا۔

”ہندو شاہی سکتے ہیں۔۔۔۔ بڑا نوالہ کے قریب ایک دوست ہیں۔ ان کی نانی جان فوت ہوئی تو ان کے لئے قبر کھودتے ہوئے ایک گھوڑا نکلا جس میں یہ سکے تھے۔ میرا دوست بھی سکوں کا شوقین ہے۔ اس نے نانی جان کو بعد میں دفن کیا پہلے سکے محفوظ کر لئے۔۔۔۔۔ یہ وہی سکے ہیں۔“

فتح خان اکثر بازار صرافہ میں پائے جاتے ہیں، لاہور کے بڑے ٹولوں میں پیٹری کرافٹ شاہیں پر دیکھے جاتے ہیں اور ہر وقت ان کی ایک جیب میں پرانے سکے ہوتے ہیں اور دوسری میں سکے خریدنے کے لئے نئے اور آج کے سکے۔۔۔۔۔ انہوں نے بتایا ہے کہ اس ملک میں سکوں کے بڑے بڑے ماہرین ہیں جو سکے کو ایک نظر دیکھ کر نہ صرف اس کا عہد بلکہ اس کی طمسال کا نام تک بتا دیتے ہیں۔ بقول ان کے سب سے زیادہ قیمتی ان بادشاہوں کے عہد کے سکے ہیں جو بن کھلے مر جھا گئے۔ یعنی ادھر تخت پر بیٹھے ادھر

آہ دیئے گئے یا مار دیئے گئے۔ ایسے بادشاہوں کی تمسال نے سکے ڈھالے تو ادھر بادشاہ سلامت کی ٹرانسفر ہو گئی۔ سکے جمع کرنے والوں کی ایک کوڈ آف اینٹیکس ہوتی ہے بقیہ نوادرات کی طرح اس میں دھوکے کا امکان کم ہوتا ہے۔ کیونکہ سکے جمع کرنے والا صاف صاف بتا دے گا کہ جناب یہ نکال سکتے ہیں۔ دو سو روپے کا لیا تھا اور آپ سے پانچ سو لوں گا۔

سب سے زیادہ سکے ظاہر ہے مغلیہ دور کے ہیں اور اتنے زیادہ پائے جاتے

ہیں کہ سکرانج الوقت لگتے ہیں۔

فتح خان کے ایک دوست ہیں جنہیں ہم مبسین کہہ سکتے ہیں۔ مبسین اسلام آباد میں کوئی کام کرتے ہیں۔ ہر ایک انڈیا پر بائی ائیر لاہور آتے ہیں۔ یہاں کی سکرانج میں گھومتے ہیں۔ دو چار سکے خریدے اور انہیں وہیں بیچ دیا اور کرائے کے مکان پر دو ہزار منافع کا کر پلے جاتے ہیں۔ اپنا حراج پتھر بھی یہی کام کیا کرتا تھا اب ہاتھ کس حال میں ہے۔ سکے جمع کرنے والوں میں ایک اور خوبی ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ان میں ذات پات اور سماجی اور پنج پنج کا بالکل اثر نہیں ہوتا۔ سکے جن کو نے والا چاہے کلک پہ جا ہے جنرل ہے... سر جوئے بیٹھے ہیں اور گائے گھوڑا لگائے گھوڑا کر رہے ہیں۔ فتح خان کا کہنا ہے کہ لاہور میں چند ایسے افراد ہیں جن کے پاس دنیا کے بہترین سکے ہیں اور ان کی تصاویر سکوں کی بین الاقوامی فہرستوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اگر کسی سکے کی تصویر کسی فہرست میں ہے تو اس کی قیمت بہت لگتی ہے۔

فتح خان صرف سکوں کے شوقین نہیں ہیں بلکہ پلانے طرف، گندھارا جیسے لوٹے لٹے مرا حیاں، ٹیکوں کے غلاف، چاندی کے زیور وغیرہ میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ بہت سال پہلے ایک روز میرے ہاں آئے اور کوٹ کی جیب میں سے ایک پتھر سا نکال کر میری میز کی گلاس ٹاپ پر زور سے رکھ کر بولے..... "لو جی پونے دو ہزار سال پرانا ہے۔" فتح خان صاحب کی عادت ہے کہ ہر شے کو بڑے زور سے آپ کے سامنے رکھتے ہیں تاکہ آواز سے آپ ہوشیار ہو جائیں..... میں نے دیکھا کہ مہاتما بدھ کا ایک چھوٹا سا مجسمہ ہے لیکن مہاتما کاناک نقشہ کچھ سکندر اعظم سے مل رہا ہے اور یوں بھی ذرا ظریفانہ سی سکراٹش لگے ہوئے ہے۔

یہ ٹھیک نہیں لگتا۔ میں نے کہا۔

"سو فیصد ٹھیک ہے جناب عالی! میرے ہنر کی کو دیر کے ایک پتھان نے دیا

تھا میں سرنا دون کا اگر غلط ہو گا۔"

اس مجھے کو عجائب گھر والوں سے چیک کرایا گیا۔ معلوم ہوا کہ مہاتما بدھ کا ہاتھ تو ٹھیک

ہے یعنی پونے دو ہزار سال پرانا ہے لیکن اس کا سر صرف بارہ برس پہلے کا ہے۔

بے کار ہے یا؟ فتح خان دایوس ہو کر بولے: "بے کار ہے۔" ان کا تکیہ کلام ہے اس

جملی مہاتما بدھ نے ان کی دلچسپیوں کا رخ گندھارا آرٹ کی طرف موڑ دیا۔ چونکہ مجھے بھی اس موضوع

سے خاصی دلچسپی ہے۔ اس لئے فتح خان ہر دوسرے روز میرے ہاں چلے آ رہے ہیں اور اگر

نہایت مفید انداز میں کہیں گے۔ ایک سر مل گیا ہے بہت سستا۔

کس کا سر؟ میں پوچھوں گا۔

"مہاتما بدھ کا اور کس کا؟" یہ کہتے ہوئے وہ نہایت رازداری سے جیب میں سے چوکنے کا

بنا ہوا ایک گولہ سا سامنے رکھ دیں گے۔

"یہ بت ہے تو اس کی ناک اور کان اور آنکھیں وغیرہ کہاں ہیں؟"

"بس وہ نہیں ہیں باقی بالکل مکمل اور اصلی حالت میں ہے..... ایک دوست نے تحفے

میں دیا ہے۔" ایک روز شدید گرمی میں تشریف لائے اور پادر لپیٹ کر آکے جیسے برف پڑ

رہی ہو۔

"کیسی ہے؟"

"مکون؟"

"یہ پادر۔ رنجیت سنگھ کے زمانے کی ہے۔ ایک دوست سے کچھ رقم یعنی تھی وہ

آٹھ سو دس گیلے کہ ہزاروں بلکہ لاکھوں کی ہے سنبھال کر رکھو برٹش میوزیم والے خرید لیں

گے۔"

میں نے پادر کو فور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ مری میں سینر کے آخر میں جب سیل بجتی ہے

تو میری بچا کی روپے میں بھی ڈیزائن مل جاتا ہے۔

”چڑیا گھر میں رہائش کا مسئلہ“

اکثر اوقات جب آپ کا کوئی عزیز دوست اپنے بچوں کے ہمراہ یا ایک چڑیا گھر دیکھنے کے بعد واپس آتا ہے تو آپ پوچھتے ہیں کہ کیوں جناب وہاں کوئی پنجرہ پسند نہیں آیا..... یا چڑیا گھر کی انتظامیہ کو آپ کی آمد کی خبر نہیں ہو سکی جو واپس لوٹ آئے۔ اس پر عزیز دوست عام طور پر مسکراتا ہے اور کہتا ہے کہ نہیں پنجرہ تو خالی تھا لیکن اس پر آجناب کے نام کی تختی آویزاں تھی، آپ ہو آئیے..... لیکن مستقبل میں شاید اس قسم کی گفتگو نہ ہو سکے۔ بہت ممکن ہے کہ آپ کے اس سوال کے جواب میں کہ کیوں جناب وہاں کوئی پنجرہ پسند آیا؟ عزیز از جان دوست نہایت مناسبت سے کہے کہ جی الحمد للہ ایک نہایت ہی نفیس قسم کا آرام دہ پنجرہ مل گیا ہے۔ بس یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے چڑیا گھر میں جگہ مل گئی ورنہ آپ جانتے ہیں کہ ان دنوں لوگ پنجروں کی تلاش میں دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ مجھے تو جناب آپ مبارک باد دیں۔ وہاں فلتس سسٹم کا بھی انتظام ہے..... اور آپ جرنل بکر پوچھیں گے کہ لے عزیز از جان دوست کیا آپ نے پنجرہ حاصل کرنے کے لئے سفارش کر دئی تھی یا چڑیا گھر انتظامیہ میں تنہا را کوئی قریبی عزیز گھوڑوں کا ڈاکٹر لگا ہوا ہے۔ کیونکہ ان دنوں چڑیا گھر میں ایک ذاتی پنجرہ حاصل کرنا تو جان جو کھوں کا کام ہے..... اس پر عزیز از جان دوست آپ کو بتاتا ہے کہ بھائی میرے بھائی پانی کا انتظام ہے۔ صبح سویرے ناشتہ پنجرے میں ہی مل جاتا ہے۔ دوپہر کا ٹھنڈا گوشت جو بہت اعلیٰ قسم کا ہوتا ہے کیونکہ شیر کے لئے بھی اسی گوشت سے پلنگ تیار ہوتا ہے اور ایک مرتبہ جب گوشت کی کواچی اچھی نہیں تھی تو شیر نے اسے لانے والے دیر تو بچکے لیا تھا۔ علاوہ ان دنوں بھروسہ لوگ جو ٹانیاں اور پھل وغیرہ میرے پنجرے میں پھینکتے ہیں وہ بونس ہے..... اور تنخواہ

بھی مقرر ہے۔

آپ اس وقت یقیناً یہ سوچ رہے ہوں گے کہ میں خواہ مخواہ ادھر ادھر کی ہانک دہاؤں، یہاں مستقبل میں انسان چڑیا گھر کا مکین کیسے ہو جائے گا تو جناب آپ کی خدمت میں عرض ہے کہ امریکہ میں تو ایسا ہو رہا ہے۔ وہاں ایک چڑیا گھر میں دیگر دندوں اور پرندوں کے شانہ بہ شانہ ایک عدد حضرت انسان بھی پنجرے میں رکھے ہوئے ہیں اور اپنی من مرنی سے رکھے ہوئے ہیں۔ کیونکہ انہیں وہاں رہنے کی باقاعدہ تنخواہ ملتی ہے۔ بجلی پانی خوراک وغیرہ مفت میں..... وہ بڑے آرام سے صبح اٹھتے ہیں سب کے سامنے ناشتہ کرتے ہیں، سب کے سامنے شکر کرتے ہیں اور نہاتے ہیں اور ان کی یہ حرکتیں دیکھ کر ہلکے بے حد خوش ہوتی ہے اور انہیں ٹانیاں اور پھل کھلاتی ہے۔ چنانچہ اگر امریکہ میں ایسا ہو رہا ہے تو پاکستان میں بھی ایسا ہو جائے گا۔ کیونکہ ادھر ڈیو گیمز کا رواج چلتا ہے تو ادھر بھی کرڈروں مدلوں کی مشینیں اپورٹ ہو جاتی ہیں۔ ادھر لوگ ایک دوسرے سے ہتے ہوئے ہائے کرتے ہیں تو ہم اپنا سلام بھول کر ہائے بگڑے ہائے کرنے لگتے ہیں۔ اگلے یہ بعد از قیاس نہیں کہ مستقبل میں ہمارے چڑیا گھروں میں حضرت انسان بھی دیکھنے کو ملنے لگیں۔ البتہ ایک نجات ہوگی اور وہ یہ کہ یورپ اور امریکہ وغیرہ میں چونکہ ہر انسان بے حد پراٹھوٹ قسم کی زندگی گزارتا ہے۔ ہلکے میں صرف کام کرتا ہے، بس پر چڑھتا ہے خریداری کرتا ہے اور باقی سارے کام لوگوں سے اوچھل ہو کر اپنے گھر کے اندر کرتا ہے اور اس لئے امریکہ کے چڑیا گھر میں رکھا ہوا انسان لوگوں کی دلچسپی کا باعث بنا ہوا ہے کہ وہ سب کے سامنے وہ کام کرتا ہے جو بے حد پراٹھوٹ ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص خود کو شکر کرتا ہے لیکن اس نے شاید کبھی کسی اور کو شکر کرتے نہیں دیکھا اخبار پڑھتے نہیں دیکھا۔

یہ سب کچھ تو ہوا امریکہ میں، اب پاکستان میں معاملہ بالکل الٹ ہے..... وہ دیکھئے اس کھڑکی میں جو شخص ٹھہرتا ہے اس نے پھلے دو گھنٹے میں کوئی کام نہیں کیا، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہے..... ہر گھنٹہ ہاتھ ہے کہ آپ کو کیسے معلوم ہے کہ اس نے پھلے دو گھنٹے میں کوئی کام نہیں کیا۔ جواب ملتا

حیثیت سے نہیں بلکہ ایک پورے موسم پوری تہذیب کی حیثیت سے زندہ رہتا ہے۔ میں نے اپنے شہر لاہور سے وعدہ کیا کہ میں دوبارہ آؤں گا۔ لیکن جونہی میں کھلی فضاؤں میں پہنچا، مال روڈ اور جگرگ دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ تو یہ تو بے پرانا شہر تو فرارڈسٹ بن ہے، وہاں گندگی ہے کبھی ناپاکی، لوگ بدتمیز ہیں، مکھیاں بھنبھاتی ہیں۔ وہاں مجھ ایسے تہذیب یافتہ ادیب اور دانشور کا کیا کام..... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں کبھی بھی پرانے شہر کا رخ کروں؟

“عید کرسمس کے نزدیک آرہی ہے“

اب کے عید عجیب رنگ میں گزری ہے۔

یہ بہت زیادہ دنوں کی بات نہیں ہے جب عید کچھ اور تھی یہ نہیں تھی جو اب ہے اور میں فیصلہ نہیں کر پایا کہ ان دنوں میں سے کونسی عید اصلی ہے۔ یہ والی جو پچھلے دنوں گزری یا وہ حالی جو بہت زیادہ دن تو نہیں ہوئے جب گزری تھی۔

ہوا یہ کہ انیسویں روزے کی افطاری سے فارغ ہوتے ہی ہم لوگ بلدی سے اپنے گھر کی چھت پر پہنچے..... خیال تھا کہ چاند دیکھیں گے۔ میں نے بچوں کو بتایا کہ دیکھو بچو! عید کا آدھا نطف تو عید کا چاند دیکھنے میں ہوتا ہے اور شاید انہیں یاد بھی تھا کہ ادھر پرانے مکان میں ہم چھت پر پہنچ کر کیا اوجھ مچاتے تھے..... کچھ پٹاخوں کا انتظام ہوتا تھا۔ کچھ برتن سا تھلائے جاتے تھے جو بھانے کے کام آتے تھے..... آپ اپنے آس پاس دیکھتے تھے تو تمام چھتیں بھری ہوتی تھیں۔ شب کی نیم سیاہی میں کچھ چہرے نظر آتے تھے کچھ روپوش رہتے تھے۔ بشرکین خالی ہوتی تھیں۔ گھرے مکانوں کے خالی ہونے تھے اور غفلت چھتوں پر ہوتی تھی اور سب آسمان کو دیکھتے تھے، اگر چاند نظر نہیں آیا تو منہ لٹکائے نیچے آگئے اور اگر نظر آگیا تو پھر سارا شہر جاگ اٹھتا تھا پٹاخے پھٹا رہے ہیں اور بڑوں کو بولاروں کی طرح پٹا جاتا..... جو بچے چاند نہیں دیکھ پائے وہ غصے سے ہلچل رہے ہیں کہ کدھر ہے اور کس طرف ہے۔ کس مٹی کے پاس ہے اور کون سے بڑے کے عین اوپر ہے..... جو نہیں دیکھ سکے وہ بھی جھوٹ موٹ اس مہکتی ہوئی مسرت میں شامل ہو رہے ہیں کہ ان نظر آگیا۔ وہی اُس چمکتے ستارے کے عین نیچے..... ہاں ہاں نظر آگیا۔ لیکن اب پتہ

نہیں کہاں گیا۔ چاند دیکھتے ہی عید مبارک کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔۔۔۔۔ جب آپ کی گلی گزرتی تھی تو چھتیں خالی ہوتیں اور پھر نیچے آکر گرمی کی تیاریاں شروع ہو جاتیں۔۔۔۔۔ وہی جو عید کی تیاریاں ہوتی ہیں سویاں، نئے کپڑے، چوڑیاں، مہندی۔۔۔۔۔ اور ہاں مہندی جسے کوئی کرنا نہ لگا اعلیٰ بہت روز پہلے شروع ہو جاتا۔ ہر محلے یا گاؤں میں کوئی لڑکی، کوئی میزبان ایسی ہوتی جو مہندی لگانے میں یکتا ہوتی، بیل بوٹے بنانے میں مہارت رکھتی اور سب لوگ اس کے گھر کے پھیرے لگاتے کہ وہ سب سے پہلے انہی کے گھرانے اور لڑکوں کے ہاتھ بھرتے۔۔۔۔۔ یہ سطرین بکھتے بکھتے مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں کوئی بہت ہی غریب اور خستہ حال مسوے کے کاغذات آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اس عید کو گزرے بہت زیادہ دن نہیں ہوئے۔

اور اس عید کی شب کو ہم سب اپنے گھر کی چھت پر پہنچے۔۔۔۔۔ ہمارے پاس پٹاٹے اور برتن نو نہ تھے لیکن ہم شور مچانے اور ایک پڑوسرت ہنگامہ کھڑا کرنے کے لئے اُپر گئے تھے۔۔۔۔۔

اپنی چھت پر کھڑے ہو کر ہم آسمان دیکھنے لگے۔۔۔۔۔ ایک چمکیلا ستارہ تھا اور اس کے علاوہ وہاں فی الحال کچھ نہ تھا۔۔۔۔۔ اور تب مجھ پر صدے اور خوف کا لہر اتر جس کی وجہ سے میں یہ کالم لکھ رہا ہوں۔۔۔۔۔

میں نے دیکھا کہ ہمارے علاقے کی تمام چھتیں بالکل خالی تھیں۔۔۔۔۔ جی ہاں اس پاس کے سیکڑوں گھروں میں سے صرف ہمارا گھر ایسا تھا جہاں کے کین چاند دیکھنے کے لئے چھت پر آئے تھے مگر نہ دیگر تمام چھتیں ویران پڑی تھیں۔ مجھے اپنے آپ پر کچھ شبہ سا ہوا کہ شاید آج انیسواں روزہ نہ تھا اور ہم لوگ غلط شام میں اوپر آئے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہی شام تھی جب شہر لاہور کی چھتیں آباد ہوتی تھیں اور تہقوں کی دہلی دہلی آوازیں گونجن کی طرح اس پاس پر طاری کرتی تھیں۔۔۔۔۔ ہم اپنی چھت پر کھڑے کچھ کچھ محرم محسوس کرنے لگے۔۔۔۔۔

یہاں کیا کر رہے ہیں! کیا ہم بے حد تک درد ہیں جو اپنی آنکھوں سے چاند دیکھنا چاہتے ہیں! کیا چاند دیکھنا اور اس کا خواہش کرنا متروک ہو چکا! بلکہ یوں بھی ہوا کہ اس پاس کے کسی گھر کی کوئی لڑکی کھلی کسی نے جھانکا کہ یہ لوگ جو چھت پر کھڑے ہیں تو پاگل ہیں، کیا کر رہے ہیں۔۔۔۔۔؟

چاند دکھائی نہ دیا اور ہم شرمندہ ہو کر نیچے آگئے کہ کیا بتو قریب ہے۔ جب ٹیلیوژن پر اعلان ہو جائے گا تو پھر ان پڑھوں کی طرح چھت پر جا کر اپنی آنکھیں خراب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔۔۔ اور جناب یہی ہوا۔۔۔۔۔ ٹیلی ویژن پر ساڑھے سات بجے کی خبروں کا آغاز ہوا۔۔۔۔۔ اور شاہ سرفراز بھی تھی کہ خواتین و حضرات دوست ہلال کیٹی نے اعلان کیا ہے کہ پاکستان میں عید الفطر کا چاند نظر آگیا ہے اور کل عید ہوگی۔۔۔۔۔ لیجئے اتنی سی بات تھی۔۔۔۔۔ بات تو اتنی سی تھی لیکن میں کچھ بھگ گیا۔۔۔۔۔ ہم اتنے مشکیل کیوں ہوتے جارہے ہیں۔۔۔۔۔؟

رات کے کھانے کے بعد شروع ہو گیا کہ جناب باہر چلنا ہے۔۔۔۔۔ باہر چلنا ہے؟ میں نے دریافت کیا۔۔۔۔۔ نجران آج عید رات ہے سارا لاہور جاگے گا اور ہم بھی جاگیں گے۔۔۔۔۔ چنانچہ ہم بھی باہر گئے اور واقعی سارا لاہور جاگ رہا تھا بلکہ کچھ زیادہ ہی جاگ رہا تھا۔ برقی انریٹ کے اس پاس ٹریفک پولیس کے انتظامات اتنے دیتے تھے اور کارول اور وگینوں کی قطاریوں رنگ رہی تھیں کہ تنگ ہوا کہ ہم تو میکیکو میں ہیں اور فٹ بال کے ورلڈ کپ میں شرکت کے لئے آئے ہیں۔۔۔۔۔ البتہ ایک فرق تھا کہ یہاں خوش لباس نوجوانوں کے غول کے غول گھومتے تھے۔ سبھو کے، نذیرے، مصوم اور ایدو پنجر کی تلاش میں کچھ دیکھنے کچھ دکھانے۔۔۔۔۔ اور اتنے زیادہ تھے کہ انہیں دیکھ دیکھ کر میں اکتا گیا۔ یہ بیٹروں کی طرح گھومتے تھے۔ لوگ انہیں جھپٹا جھپٹتے ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہے یہ جھپٹیں تھیں۔۔۔۔۔ اس میں ان کا کوئی قصہ لیا جڑا قصہ نہیں ہے۔ یہ نوجوان ہیں۔ ان میں سے بیشتر گلبرگ ہیں۔ ہائٹس پذیر نہیں ہیں بلکہ ٹکڑے گھول اور غلیظ مٹوں میں سے نکل کر آئے ہیں۔ خوب خوش لباس ہو کر آئے ہیں۔ ان

نوجوانوں کی کوئی ڈانگش نہیں۔ ان بے چاروں کو کچھ پتہ نہیں کہ انہوں نے کہا جانا ہے۔ یہ صرف بھیڑوں کی طرح گھومتے ہیں اور ان کی آنکھیں گھومتی ہیں..... یہ لوگ مجھے کچھ سے لگے..... ان کا علان ہونا چاہیے..... اور یاد ہے کہ عیدرات کی یہ گھاٹی اندرون ابھی شروع ہوئی ہے اور ابھی صرف بارہ بجے ہیں اور یہ صبح تک جاری ہے۔ میرے ایک ڈاکٹر دوست جو نماز بہت کم قضا کرتے ہیں عید کی نماز نہیں پڑھتے کیونکہ صبح پانچ بجے تک وہ شہر لاہور کی عیدرات میں گھومتے رہے۔

اور یہ سب کچھ صرف برٹی مارکٹ میں ہی نہ تھا۔ مال پرنتی مارکیٹ بھی ایک بنام رکھتا تھا۔ انارکلی کی جانب جانے کے لئے شرمین ٹینک دیکھو اور ہندوستان نے بھی صرف ٹولہ ہی میں یہ دیکھا تھا کہ ان کے ٹینک انارکلی میں گھوم رہے ہیں اس لئے تم ادھر نہ جاؤ گے..... گلبرگ کی بین مارکیٹ میں بھی خوب رونق تھی..... اچھرے کے آس پاس بھی لوگوں کے ہجوم تھے اور فورٹریس سٹیڈیم میں تو کاروں کو رستہ نہ ملتا تھا۔

عید کی صبح کو حسب معمول نماز کے لئے خوب بھاگ دوڑ ہوئی..... کبھی یاد رہی میں دابے، سرور ٹوٹی جمائے ہوئے ان مسجدوں کی جانب بھاگ بھاگ جہاں ذرا دیر سے نماز ہوتی ہے..... ایک مقام پر دیکھا کہ لوگ جلدی جلدی کاریں کھڑکی کرتے ہیں اور توہاں پر پر رکھے ایک جانب چلے جاتے ہیں، ہم نے سوچا کہ بس یہاں ابھی نماز نہیں ہوئی اور ہم بھی اپنی کار سے اتر کر بھاگتے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے..... آگے جا کر معلوم ہوا کہ قبرستان ہے اور یہ لوگ تو نماز سے فارغ ہو کر ادھر آئے ہیں..... عید کے روز بہت کم لوگ گھروں سے نکلے۔

ایک تو گرمی کی شدت..... اور دوسرے عیدرات کا ہنگامہ..... لوگ دیر تک سوئے رہے..... اب عیدرات کی وجہ سے عید کا دن ویران ہوتا جا رہا ہے..... ہم کچھ گھر پر گھر ہوتے جا رہے ہیں۔ انگلستان اور یورپ میں بھی کمرسمس کی شام تو خوب شور مچاتا ہے

اور دیکھیں ہوتی ہیں اور کمرسمس کے دن شریکس ویران پڑی رہتی ہیں۔ جیسے کوئی دیو بھر گیا اور لوگ گیا ہو..... انگلستان میں پہلی کمرسمس کے موقع پر ہمارے ساتھ بہت بڑا ہوا..... میں ہوا کہ ہم سب کے رہے۔ کمرسمس ایوننگ کو خوب ہنگامہ ہوا اور کمرسمس ڈے کو رات شہر جہاں مارٹین کہیں سے ایک سوکھا ہوا سینڈویچ بھی نہ مل سکا جس کے ساتھ بیٹ کی آل بھاکتے..... پورا شہر ویران تھا..... اگلے روز ہم نے اپنے انگریز دوستوں کو خوب سن سن کہ دیکھو ہماری جو عید ہوتی ہے اس پر تو رونق ہوتی ہے..... کیا پتہ تھا کہ صرف چند ہی برسوں میں ہمارا بھی وہی حال ہونے کو ہے۔

پہلے عید کے روز دوست آتے تھے۔ رشتے دار آتے تھے اور اب..... صرف عید کا ڈھنگ آتے ہیں..... آپ ان عید کارڈوں کو کارنس پر بجاتے ہیں اور ان کے سامنے بیٹھ کر عید کے نعروں میں ڈوبے رہتے ہیں..... عید کارڈ بھی تو کمرسمس کارڈ کی ایک شکل ہے..... ہم بدلتی کمرسمس کے قریب ہو رہے ہیں اور شرتی عید سے دور ہو رہے ہیں.....

مجھے تو عید کارڈ کی بجائے انسان درکار ہیں..... اور عید کے اعلان کی بجائے چاند دیکھنا زیادہ پسند ہے..... اور آٹو میٹک کیمیا کی ٹھیلوں کی بجائے اصلی اور دیسی مہندی زیادہ پسند ہے۔

لیکن.....

میں نے عیدرات کا ہنگامہ پسند ہے اور بیٹی اپنے ہاتھوں پر مہندی لگا کر رنگ پڑھنے کا انتظار نہیں کر سکتی اسے ٹھیلوں کے بل بوتے زیادہ پسند ہیں..... اور چونکہ آٹو میٹک عید ان کے لئے ہیں میری عیدیں تو گزر چکیں..... اس لئے آئندہ وہی کچھ ہو گا جو انہیں پسند ہے..... میری پسند ناپسند کے دن اور عیدیں تو ختم ہوئیں۔

کی صابا جاری و ساری تھی۔ میری دوسری جیب میں پچاس روپے کا ایک نوٹ تھا (پٹرول بھی ختم ہو گیا کوہے) اور لیٹر میں درج شدہ اشیاء کی صورت بھی پچاس روپے کے اس بیٹ کے دائرہ اختیار میں نہیں آ رہی تھیں۔ دو لڑ بچک کے مالی جادو گروں کے لئے ایک چیلنج (تختہ دار) کم از کم ہر ماہ کی یکم تاریخ کو کینچن تان کر اپنا بیٹ بنا لیتا ہے اور پھر اسے کینچن ہوا اگلی یکم تک لے جاتا ہے چاہے اس کینچن تانی میں وہ فوت ہی ہو جائے۔ لیکن میرے جیسے لوگوں کو ان کا رزق قسطوں میں ملتا ہے۔ کبھی ناشر سے، کبھی ٹیلیوژن سے، اور کبھی اخبار سے۔ چنانچہ ہم ایک طے شدہ بیٹ شدہ زرگا بسر کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ رزق آجائے تو سر اٹھا کے چلتے ہیں نہ آئے تو ننگے پاؤں کے پتے ہیں۔ کیا میرے ساتھ اس سڑک پر دو ال دوسرے موٹر سائیکل سواروں اور کاموں والے عورتوں کی جیبوں میں بھی اس قسم کے لیٹریں۔ اور کیا وہ بھی اس وقت بھی سوچ رہے ہیں کہ صابن سا بانا چینی چینی، آٹا آٹا..... اگرچہ چہرہ پر تو اطمینان ہے۔ لیکن ان کے اندر بھی محدود ذرائع آمدن کے پھٹے ہوئے سائنس پھٹ پھٹ کر رہے ہیں..... کیا یہ بھی پٹرول پمپ پر جا کر صرف ایک لیٹر پٹرول کی فرمائش کرتے ہیں۔ اور پچھلے پڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ بھئی آج گاڑی سروس کے لئے دی ہے۔ اس لئے اتنا ہی کافی ہے۔ ٹیکسی فلو تو مستری لوگ نکال لیتے ہیں..... اور کیا ٹوٹنٹن مارکیٹ والا تھاٹا انہیں بھی یہی کہتا ہے کہ صاحب یہ پوری ران تول دوں، دیسی بکرا ہے، اور وہ کہتے ہیں۔ نہیں میں فی الحال نصف کلوسے دو، ان دنوں بچے کراچی گئے ہوئے ہیں..... لیکن موٹر سائیکل کب تک سروس ہوتے رہیں گے، اور بچے کب تک کراچی میں ہی رہیں گے..... بہر حال پچھلی رات تیز ہوا کے ساتھ بارش بھی ہوئی تھی۔ اس لئے آج جس کی بنی کے باوجود موسم بے حد خوشگوار ہو رہا تھا۔ تب میں نے آٹے اور دال کے بھاد کو الگ رکھا اور چہرے پر پھیلتی نم آلود ہوا کا لطف لیتے لگا۔

جناب باغ اور گورنمنٹ ہاؤس کے درمیان میں واقع سبزہ زار میں بے شمار لوگ جھکے ہوئے تھے۔ کچھ جھکے جھکے چل رہے تھے۔ کبھی کبھار ان میں سے کوئی سر اٹھا کر اوپر درختوں کی جانب دیکھتا

اور پھر جھک جاتا۔ جیسے کسی تالاب کے کنارے بے شمار نیلے مچھلیاں پکڑنے کے لئے جھکے ہوئے ہیں۔ ایک طرف مچھلی نگلنے کی خاطر سر اٹھائے اور پھر جھک لے۔ سکڑوں، موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں کی بریکیں گنتیں کہتے نہیں کیا ہو رہا ہے۔ اور پھر ان میں ایک آدھ رنگ کر ساری سے اترتا اور اس جھکے ہوئے گروہ میں شامل ہو جاتا۔ میں نے بھی بریک پر پاؤں رکھ دیا کہ ایک نیم لاہوریا ہونے کے ناطے میں بھی کسی ایسے مقام سے بے دھیان ہو کر نہیں گزر سکتا تھا جہاں کسی قسم کے مون میس، حادثے یا لڑائی مار کٹائی کا خفیف سا بھی امکان ہو۔

”کیوں صاحب کیا ہوا ہے؟“ میں نے ایک سکڑو والے سے دریافت کیا۔

”پبلک جامنوں کھارہی ہے جی؟ اس نے تپسی نکال کر جواب دیا۔

”جامنوں؟“

”رات کی تیز ہوائے جامنوں کے ان درختوں کو خوب جھوٹے دیئے جی..... وہاں گھاس پر ان کے ڈھیر گئے ہوئے ہیں جی..... بازار میں تو چاند پے کلو ہیں۔ اس نے سکڑا میٹڈر کھڑ کیا۔ اور پڑی بے آواز سے اپنا ستر ہانٹنے کے لئے جامنوں کھاتی پبلک میں شامل ہو گیا۔

کمال ہے۔ پبلک جامنوں کھارہی ہے..... کیا انہیں دنیا جہان کا اند کوئی ٹکڑ نہیں۔ کیا ان کے محدود ذرائع آمدن اور گورنمنٹ ہاؤس کے ذمہ دقت ان کے ذہنوں پر سوار نہیں رہتے۔ کیا ان میں سے کوئی عداوتوں کے چکر میں نہیں۔ کسی پولیس کس میں پھنس کر گواہیاں نہیں بجات رہا۔ انکم ٹیکس کے نوٹس وصول نہیں کرتا۔ کیا ان کی جیب میں خیر ریات زندگی کی فہرٹیں نہیں اور اتنی رقم ہے، جن سے وہ خریدی جا سکیں..... ان کو کیا انہیں زمین بھورت، مارشل لا و غیرہ سے کوئی سروکار نہیں۔ عجیب قسم کی پبلک ہے۔ جامنوں کھارہی بھاد آسے پرواہ ہی نہیں۔

میں نے اپنی فہرست جیب میں سے نکال کر اس پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ یہ ساری اشیاء صرف پچاس روپے کے ایک نوٹ میں سے..... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا..... میں نے موٹر سائیکل کھڑ کیا اور سبزہ زار میں کھڑا ٹکڑ پبلک کے ہمراہ زمین پر پڑے جامنوں اٹھا اٹھا کر کھانے لگا۔

میں سنبھال کر لے گیا تھا تاکہ کسی ڈسٹ بن میں ڈال دوں لیکن پوند سے شہر میں کوئی اس قسم کا ڈسٹ بن ملا ہی نہیں۔

پہلے دن تو نے اپنے آپ کو صفائی کے عذاب میں مبتلا رکھا اور دو تین دنوں کے بعد کھانا نہ بنایا لیکن اب میں بھی پاکستانی بن گیا ہوں۔ ولایت واپس پہنچ کر پھر صفائی پسند ہو گیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ بھائی میرے میں بھی ایک زمانے میں بے حد احمق ہوا کرتا تھا۔ سگریٹ کھانے کی عادت تھی۔ میں دباؤ دباؤ پھرتا تھا۔ کہ کہاں پھینکوں گا فڈ کے ٹکڑوں کو باقی ماندہ جاتا تھا۔ پھلوں کے چھلکے سنبھال سنبھال کر رکھتا تھا۔ بلکہ ایک مرتبہ خمر پوز سے کھاتے ہوئے ایک ہون کو لوگ مٹھا کہ پہوان جی یہ ذرا چھلکے..... اور پہوان نے جو مجھ سے کہا وہ میں تم سے لیے لیوں۔ اپنے ٹکڑوں کے قریب سے گزرتا تو متنی ہونے لگتی۔ راہ پہنچتے ہوئے کا فڈ کے ٹکڑے ادا پھلوں کے چھلکے اٹھا اٹھا کر نالیوں میں پھینکتا..... تو پھر تمہیں کیا ہوا؟ اس نے پوچھا..... مجھے..... بازار میں مجھے جھپٹی کھنے لگے اور پھر میں بھی پاکستانی ہو گیا۔ میں نے ہنس کر کہا۔

مجھے یاد ہے کہ یورپ کے ایک پارک میں جب میں نے اپنا سگریٹ گھاس پر پھینک دیا تو ایک بڑی دال اپنے جوڑوں کے دھڑول کے باوجود جھکیں اور سگریٹ کا ٹکڑا اٹھا کر اپنے پریس میں دبا لیا۔ سوئٹزرلینڈ کے ایک قصبے میں سے گزرتے ہوئے جب میں نے جیب سے چاکلیٹ کا ایک ٹکڑا نکال کر چاکلیٹ کھایا اور اس کا پیر پھینکنے کے لئے ادھر ادھر دیکھا تو اس چھوٹی سی شریک دور دور تک کوئی کا فڈ کوئی سگریٹ کا ٹکڑا نہ تھا۔ چنانچہ میں نے ادھر ادھر حرف گاہ دھڑا کرے شریک پر ہی پھینک دیا۔ کچھ دور آگے جا کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میرا پھینکا ہوا کا فڈ اس صاف شہری شریک پر ایک ناسور کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے بے حد شرمندگی ہوئی اور میں نے دالیں جا کر اُسے اٹھایا اور جیب میں رکھ لیا۔ اس قسم کے بے شمار ناسور ہماری سڑکوں، بازاروں اور گزرتے گاڑیوں پر کھرے ہوتے ہیں اور ہم سب انہیں دال جان بوجھ کر پھینکتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ صفائی نصیب ایمان ہے..... کیا ہم سب صرف آدمے مسلمان ہیں؟ یا ہم اب آدمے مسلمان بھی نہیں ہیں؟

”پینک جامنوں کھا رہی ہے“

میری ناتون تمام ہر صبح مسکراتے ہوئے اپنے گھر سے رخصت کرتی ہے۔ میں موٹر سائیکل کی نشست پر بیٹھا ہوں تو وہ چپکے سے میری جین کی جیب میں ایک خط ڈال دیتی ہے۔ جس پر ایسی باتیں لکھی ہوتی ہیں جن کا تذکرہ ہم بچوں کے سامنے نہیں کر سکتے۔ وہ میرے موٹر سائیکل کے شارٹ ہونے کا انتظار نہیں کرتی کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ یہ عرصہ مشین ابھی دجنوں لگیں کھانے کے بعد ہینکاڑ بھرے گی اور اتنی دیر تک دال کھڑے ہو کر وہ مسلسل مسکرا نہیں سکتی۔ چنانچہ وہ اندر چلی جاتی ہے۔ میں ہر کے کنارے تک پہنچتا ہوں اور موٹر سائیکل پارک کر کے پیروں کی جھکی ہوتی شانوں کے نیچے بیٹھ کر وہ خط نکالتا ہوں، اور پڑھتا ہوں..... دال ماش ۲ کلو..... کپڑے دھونے کا صابن ۲ کلو..... چینی گیلی نہ ہو ایک کلو..... انڈے گندے نہ ہوں نصف درجن..... اور اس لیٹر کے آخر میں ایک دوا ٹمیز کھا اس قسم کی بھی ہوتی ہیں، کہ آج حجامت ضرور کر دے گا۔ پڑھنے کے بعد دیکھ کر شکایت کی تھی۔ کہ آپ کے میاں بالکل مراثی لگ رہے تھے..... اور گھر کی رکھوالی کے لیے ایٹن نسل کا جو کتورا آپ کے دوست عنایت کر گئے تھے، اس کے کان ابھی تک کھڑے نہیں ہوئے۔ گھوڑا بپ تال جا کر معلوم کیئے کہ کان ابھی تک کھڑے کیوں نہیں ہوئے وغیرہ۔

آج صبح بھی میں حسب معمول روزانہ پوٹیر کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے بغیر سائنس کے موٹر سائیکل پر پھٹ پھٹ کرتا ہوا، مال روڈ پر جا رہا تھا اور جس طرح گاڑی کے سفر کے دوران پہیوں کا ایک ٹھوس دم دم کے ساتھ ساتھ آپ کے خیالات بھی سفر کرتے ہیں۔ اسی طرح انجن کی پھٹ پھٹ کے ساتھ ساتھ میرے ذہن میں بھی دال دال، چینی چینی، انڈے انڈے، گوشت گوشت

کیونکہ ٹٹی کی تھی۔ اسے کسی غریب کسان نے بنایا تھا۔ اگر نیشل کا بلو یا نیشل کو نیشل کے کسی آدمی نے بنائی ہوئی تب یہ پلتی..... اور اس کے بنانے والے کو تو لوگ آرٹسٹ ٹھانام دیا جاتا۔

ہم باہر آئے اور پہاڑی نانے پر چلنے لگے۔ سید پور کے آنتی گھر سے بہت ایکڑی بندی کی طرف جا رہی تھی۔ سامنے ایک سرخ چٹان کھڑی تھی، چٹان کا چہرہ چھلا ہوا تھا اور ایک مزدور کدال کی مدد سے اُسے دھادینے کی فکر میں تھا۔ داؤد نے بتایا کہ بھری بنانے کے لیے پہاڑ کے اس حصے کو ایک عرصے کا نا جا رہا ہے البتہ یہ شخص ہمیشہ سے یہاں نہیں تھا شاید اس کے باپ دادا بھی یہی کام کرتے ہوں۔ اس کے بچے بھی یہی کام کریں گے اور چٹان موجود رہے گی کم نہ ہوگی۔ میں نے پوچھا اگر یہ چٹان اٹالیہ میں ہوتی تو اس میں چھپے ہوئے محسوس کیا ہر نکال جاتا لیکن یہاں انی محسوس کی بھری بن رہی ہے۔

شام ہو رہی تھی بند پہاڑوں پر کدال کی آواز گونج رہی تھی۔ اب ہم پہاڑی نانے کے کنارے کنارے ایک تنگ راستے پر چل رہے تھے جو نیم تاریکی میں ایک واسے کی طرح دکھائی دے بھی رہا تھا اور پوشیدہ بھی تھا کہیں چھوٹی چھوٹی آبشاریں بھی تھیں جن کے پاس سے گزرنے تو پانی کا شور ہماری آوازوں پر حاوی ہو جاتا۔ "برگد کہاں ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"اس قسم کے برگد تک پہنچنے کے لئے صرف جسمانی قوت کام نہیں دیتی۔ اس کے بے لگن کی حرارت درکار ہے۔ تم چلتے آؤ اس نے کہا۔ داؤد باتیں کر رہا تھا۔ شفیق الرحمن کی تحریروں کا بڑا سفر ناموں کی، اپنی کہانیوں کی اور چلتا جا رہا تھا پہاڑوں کی اس نیم تاریک فضا میں اندی کے آبشار کی سرسراہٹ میں وہ اپنی سیاہ جیکٹ میں ملبوس چلتا جا رہا تھا..... تب مجھے وہ ایک انسان کی مانند وحشی جانور کی صورت دکھائی دینے لگا۔ اس کے چلنے، بھگنے اور مڑ کر دیکھنے میں ایک وحشت تھی میں نے شہر میں، بھوم میں، دفتر میں اور کافی ہاؤس میں بھی اس کے چہرے پر اس وحشت کے آثار دیکھے تھے اور ہمیشہ اس سے قدرے خوفزدہ رہا تھا۔ لیکن یوں گستاخا۔ جیسے آج وہ اپنے جنگل میں آگیا ہے اور آنا دہے..... وہ بڑے بڑے پتھروں کو پھلانگتا ہوا چلتا جا رہا تھا اور

تھکا ہوا ہونے لگے اور گھٹنے بجاتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔ میں تھک چکا تھا لیکن اپنے امیج کی خاطر جتنا جا رہا تھا۔ ایک سیاہ چٹان نے ہمارا راستہ روکا۔ چٹان کی ساخت جا پانی باغوں میں رکھی ہوئی ہوا لٹ چٹانوں کی طرح تھی۔ شاید کسی زمانے میں اسے جان بوجھ کر تراشا گیا ہو اور اس کی یہ مخصوص شکل پور میں آئی ہو یا میں ہی اس نیم تاریکی میں اسے ایک انجانے روپ میں دیکھ رہا تھا۔

پہاڑوں سے چٹی جھاڑیاں اور درخت تاریکی میں مدھم مدھم رہے تھے تاریک ہو رہے تھے۔ سیاہ چٹان موجود کرنے کے بعد میں چند جھاڑیوں میں سے راستہ بنانا پڑا..... پانی گرنے کی آواز پھر قریب آئی، جھاڑیاں ختم ہوئیں..... میں نے ایک طویل سانس کھینچا اور سنجستہ ہوا میرے جسم میں اس طرح داخل ہوئی جیسے تمام دروازے اور کھڑکیاں کھلے تھے..... ہمارے اوپر ایک گنے درخت کی تاریکی تھی۔ درخت کے تنے کے ساتھ ایک آبشار پتھروں میں گہرے ہوئے ایک تالاب میں گر رہی تھی۔ پتھروں کا رنگ سفید تھا اور تاریکی میں صرف پتھر اور وہ تالاب نظر آتا تھا جس کے کنارے برگد کا وہ درخت کھڑا تھا۔ جس کی تلاش میں ہم وہاں تک آئے تھے — ہما تبارہ کا برگد.....

کہا جاتا ہے کہ گئے زمانوں میں چین سے ایک راستہ ان پہاڑوں اور وادیوں کے درمیان سے آتا تھا۔ بدھ کے پیروکار اس راستے پر سفر کرتے ہوئے ہنزہ اور گلگت میں سے گزر کر ادھر آتے اور اس درخت کے آس پاس رات بسر کرتے۔ یہ ان کی کارواں سرائے تھی۔ یہاں سے وہ کشلا کا قیم درگاہ کو جاتے..... یہ درخت ہمیشہ سے یہاں موجود تھا۔ پہاڑوں میں سفر کرنے والے اس کے نیچے دوپل کے لئے آرام کرتے، تالاب میں نہاتے اور اپنی منزل کو روانہ ہو جاتے لیکن پچھلے دنوں چند جاہلیوں کا ادھر سے گزرتا ہوا تو انہوں نے کچھ ایسے آثار دیکھے جن کی بنیاد پر یہ کہا گیا کہ ہما تبارہ نے اپنے کسی سفر کے دوران یہاں قیام کیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس مغروئے کو شھوس حقائق کی بنیاد پر ثابت کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ البتہ بندی پر واقع یہ آبشار، تالاب، برگد کا درخت اور اس کا سکون اور دھول اس بات کا چہرہ دیتا ہے کہ یہاں کچھ تھا.....

ہے کہ جناب میں بذاتِ خود پچھلے دو گھنٹے سے اسے دیکھتا رہا ہوں۔ چنانچہ یہاں ہر شخص اس پر نظر رکھے ہوتے ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ چونکہ بیشتر لوگ مشترکہ خانہ دانی سسٹم میں زندگی گزارتے ہیں۔ اس لئے جو کچھ ہوتا ہے وہ سب کی نظروں کے سامنے ہوتا ہے بلکہ بہت کچھ تو بات ہو سکتا ہے نظروں کے سامنے نہیں ہونا پڑیے۔ اگلی محلوں کا حساب کتاب ہی اور ہے۔ کس گھر میں آج کون آیا ہے، انہوں نے کیا پکایا ہے، رہو ساس میں جھگڑا ہوا ہے یا نہیں فلاں لڑکے کا گروڑا کیسا ہے لڑکی کے پاس لباس کے کتنے جوڑے ہیں ایسی گرافتدر معلومات محلے کی مشترکہ میراث ہوتی ہیں۔ چنانچہ انسان کو چڑیا گھر میں رکھنے کا تجربہ ہمارے ہاں تو کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہم سب کے بچروں میں تاہم جھانک کرتے رہتے ہیں اور بغیر ٹکٹ کے یورپ اور امریکہ جیسے ممالک سے اپنے انسانوں کو چڑیا گھروں میں رکھیں وہاں تو یوں بھی انسان اور حیوان میں بہت کم فرق رہ گیا ہے۔

”مہاتما بدھ کا برگد اور آبشار“

ہم سید پوری چھوٹی شہر کے نکل کر اسلام آباد کی ایک شاہراہ میں داخل ہوئے تو رات ہو چکی تھی۔ سامنے الٹرا ڈاون مغربی طرز کے شاندار ہنگوں کی قطاریں تھیں۔ یہ سب کتنے بدصورت ہیں۔ میں نے کہا: ”اس لئے کہ انہیں انسان نے بنایا ہے اور جو کچھ ہم دیکھ کر آ رہے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے۔“ احمد داؤد کی چڑے کی جیکٹ سے آواز آئی اور اس نے موٹر سائیکل تیز کر دی۔ ساڑھن اسلام آباد کی شان و شوکت سے آنکھیں چندھیا نے کے بعد جب شام قریب آئی تو داؤد نے اپنی موٹر سائیکل ایک چھوٹی سی شہر پر موڑ دی جو سرگرم پہاڑوں کے دامن کی طرف جارہی تھی۔ میں تھکا ہوا تھا اور گھر جانا چاہتا تھا۔ لیکن احمد داؤد دھڑکتا تھا کہ مجھے سید پور ضرور دیکھنا چاہیے۔ ایک برگد کے نیچے ہم ٹک گئے۔ یہی برگد ہے؟ میں نے پوچھا۔ ”نہیں“ اس قسم کے برگد تک رسائی اتنی آسان نہیں کرتی۔ تمہیں کچھ دور چلنا ہو گا۔ سفر ناموں میں تو تم سامان کا دھڑوں پر رکھے جنگلوں پہاڑوں اور صحراؤں کی خاک چھاتے نظر آتے ہو۔۔۔۔۔ آج دیکھنے ہیں اس کی حقیقت کتنی ہے۔۔۔۔۔ وہ میرے آگے آگے چل رہا تھا۔ ایک پہاڑی ندی کے کناروں پر پختہ اور نیم پختہ مکان بلند ہو رہے تھے۔ چند بچے مارے پیچھے پیچھے چلتے گئے گاڑی کہاں ہے؟ داؤد نے ان سے پوچھا۔ ان میں سے ایک ہمیں پکے گھر میں لے گیا۔۔۔۔۔ مٹی سے بنی، کوئی ایک ”مٹی ایچر“ دیں گاڑی ایک شیلڈ پر رکھی تھی داگر کے گھروں میں ”شیلف“ ہوتے ہیں تو اس کے چھوٹے چھوٹے ڈبوں اور ان کے کارنگ جتنی تھا۔ ایک گھنٹل بھی تھا جو ڈاؤن تھا لیکن گاڑی ساکت تھی۔ کہیں نہیں جاتی تھی

گمراہ اور نوا درات۔ بھائی پونچھ کر دکھا رہا تھا۔ اور بوتا چلا جا رہا تھا کہ جناب یہ پانڈان دیکھو اور یہ
 عطر دان ملاحظہ کرو اور میں جان چھڑانا چاہتا تھا۔ تنگ آکر میں نے ان صاحب سے کہا کہ بھائی ان
 پانڈانوں کے علاوہ کوئی خاص قسم کی چیز بھی ہے۔ وہ ایک کونے میں گئے اور ایک بڑی سا رنگ دیگ
 اٹھالائے۔ میں نے کہا کہ میری شادی ہو چکی ہے، مجھے دیگ کی ضرورت نہیں، وہ کہنے لگے کمال ہے
 جناب، پڑھے لکھے ہوتا بھی نہیں جانتے کہ یہ دیگ نہیں، ایک قدیم مرتبان ہے۔ جس میں ایک سک
 شہزادی اچار ڈالا کرتی تھی، سو گنگھ کر دیکھئے، ابھی تک خوشبو آرہی ہے، میں نے پوچھا کس کی خوشبو
 شہزادی کی؟ کہنے لگے، نہیں، اچار کی..... اور جناب مجھے ان پڑے نہ سمجھیں آپ، گورنمنٹ کا ایک پڑھا
 ہوا ہوں۔ اگلے روز راک فیلر صاحب امریکہ سے آئے تھے تو ایرپورٹ سے سیدھے میرے پاس آئے
 تھے۔ میں نے سوچا کہ چچا انتھار حسین کو بتانا چاہیے کہ پانڈان متروک نہیں ہوا بلکہ پاکستان سے نکل کر امریکہ
 جا پہنچا ہے۔ وہ صاحب جب مجھے "نوا درات" دکھا دکھا کر ناپ گئے تو کہنے لگے کہ آخر آپ کو فریڈنا
 کیسا ہے؟ میں نے کہا کہ اجرک اور کھیس وہ بے حد ناراض ہوئے کہ پہلے کیوں نہیں بتایا، خواہ مخواہ برا
 وقت ضائع کیا۔ میں نے عرض کیا کہ جناب آپ تو مجھے دہو ج کر تہ خانے میں لے گئے اور بذات خود
 نوا درات کی نمائش شروع کر دی۔ اب یہ فرمائیے کہ اجرک اور کھیس کہاں سے ہوتے ہیں؟ وہ اکیلا
 اچھڑا ہوا عظیم مارکیٹ سے ہٹ کر ہو۔ میں نے جاتے جاتے پوچھا کہ سچ پچ راک فیلر آپ کی دکان
 پر آئے تھے؟ کہنے لگے کہ اُن کا دیا ہوا چیک دکھا دوں، میں نے کہا نہیں مجھے اب یقین آگیا۔ کیرے
 بازار سے نکل کر میں کشمیری بازار میں آگیا اور پھر اس تنگ راستے کے اندر داخل ہو گیا جو عظیم کافہ
 مارکیٹ کی طرف جاتا تھا۔ یہاں ایک ایسی دنیا آباد تھی جس کے وجود سے ایک لاکھ پوریا ہونے کے باوجود
 میں لاعلم تھا۔ یہاں نہ دن تھا نہ رات، ایک چکا چوند تھی، سیٹھروں دکانیں تھیں، درجنوں گھیل تھیں جن
 میں صرف کپڑے کی مصنوعات فروخت ہوتی تھیں۔ پاکستان بھر سے آئے ہوئے دکاندار اپنے علاقائی
 لباسوں میں لباس اور دھڑلے گھوم کر خریداری کر رہے تھے۔ یہاں وہ لوگ بھی تھے جو خالص پاکستانی
 کپڑا خرید کر بعد میں اس پر میڈر ان انگلیڈ کی مہریں لگا کر بیگمات کے ہاتھوں چوری چھپے فروخت کر

دیتے تھے۔ میں نے ایسا گریڈ بانڈر شاید مشتق اور استنبول میں بھی نہ دیکھا تھا۔ ایک دکان میں
 ہر کس پند آئیں تو میں نے پوچھا کیا بھائی؟ دکاندار کہنے لگا، کتنے چوڑا؟ میں نے کہا کہ چوڑا
 وہ غیر نہیں چاہیئے، چادر میں چاہئیں۔ وہ بولا پوچھ کرے کا مطلب ہے چار چادر میں، آپ کو کتنے
 چوڑے درکار ہیں، میں نے کہا مجھے کل تین چادر میں دس دو اس پر وہ قدرے مایوس ہوا کہ جناب
 ہم نو دو چار چوڑوں سے کم نہیں دیتے۔ میں نے کہا کہ بھائی صاحب آپ کی مہربانی میں اس عمر میں
 چوڑیاں تک نہیں بھر سکتا چوڑے کیا کروں گا۔ بہر حال انہوں نے مہربانی کی اور چادر میں عنایت کر
 دیں۔ واپسی پر میں اپنے حساب سے چلتا رہا لیکن گھوم پھر کر اسی دکان پر آ نکلتا۔ تمام راستے ایک
 جیسے تھے۔ تمام چہرے ایک جیسے تھے۔ بڑی مشکل سے باہر کا راستہ تلاش کیا۔ لیکن نہری مسجد کی
 بہنے لگیں اور آنکھ۔ قدیم شہر کا کوئی حصہ تھا۔ چھوٹی انٹوں سے بنے ہوئے دیدہ زیب مکان
 دروازے اور کھڑکیاں اتنے خوبصورت کہ ہر ایک میوزیم میں تھا۔ ایک جگہ کوئی نیا مکان بن رہا
 تھا اور بنیادوں کے نیچے کسی پرانی حویلی کی مہر میں دکھائی دے رہی تھیں۔ جانے کن زمانوں میں
 کن لوگ اس میں رہتے تھے۔ اور آج کو بھی راہ چلتے چلتے اس کی آخری جھلک دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ
 شہر وہاں پر کرکڑیوں کا اسے توڑ کر روڑی میں تبدیل کر رہے تھے..... کئی گلیاں، کئی محرابیں
 ایسی تھیں جو میں نے قریب اور مشتق میں بھی دیکھی تھیں۔ ان سب شہروں کا اصل ایک ہی تھا۔
 میں ایس این ڈی لینڈ کی طرح اس شہر کے قدیم گلی کوچوں میں گھومتا رہا۔ جس شہر میں پیدا ہوا تھا۔
 جہاں میرے اپنی عمر مرز کے درجنوں سال بسر کئے لیکن ان گلیوں، ان بازاروں کو پہلے کبھی نہ دیکھا۔
 اور آج بھی اتفاق مجھے ادھر لے آیا۔ میں بھی ان دانشوروں میں سے ایک تھا جو اپنی تہذیب، اپنی
 ثقافت کے بارے میں کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ ادھر ادھر سے سنتے ہیں اور پھر سیمیناروں میں
 ایسی ہی تقریروں میں عوام کو بتاتے ہیں کہ دراصل ہماری ثقافت کیا ہے اور آج مجھے معلوم ہوا کہ
 ہمارے شہر کے پرانے باسی ان گلیوں میں سے نکل کر جدید آبادیوں میں جانے سے کیوں بچ چکاتے
 ہیں۔ یہاں وہ حسن تھا جو انسان کو زندہ رہنے پر ابھارتا ہے۔ یہاں انسان ایک اکائی کھ

یہاں کچھ لوگ شہر سے تھے۔۔۔۔۔ آبخار کے کناروں پر جنگلی فرن کے ایک پودے پر
میں نے اکھاڑا۔ تالاب میں سے ایک پتھر لیا۔ برگد کا ایک پتہ بصد آداب توڑا اور دائرے کی بنا پر
گہری ہو رہی ہے ہیں چلنا چاہیے۔" واپسی پر ہم دونوں خاموش تھے۔ سرخ چٹان تک پہنچے تو وہاں
بھی خاموشی تھی، وہ مزدور اپنی کدال میت نیچے گاؤں کو جا چکا تھا۔ ہم سستانے کی طرف سے گئے
اور ندی کے کنارے ایک بڑے پتھر پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگے۔ پہاڑوں کی تاریک بہت ہی بڑی
ہو رہی تھی۔ ہم اس وادی میں بالکل اکیلے تھے۔ داؤد ایک دم چونکا ہو کر کہنے لگا: "یہاں پہاڑی شیر
بھی ہوتے ہیں اگر کوئی شیر آگیا تو؟" میں پہلے لرزا اور پھر ہنسنا۔ فکر نہ کرو اگر وہ شیر ٹیڈی ڈین کا
ناظر ہو تو ہو سکتا ہے میری وجہ سے تمہیں بھی چھوڑ دے۔" داؤد کہنے لگا: "فرض کرو کہ وہ تمہاری
ادا کاری کو سخت ناپسند کرتا ہو یا پھر سب سے ٹیڈی ڈین دیکھتا ہی نہ ہو؟" میں نے کہا: "پھر ایسے غیر
ہندب شیر سے اور کیا توقع ہو سکتی ہے وہ ہم دونوں کو کھالے گا۔"

سگریٹ ختم ہوا تو ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور سرخ چٹان کی طرف دیکھا جو سیاہ پہاڑوں میں
ایک کتبے کی طرح میں دیکھ رہی تھی۔۔۔۔۔ داؤد، ہزاروں برس پیشتر یہ چٹان میں تھی کسی بدھ مت کے
سامنے۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارا بدھ کی نگاہ بھی اس پر پڑی ہو اور آج ہمارے سامنے ہے ہزاروں
برس بعد کسی اور کے سامنے ہوگی۔ یہ چٹان دقت ہے۔۔۔۔۔ ہم کتنے حقیر ہیں۔ داؤد جھلک رہا
"تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" میں نے ایک پتھر اٹھایا اور اپنی پودی قوت سے چٹان کی جانب پھینکا
"۔۔۔۔۔ میں زیادہ سے زیادہ ایک پتھر مار سکتا ہوں لیکن چٹان وہیں کھڑی رہی تب ہم نے دقت سے باز
مانی اور سید پور کی طرف اترنے لگے۔۔۔۔۔"

"میرے سب کتنے بد صورت ہیں" میں نے کہا۔۔۔۔۔ "اس لئے کہ انیس انسان نے بنایا ہے اور
کچھ ہم دیکھ کر رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے؟ احمد فاؤد کی چڑے جیٹ میں سے آواز آئی تو
اس نے موٹر سائیکل تیز کر دی۔"

"سکھ شہزادی کا مرتبان اور پاندان"

"یہ دیکھئے! یہ پاندان کھنڈ کے کسی نواب کا ہے اور یہ دہلی کا بنا ہوا ہے
اللہ یہ پاندان جو پال کا ہے۔ ذرا بچی کاری ملاحظہ کیجئے، کیا عمدہ کام ہے۔ اس کی کٹوریاں اور پیالیاں بھی
پوری کی پوری ہیں۔۔۔۔۔ اور اس پاندان کو دیکھئے۔"
"بھائی میسر میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ میں پان ہرگز نہیں کھاتا ہوں۔"
"واہ جناب واہ۔۔۔۔۔ ان پاندانوں میں پان تھوڑے رکھے جاتے ہیں۔"
"تو اور کیا کھے جاتے ہیں؟"

"یہ پاندان تو جناب ڈرائنگ رومز میں رکھے جاتے ہیں۔ اسٹیک کے طور پر۔۔۔۔۔ ویسے ۹۰ روپے
لکھو کا ہے لیکن آپ سے ۵۰ روپے کھو۔۔۔۔۔ تول دوں۔۔۔۔۔؟"

ہوا ایک میرے ایک دوست عازم انگلستان ہو رہے تھے اور مجھ سے فرمائش کی بھائی میرے
تمہیں گورنر کی پسند ناپسند سے واقفیت رکھتے ہو۔ مجھے کچھ ایسے تحائف درکار ہیں جو میں وہاں جا کر ان
کی خدمت میں پیش کر سکوں۔ تحائف پاکستانی ثقافت کا مظہر ہوں اور سستے بھی ہوں۔ میں نے مشورہ دیا
کہ بھائی میرے سندھی چادریں، یعنی اجرک اور چند ڈبی دار کھیس خرید لو۔ وہ کہنے لگے: میں کیا خرید
لوں، تم خریدو، چنانچہ میں ان چادروں اور کھیسوں کی تلاش میں اعظم مارکیٹ کی طرف جا رہا تھا کہ
تھری ماسک کے پہلو میں واقع کیسرے بازار کے ایک دکاندار نے مجھے دبوچ لیا کہ جناب تاجر صاحب
کہیں گھوم رہے ہیں۔ اگر اصلی اور قدیم نوادرات درکار ہیں تو میرے تہہ خانے میں تشریف لاؤ۔ میرے
پاس ہزاروں چیس پڑے ہیں۔ اب میں اتنی پاتنی مارے تہہ خانے کے فرش پر بیٹھا ہوا تھا اور وہ مجھے

”مہتاب راشدی، موٹر سائیکل اور سرفراز سید“

خواتین و حضرات سرفراز سید ایک شخص سے مزاج کا انتہائی شریف النفس قسم کا انسان ہے جو دنیا میں صرف دو چیزوں سے ایک ساتھ رہتا ہے ایک مہتاب راشدی کی مسکراہٹ سے اور دوسرے اپنے پیشچہر ہونڈے سے۔ جب سے اس مسکراہٹ پر دوپٹے کی پابندی لگی ہے سرفراز اپنے ہونڈے پر ہی اکتفا کر رہا ہے۔

کل دوپہر میں سر جھکائے ایک چور کی طرح چھپتا چھپتا بلال گنج میں گھوم رہا تھا کہ سرفراز سید نے مجھے دیکھ لیا بلکہ میں نے اُسے دیکھ لیا۔ لیکن اس کے باوجود ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پہچانتے سے انکار کر دیا، اور ہوتیاں اُٹھائے قریب سے گزر گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر آنا سامنا ہو گیا۔ میں نے ایک گھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ اُسے پہلو کہا اور اس نے برابر کی گھسیانی مسکراہٹ لبوں پر لا کر مجھے پہلو کہا اور ہم پھر ایک دوسرے کے قریب سے گزر گئے۔ جب تیسری مرتبہ بھی کوشش کے باوجود ہم ایک دوسرے سے اٹک گئے تو سرفراز نے پوچھا ”تارڑ کیسے آئے ہو؟“ میں نے کہا ”یار سرفراز سیدنا تھا کہ باقی شہر کا بہت ادھر بلال گنج میں موسم زیادہ خوشگوار ہے۔ اس لئے سیر کر رہا ہوں.....“ اور ہم سرفراز نے دوپہر کی ٹوئیں ایک طویل سانس لیا اور کہا میں بھی سیر کر رہا ہوں..... اتنی دیر میں ایک کپڑا ہاتھ میں ایک ٹوٹا ہوا ٹیڈ گاڑڈے کر نمودار ہو گیا اور مجھے کہنے لگا: ”لو جی تارڑ صاحب! کل براہِ نینو ہے، جنوئن ہے آپ کے ہونڈے میں فٹ ہو جائے گا.....“ میں نے پہلے تو سوچا کہ اس کپڑے کے نیچے کو پہچانتے سے انکار کر دوں لیکن اُس کی صمت اچھی تھی اور ہاتھ میں

ٹوٹا ہوا ٹیڈ تھا..... جس کے حصول کے لئے میں کئی دنوں سے اس کے ہاں آ جا رہا تھا۔ بہر حال میں نے ٹیڈ گاڑڈے خرید لیا اور مجرموں کی طرح سرفراز سید کی طرف دیکھا جو دانت نکال رہا تھا۔ یاد ہے کہ ایک زمانے میں وہ بالکل سنبیدہ رہتا تھا لیکن جب سے مہتاب راشدی اس کے ہاں میں گن دلیا کی بیل لگا کر گئی ہے وہ سدا مسکراتا رہتا تھا۔ حالانکہ اس کی بیل نے ابھی تک بھول نہیں دیئے۔ بہر حال سرفراز نے میرے کانڈھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ یار گل میرے ہونڈے کا ٹکشن ہے۔ آج صبح جو میں نے اُسے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کی باڈی کے کسی بھی حصے پر یوٹیکا کا نام نہیں لکھا ہوا..... میں نے کہا یہ کس طرح ہو سکتا ہے، کہ اس پر نام ہی نہ لکھا ہوا ہو۔ کہنے لگا لکھا ہوا تھا لیکن گھس گیا ہے۔ اب میں بلال گنج سے ہونڈے کا موڈ گر کم خریدنے آیا ہوں۔ یہ نہ ہو کہ وہ میرے موٹر سائیکل کو ہونڈا ماننے سے ہی انکار کر دیں..... اب اس وقت اُس کے ہونڈے کو شیج پر دیکھ کر مجھے تسلی ہو گئی ہے کہ وہ بالکل نئے ناکام واپس نہیں لوٹا تھا۔

شروع شروع میں انیال تھا کہ سرفراز بالکل پیدل ہے۔ میرا مطلب ہے جہاں بھی آ جاتا ہے پیدل آ جاتا ہے۔ صرف ذرا جھک کر چلتا ہے اور قدرے تیز چلتا ہے۔ پھر ایک روز میں اپنے بزرگ موٹر سائیکل پر مال دوڑ پر جا رہا تھا کہ سرفراز نے میرے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ سیدنا سرفراز نظر دوڑائی تو میں بس میل کی رفتار سے جا رہا تھا۔ سبجان اللہ میں نے سوچا کہ سرفراز کو اگلی دوپہر میں پاکستان کی طرف سے دوڑنا چاہیے۔ بہر حال سلام دعا ہوئی۔ کہاں جاسیے ہو کیا حال ہے وفیو وغیرہ اور میں نے اپنی رفتار تیز کر دی تب میں نے حیرت سے دیکھا کہ سرفراز اب بھی میرے ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا۔ قدرے جھکا ہوا ہے لیکن چلا آ رہا ہے۔ پھر پھر میں نے پوچھا کہ شاہ جی اکمال ہے تم تو فلاں فلاں جان سے بھی زیادہ تیز دوڑتے ہو سرفراز نے کہا ”دوڑ گب رہا ہوں، بیٹھا ہوا ہوں“ میں نے کہا کس پر؟ کہنے لگا اپنے ہونڈے

پر۔ میں نے کہا۔ وہ ہے کہاں؟ کہنے لگا فی الحال تو میں بیٹھا ہوا ہوں، جب انڈیا کا دورہ دے گا..... یہ میرا اور اس کے ہونڈے کا پہلا تعارف تھا۔

سرفراز ایک روز دکان پر آگیا۔ کہنے لگا کیا کر رہے ہو؟ میں نے کہا کہ میں نے لگا پھر اٹھو میرے ہونڈے کی پچھلی نشست پر بیٹھو۔ میں نے بتیرا کہا کہ میں نے کہیں ہاں ہی نہیں تو کیوں بیٹھوں۔ اس پر مسکرا کر بولا یا راتے نخرے تو فلاں قانون بھی نہیں کرتی ہیں میں نے خیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ اچھا وہ اس..... اس ہونڈے پر بیٹھی تھی۔ وہ میرا تو کمرہ کمرہ دکان سے باہر لے آیا۔ تم بیٹھو تو بھی میں تجھے بتاتا ہوں کہ اس پر اور کون کون بیٹھا تھا۔ سرفراز اس ناتواں شے پر بیٹھ گیا جس کو وہ ہونڈا کہتا ہے اور کہنے لگا بیٹھو۔ دیکھو کہاں، جگہ ہی نہیں ہے۔ کہنے لگا بس آنکھیں بند کر کے اللہ کا نام لے کر یا علی کہہ کر چلو جاؤ۔ اگرچہ مجھے یہاں اس شیر کا حال یاد آیا جس نے شکل میں یا علی کا نعرہ بلند کیا تھا لیکن میں آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ اور یقین کیسے کسی معجزے کے تحت ایک چھوٹی سی نشست نمودار ہو چکی تھی۔ تب اس نے مجھے بتایا کہ وہ شہر کے گئے چنے لوگوں کو اپنے ہونڈے کی پچھلی نشست پر صفا ان کی فہرست تیار کر رہا ہے تاکہ بوقت ضرورت کام آئے۔ پردہ نشینوں کے علاوہ اس فہرست میں بڑے بڑے مشہور لوگ تھے۔ مثلاً گلوکار شوکت علی اور بقول سرفراز سید صاحب کبھی ہونڈے میں بیٹھ جاتے ہوتا تو وہ شوکت کو پیچھے بٹھالیتا ہے۔ جس کی بلند آواز سن کر ہونڈا چل جاتا ہے۔ شوکت کو سن کر تو بڑی دنیا چل جاتی ہے یہ غریب نونا تو اس ہونڈا ہے۔

سرفراز موسیقی سے گہرا شوق رکھتا ہے اسے بونے نے انرازیں بھی ایک مخصوص رکاوٹی آدم ہے۔ کہتے ہیں کہ آج سے سولہ برس پہلے فر فر بولتا تھا لیکن جب سے ہونڈا چلانا شروع کیا اس نے انجن کی آواز کے ساتھ تال لگاتے لگاتے اپنا یہ حال کر لیا ہے۔ یہ بھی کہتا ہے کہ اس ہونڈے کی ٹیوننگ دھاتا شوکت اور طبلہ نواز تازی سے کروا رہا ہے تاکہ سرتال درست رہے۔ گلوکار مہدی حسن نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ وہ کسی زمانے میں کار میکنگ ہوا کرتے تھے اور انہی

سائٹ کر کے اس کے ساتھ کان لگا کر آواز سے بتا دیا کرتے تھے کہ رنگ پسٹن ٹھیک کام کر رہے ہیں یا نہیں۔ میرا خیال ہے سرفراز بھی ہونڈے کی آواز سن کر ہر مشینا سی کی منریوں کی پہچان ہے۔

خواتین و حضرات آخر میں یہ عرض کر دوں کہ اگر سرفراز سید کے دل میں کہیں ایک موزیم کی ایسا قسم کی ہے کہ ہونڈا کہنی کو اتنی زبردست اور مفت کی پیلٹی مہیا کر کے انہیں قدرے شکر گزار کرے گا تو وہ غلطی پر ہے۔ ایک زمانے میں لاہور ٹی وی سے ایک مقبول سیریل ایک کیفیت ایک فنانس ٹیلی کاسٹ ہوا کرتا تھا۔ جس میں ناچیز بھی اداکاری کرنے کی کوشش میں مصروف ہوتا تھا۔ اس ناچیز کے پاس ان دنوں نئی تھی ہونڈا ۱۷۵، تھی جسے میں اس سیریل کے ڈراموں میں ہفتہ وار استعمال کرنا تھا۔ جہاں اس سیریل کو شہرت نصیب ہوئی وہاں میری ہونڈا ۱۷۵، اس جی اے بھی مقبول ہو گئی۔ مجھے زعم تھا کہ اس میں بہا پیلٹی کی وجہ سے کم از کم مزید دس برس موٹر سائیکل کی نو مزید فروخت ہوئی ہوں گی۔ کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ایک روز ایک چھٹا سا پرلہ کہیں گر پڑا اور میں اس کے حصول کے لئے ہونڈا کہنی کے ایک ڈیر کے پاس چلا گیا وہاں کچھ اس قسم کی گفتگو ہوئی۔

”جناب! افلاں پرلہ منیت کر دیجیے۔“

”بھیس روپے پچاس پیسے۔“

”جناب! میں نام مستنصر حسین تارڑ ہے۔“

”ہوگا، بھیس روپے پچاس پیسے۔“

”جناب! اسی ہونڈا کے لئے ہے جو ہر ہفتے ٹی وی پر آتا ہے۔“

”آؤ ہوگا، بھیس روپے پچاس پیسے۔“

”جناب! کچھ رعایت نہیں ہو سکتی۔“

”شاک ختم ہو گیا ہے ہمارے پاس پرزہ نہیں ہے۔“

”جناب آپ پورے پیسے لے لیں لیکن پرزہ تو عنایت کر دیں۔“

”اوتے جاتے ہو کہ نہیں۔“

تو بھائی سرفراز سید کسی غلط فہمی میں نہ رہنا۔ اور ہاں دو سال پیشتر جب میں اپنے بڑے ہونڈے کو بیچنے کے بارے میں سوچ رہا تھا تو ایک بھی خواہ نے مشورہ دیا کہ میاں یہ کام نہ کرو۔ میں نے پوچھا کیوں؟ کہنے لگے دیکھو اس ٹوٹے پھوٹے کھنڈر پر گھومتے رہو اس طرح ہونڈا والوں کی برنامی ہوگی کہ اچھا کچھ عرصہ بعد یہ حال ہوتا ہے ہونڈا کا اور وہ تمہیں ایک بار برائڈ نیو موٹر سائیکل گفت کر دیں گے۔ مجھے یہ تجویز بے حد پسند آئی اور میں ڈھیٹ بن کر لاہور شہر کی سڑکوں پر پھٹ پھٹ کرتا زندگی گزارتا رہا۔ تب ایک دن میں نے سرفراز سید سے کہا اس کے ہونڈا دیکھا۔ میں نے پوچھا کتنے برس ہو گئے..... کہنے لگا پتہ نہیں سولہ برس ہوئے ہیں یا چھبیس کچھ یا دہنہیں۔ میں نے سوچا اگر اس مرد درویش پر ہونڈا اپنی والوں کی نظر نہیں گئی جو سولہ یا چھبیس برس سے گھٹتا آ رہا ہے تو پھر میری سات برس پرانی ہونڈا پر کسے ترس آئے گا۔ علاوہ ازیں سرفراز تو صرف پچاس سی سی ہے اور میں ایک سو پچھتر سی سی کا۔ اگر پچاس والوں کی باری نہیں آئی تو میں تو بوڑھا ہو کر شاید فوت ہو جاؤں تب شاید تمہاری صورت یہ گفت میری قبر کے سر پر کندھ دیا جائے..... چنانچہ آپ سب کی اطلاع کے لئے میں آج صبح پھر بلال گنج گیا تھا اور پہلی مرتبہ اپنے ہونڈے پر گیا تھا۔ جب میں نے اُسے فروخت کرنا پایا تو کبارٹی حضرات کا ہنس ہنس کر کباڑہ ہو گیا۔ کہ جناب آپ یہ بنائی کہ پتے سے کیا دیں گے۔ چنانچہ اب میں اپنا ہونڈا فروخت کرنے کے لئے پے جمع کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ سرفراز سید بھی کام کرنے کے لئے اپنے مکان کو بیچنے کا سوچ رہا ہوگا۔

اور آخر میں یہ عرض کر دوں کہ کسی زمانے میں ہونڈا موٹر سائیکل کا ایک اشتہار

ہوا کرتا تھا۔ جن پر لکھا ہوتا کہ:

ALL THE NICEST PEOPLE RIDE HONDA

یعنی تمام اچھے یا خوشگوار لوگ ہونڈا چلاتے ہیں۔ مجھے اپنے کیت بائیوں کا تو نہیں پتہ البتہ سرفراز سید کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک خوبصورت اور خوشگوار شخص ہے جو ہونڈا چلاتا ہے اور ہمارا بار ہے۔

سرفراز سید کے ہونڈا کی سوہویں سالگرہ کے موقع پر پڑھا گیا

”بھولا بچی اور لپک کھیلیں“

میں یہ کالم لکھنے بیٹھا تو بھولے ریڑھی والے کو جلال آگیا اور وہ گلا بھڑا بھڑا کر آدی اپنے کلو..... آہستہ دے میوے..... آٹھ بہشت..... آٹھ گڑا..... آچونس..... کے نمونے لکھ لگا۔ میں نے تم میز پر رکھ دیا تاکہ وہ اپنی آموں سے لدی ہوئی ریڑھی فروخت کر لے اور اس کے بعد خاموش ہو جائے اور تب میں اپنا کالم لکھنا شروع کر دوں لیکن وہ پورے دو گھنٹے آٹھ گڑا آچونس کے نعرے لگاتا رہا اور کسی راگبیر نے نظر اٹھا کر نہ دیکھا کہ بھولا آم بیچ رہا ہے یا نہ..... تب میں نے بھولے سے مخاطب ہو کر کہا ”یار بھولے میں نے اپنی روزی کے بلکام لکھنا ہے تم خاموش نہیں ہو سکتے؟ وہ کہنے لگا: باؤ جی میں بھی اپنی روزی کے لئے گلا بھڑا رہا ہوں..... آہستہ دے میوے..... آٹھ گڑا.....“

”بھولے مجھے تو تہا رے آم دیسی دکھائی دے رہے ہیں اور تم انہیں لنگڑا اور شر بہشت کے خطاب دے رہے ہو۔“

”بھولا اپنی ریڑھی چھوڑ کر میرے پاس آگیا۔“ باؤ جی منڈی سے بند پٹیاں لے کر آیا تھا۔ آڑھتی نے شر بہشت اور لنگڑا کہہ کر یہ آم میرے آگے بیچے تھے۔ یہاں آکر کھولا ہے تو دیسی لکھ آیا ہے..... میں تو مارا گیا جی۔ میں نے اسے صلاح دی کہ وہ دیسی آموں کو دیسی آموں کی قیمت پر ہی فروخت کرے ورنہ سارا دن گلا پھاڑنے رہنے سے بھی کچھ نہیں ہوگا۔ اس نے میری تجویز پر تھوڑی دیر کے لئے غور کیا اور پھر کہنے لگا: عزیز ہو گئی ہے لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ ٹھیک ہے میں چند روپے کلو کے حساب سے بیچ

دینا ہوں..... آپ کو کتنا تول دوں؟“ ظاہر ہے تجویز میں نے پیش کی تھی اس لئے اس کی سزا کے طعنے پر مجھے دو کلو آم خریدنا پڑے۔ اس کے بعد جب بھولے نے ”آچھ روپے کلو کا غور بند کیا تو لپک اس کے آموں پر ٹوٹ پڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ریڑھی خالی ہو گئی۔ بھولے نے آمدنی کا حساب کیا۔ مایوسی سے سر ہلایا اور پھر بچی پان فروش سے ایک شرٹ خرید کر سگایا اور اپنی خالی ریڑھی پر بیٹھ کر بازار کے نظارے کرنے لگا۔ میں نے اپنا تم اٹھایا اور کالم کے بارے میں سوچنے لگا..... اسی دوران بچی پان فروش اپنے کھوکھے سے اٹھ کر بھولے کے پاس آ بیٹھا اور کہنے لگا: بھولے رات کو ٹیلیوژن پر کھینڈیں دیکھی نہیں؟ بھولے نے سوتا لگا کر پوچھا کونسی کھینڈیں؟..... کہنے لگا ”وہی جو امریکہ میں ہو رہی ہیں..... لپک!“

میں نے پھر اپنا قلم رکھ دیا اور بھولے اور بچی کے درمیان ”لپک“ کھیلوں کے بارے میں ہونے والی گفتگو سننے لگا.....

”آہو.....“ بھولا خوش ہو کر بولا۔ ”میں تو روز دیکھتا ہوں..... کیا بات ہے لپک کی؟..... بھولے نے ذرا شرما کر کہہ دیا: وہ زمانوں والا کام دیکھا تھا..... نہانے والا۔“

”آہو..... کیا بات ہے جل پر یاں لگ رہی تھیں۔ پر عجیب بات ہے ٹیلیوژن والوں کا جب بناتے ہیں کہ یہ لڑکی غلانے ملک لگا ہے اور یہ غلانے کی تو وہاں سے کاٹ کر آگے شروع کر دیتے ہیں۔“

”بلے شرمی کی وجہ سے میرے خیال میں.....“ بچی نے دود کی کوڑی لاتے ہوئے فیصلہ دیا۔ ”تو پھر بعد میں انہیں تیرتے ہوئے کیوں دکھاتے ہیں وہ نہیں ہے بلے شرمی کی بات..... انہوں نے تو دہاں والی بال والا بیچ بھی دکھایا عورتوں والا۔ نیکریں پہن کر کھیل رہی تھیں اور جنہیں بول مار رہی تھیں جیسے ان کی ماں مرنے ہو.....“

”اچھا وہ عورتیں تھیں؟..... مجھے تو بندے لگے تھے۔“

”تو نے فورے نہیں دیکھا ناں..... ہمارے ہاں لوگ کھیل کو تھوڑے ہی دیکھتے ہیں وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ کھیلنے والے بندے ہیں یا زنانیاں.....“

”نہیں بھولے..... سب لوگ ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ وہ نہیں تھے بازگروں کا تماشا..... ان میں لڑکیاں ہی تھیں پر مجال ہے۔“

”مجال کیا ہے؟“

”مجال ہے انہیں دیکھ کر خیال آتا ہو کہ یہ لڑکیاں ہیں۔ ایسے نمبروں کو توبہ دکھانے انہوں نے کیا بات ہے؟“

”ابھی تک گشتی نہیں دکھائی انہوں نے..... میں تو اس کا انتظار کر رہا ہوں، ہمارے نے بیڑا غرق کر دیا ہے سب پہوانوں کا۔“

”جھار تو گیا ہی نہیں، وہ تو انوکے کے پیچھے لگا ہوا ہے..... ویسے وہ بیمار تھا اب ٹھیک ہو گیا ہے؟“

”نہی گیا ہو گا..... سچا جھارے سے جا کر کون پوچھے کہ تو ٹھیک ہو گیا ہے کہ نہیں۔ پر کیوں نہیں گیا یہ لپک میں؟.....“

”بھائی وہاں پر صرف وہ لوگ جاتے ہیں جو پیشہ درندہوں، اس لئے نہیں گیا۔“

”چلو وہ نہ ہی لیکن ہمارے پاکستان میں اور بھی تو بڑا بڑا پہوان ہے..... سنا کر مٹا گوجرانوالا، رستم پاکستان، رستم زمان، ورلڈ چیمپئن وغیرہ..... اور ان کو تو پہوانی کے علاوہ اور بہت سارے کام ہیں.....“

”کون سے کام؟“

”مے میں نے مار کھانی ہے بنا کر..... نہیں تو ہتہ ہی ہے..... تو پھر ان پہوانوں کا پیشہ تو کچھ اور ہے تو یہ کیوں نہیں جاتے لپک میں؟“

”اگے لپک واسے بے ایمان ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس نے پہوانی کرنی ہے وہ اکیلا آئے گا..... اپنے چاچے باجے کے کہہ کر نہ آئے؟“

”ہاں یہ تو زیادتی ہے ناں انگریز کی..... ویسے برباد کر دیں ہمارے پہوان اگر لپک میں چلے جائیں..... یار ہماری طرف سے اند کو کون کون گیا ہے لپک میں؟“

”ہاں لپک میں؟“

”گئی ہے.....؟“

”آہو..... پر عاطف صاحب کے تھیلے کی وجہ سے نیوزی لینڈ والے پیسج میں جیت نہیں سکی۔“

”عاطف صاحب کے تھیلے میں کیا تھا؟“

”پتہ نہیں..... انہوں نے خود ہی کہا ہے کہ ہماری ٹیم مین کے مقابلے میں ایک سے جیت رہی تھی۔ تب میں نے اٹھنے کے لئے اپنا تھیلا اٹھایا تو ایک دم نیوزی لینڈ والوں نے دو گول کر دیئے۔“

”پھر تھیلا اٹھانے کی ضرورت کیا تھی؟“

”نہی آئے ہوئے تھے لپک کا میڈل جیتنے کے لئے۔“

”نہیں..... کیا انہوں نے لپک میں جانے سے پہلے یہ کہا تھا کہ بس گولڈ میڈل تو وہاں ایر کم مل رہا ہے اور ہم نے جا کر لے آئے؟..... ہماری ٹیم نے کہا تھا اس لئے نیوزی لینڈ کو گول نہیں کرنے چاہیئے تھے.....“

”ہاں انہوں نے زیادتی کی ہے..... پر یار ایک اور بات ہے..... دوسرے ملکوں میں یہ بھی تو نہیں ہوتا کہ ٹیم جیت کر واپس آئے تو پوری قوم پاگل خانہ ہو کر ان کے پیچھے لگ

جاتی ہے اور انہیں ہار پہنا پہنا کر انہیں ڈھیر یا بنا دیتی ہے اور اگر ہار کو واپس آئیں تو غریب کے بال چھتے پھرتے ہیں اور ایک ایک کر کے واپس آتے ہیں.....

”بھابی! ہم بڑی بند باقی قوم ہیں۔ زندہ قوم ہیں۔ کون کہتا ہے کہ ہم ہار کو واپس آنے والوں کو ہار نہیں پہناتے۔ وہ نیازی صاحب جو ہیں مشرقی پاکستان کے شیر.....“

”اوتے چپ کر..... بات لپک کی ہو رہی ہے اور تو ہاکی کھیلتا کھیلتا کون سے میدان میں نکل گیا ہے پاگل خانے..... پر یار جب ٹیلیوژن پر دیکھتا ہوں کہ دنیا کے سارے ملکوں کے کھلاڑی وہاں کھیل رہے ہیں کبھی کسی ملک کا نام آیا ہے، کبھی کسی ملک کا جھنڈا اونٹن کیا جا رہا ہے تو بڑا دکھ ہوتا ہے، یا کوئی ایسا وقت آئے گا کہ تمام کھیلوں میں پاکستانی بھی ہوں۔ بے شک ہار جائیں لیکن ہمارا نام تو ہو.....“

”ہمیں کرکٹ، ہاکی اور سکواش سے فرصت ہو تو باقی کھیلوں پر توجہ دیں؟“

”اور ننگ شکواتش؟“

”نہیں یہ بھی ہوتی ہے ایک کھیل..... پی آئی اے والے کھلاتے ہیں.....“

”مجھے تو ویسے بڑی شرم والی بات لگتی ہے کہ سارے اخباروں میں صفحے بھرے ہار کے ٹیلی ویژن والے روز دو گھنٹے کے لئے لپک دکھاتے ہیں اور ہمارا نام بھی نہیں ہوتا ان کھیلوں میں.....“

”ویسے تو ہندوستان کا بھی نہیں ہوتا۔“

”ہم نے ریس کرنی ہے ہندوستان کی..... اُن کو تو اپنے آپ سے فرصت نہیں انہوں نے کھیلیں کیا کھینچی ہیں؟“

”یار روس نہیں گیا لپک میں؟.....“

”نہیں.....“

”کیوں.....؟“

”امریکہ جو نہیں گیا تھا روس میں؟“

”کیوں؟.....“

”افغانستان کی وجہ سے.....“

”اور روس کیوں نہیں گیا امریکہ میں؟“

”وہ افغانستان کی وجہ سے نہیں گیا۔ وہاں اسے بہت مصروفیت ہے۔“

”یار بچی..... لپک میں ریڑھی لگا کر پھیل بیچنے کا مقابلہ نہیں ہوتا.....؟“

”نہیں..... یار بھولے لپک میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ پان لگانے کا

مقابلہ نہیں ہوتا.....؟“

”نہیں۔“

”تو پھر مٹی ڈالو لپک پر ہم نے کون سا جانا ہے وہاں پر..... آؤ تمہیں ایک اور پان

کھلاتا ہوں.....“

”پان اچلو..... ویسے بھی باؤ جی ہمارا منہ دیکھ رہے ہیں کہ کب ہم چپ کریں اور

کب یہ اپنا کام مکمل شروع کریں..... آؤ.....“

”آچمن دے میوئے۔ اور لپک کھیلیں“

بھولا پاکستانی پہلوانوں کے سیول اولپکس میں حصہ نہ لینے پر بڑا اپ سیٹ تھا.....
بھولا گوالانڈی میں ریٹری لگتا ہے اور موسم اور حیثیت اور موڈ کے مطابق جوجی میں آئے
تھا ہے۔ پھل فروٹ کے علاوہ کبھی وہ صلیم نان لگالتا ہے اور کبھی شربت اور کبھی کنڈ بیر پڑ
یچنے لگتا ہے۔ بھولے اور اس کی ریٹری کے علاوہ جو چیز نہیں بدلتی وہ اس کی جب الٹنی ہے
اگرچہ اس خوبی کو اکثر لوگوں نے قابلِ فروخت اٹیم کے طور پر اپنایا ہوا ہے۔ لیکن بھولا عرف
پھل فروٹ یچتا ہے اپنا عقیدہ اور محبت نہیں بیچتا۔ بہر حال وہ سیول اولپکس میں پاکستانی پہلوان
کا غیر موجودگی سے بڑا آپ سیٹ تھا۔ بہت دنوں بعد گوالانڈی گیا تو بھولا اپنی خالی ریٹری پر
آلتی پالتی مادے آچمن کے میوئے کے نعرے لگا رہا تھا اور ساتھ ساتھ مسکرتا جاتا تھا۔ جن
نے پوچھا کہ بھولے ریٹری تہا ری خال خالی ہے تو چمن کے میوئے کے نعرے لگا کر بیچ گیا
رہا ہے؟

بھولا بستر مسکرتا رہا ”کچھ نہیں باؤ جی..... آپ بڑے دن کے بعد آئے ہو اسلام آباد
بہت پسند آگیا ہے؟“

”یار بات یہ ہے کہ کسی لاہوری کو کبھی کوئی اور شہر پسند نہیں آتا سوائے لاہور کے اور
میں تو لندن اور پیرس بھی لاہور کے لئے چھوڑ آیا تھا۔ بہر حال اسلام آباد بھی اپنا شہر ہے
پر لاہور لاہور ہے.....“

”آہو جی نہیں رلیساں لاہور شہر دیاں.....“ وہ کہنے لگا۔ پھر باؤ جی آپ نے بڑی زیادتی

کے میں نے زیادتی کیا؟ میں نے حیران ہو کر کہا۔

”آہو جی آپ جیسے باؤ لوگوں نے بڑی زیادتی کی..... آپ نے اولپکس میں اپنے پہلوانوں
کو نہیں بھیجا.....“

”پہلوان تو گئے ہیں بھولے۔“

”اونیں جی! میں سچ بچ کے پہلوانوں کی بات کر رہا ہوں..... اپنے ملتان والے،
گوجرانوالہ والے اور لاہور کے بادشاہ..... جھگڑا ڈالنے والے، سردائیاں پنے والے اور
اکھڑے میں ڈنڈہ میٹھک نکالنے والے پہلوان بادشاہ.....“

”چھوڑا بھولے.....“ میں نے سر جھٹک کر کہا۔

”میکوں چھوڑیں جی.....“

اب میں اُسے یہ تو بتانا نہیں چاہتا تھا کہ ہمارے پہلوان کسی اور زمانے اور کسی اور جہد
کی یادگار ہیں..... وہ نہ کوئی کشتی لڑتے ہیں نہ کسی چیمپئن شپ میں حصہ لیتے ہیں اور خیر ایک
کھاکر بڑھکیں مار کر خودی دستم نہاں وغیرہ بن جاتے ہیں۔ اولپکس میں نصیبت یہ ہے کہ
اکھڑے میں مات دے کر ہی انسان کچھ بن سکتا ہے..... بہر حال میں نے بھولے کا دل
رکھنے کے لئے کہا کہ باقی دنیا جو ہے وہ ان دنوں فری شائل کشتی میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہے
اور انہوں نے اپنے فائبرے کے لیے صرف اسی قسم کی کشتی کو اولپکس میں شامل کیا ہے اس
لئے تھوڑے پہلوان وہاں نہیں جا سکتے۔

”نہیں باؤ جی..... بھولے نے سر ہلایا “ کہیں نہ کہیں تو ہمارے پہلوان جا کر ملک کا
نمائندہ بن کر ہیں یہاں بیٹھ کر ڈھول بجاتے رہتے ہیں اور سردائیاں پیتے رہتے ہیں..... ویسے
باؤ جی عجیب بات یہ ہے کہ یہ جو باقی ملکوں کے پہلوان ہوتے ہیں ان کی خوراک بڑی کم ہوتی ہے
تاکہ انہیں پہلوان آتا ہے وہ کہتا ہے جی میں آدھا کبیرا اور دس لکڑے روز کے کھا جاتا ہوں.....

..... ایسا کیوں ہے؟

”بس بھولے جس کو جو کام آتا ہے وہ دہی کرتا ہے۔“

”نہی جی نہیں ہمارے پہلوانوں کو پہلوانی بھی آتی ہے، بس اُن کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی..... ان کو لپکس میں بھیجنا چاہیے تھا۔۔۔“

”ایک اور چھوٹی سی بات ہے اور وہ یہ بھولے کہ..... اولپکس میں پیشہ ور کھلاڑی نہیں ہو سکتے..... اور ہمارے پہلوان پیشہ ور ہیں۔۔۔“

”چھوڑو جی..... باؤجی یہ سب فرادہ ہے..... سارے ہی پیشہ ور ہوتے ہیں بس کہیں نام کھالیا کہ وہاں کام کرتے ہیں..... کسی بینک میں یا بڑی کمپنی میں..... چاہیے تو یہ کہ ہمارے پہلوانوں کے نام بھی درج ہو جائیں کسی جگہ..... تو پھر یہ بھی پیشہ ور نہ رہیں گے۔“

میں کوئی جواب نہ دے سکا..... بھولے نے بات سولہ آنے ٹھیک کی تھی..... یہ پروفیشنل اور نامان پروفیشنل والا سب فرادہ تھا..... تمام کھلاڑی کہیں دکھیں لازم ہوتے ہیں۔ لیکن سارا سال اپنی ملازمت سے غیر حاضر رہتے ہیں اور دنیا بھر میں غیر پیشہ ورانہ کھیل کھیلتے رہتے ہیں.....

”آجمن دے میوے..... آجمن دے میوے.....“ بھولے نے مزید دو لٹریں لگائے.....

”میں پھر پوچھوں گا کہ خالی رہبری پر بیٹھ کر آوازیں کیوں لگا رہے ہو؟“

”میں بھی یہی پوچھوں گا کہ پاکستانی پہلوان لپکس میں کیوں نہیں گئے؟ ویسے آپ کی بات ہے باؤجی ہمارے پہلوانوں کے پیشے بھی تو اور ہوتے ہیں..... اب میری زبان نہ کھولائی لیکن آپ جیسے باؤ لوگوں نے بڑی زیادتی کی ہے انہیں لپکس میں نہ بھیج کر.....“

”مجھے تاؤ آگیا: سن بھولے..... میں نے کہا: ہم لوگ قوانین کی پابندی نہیں کرتے اور یوں بقول تمہارے اپنے ملک کی بے عزتی خراب کرتے ہیں..... تمہارے پہلوان جو ہیں کیا کرتے

ہیں؟ جب دیکھا کہ ہار رہے ہیں تو ہنگڑا ڈالتے ہوئے اکھاڑے میں آگئے اور اپنے پہلوان کو چھڑا کر کہہ دیں: ”اگرچہ میں ہار گیا ہوں لیکن میں نے تمہیں لگائے گئے۔ ریفری کی ٹپائی کر دی.....“

”ج حضرات کی بے عزتی کر دی اللہ اپنی شکت کو تسلیم نہ کیا..... یہ ہیں تمہارے پہلوان..... تو کیا ایسے لوگوں کو سیول بھیجتے؟“

”سیول والوں نے خود پتہ ہے کیا کیا ہے؟“

”کس نے؟“

”کوری والوں نے.....“

”انہوں نے اولپکس کا کامیابی سے انقذار کر کے پوری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے.....“

”اس کے علاوہ بھی باؤجی انہوں نے بہت کچھ کیا ہے۔ ہم تو جاہل لوگ ہیں۔ ہمارے پہلوانوں کو تیز نہیں ہے۔ لیکن وہ تو پڑھے لکھے ہیں۔ عقلمند ہیں انہوں نے کیا کیا ہے؟“

”کیا کیا ہے؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”باؤجی میں نے خود وہ بانگ پیچ ملی ویشن پر دیکھا ہے۔ مقابلہ تھا کوریہ اور بلغاریہ کے باکسروں کے درمیان..... کوریہ کا باکسر اچھا تھا پر فاول کھیل رہا تھا..... ریفری نے بار بار متعین کیا اور آسے وارنگ دی مگر وہ تماشا بینوں کے نعروں کی سے بھولے ہو چکا تھا اور فاول کھیل رہا تھا..... چنانچہ بیچ لوگوں نے بلغاریہ کے باکسر کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ بس جناب کو یاد آوے بانگ کے اکھاڑے میں کو دپڑے بڑھکیں لگاتے ہوئے کہ ہمارے باکسر کو کیوں ہار لیا ہے۔ انہوں نے پہلے تو ریفری کی مرمت کی اور اچھی طرح پھینٹی لگا دی۔ پھر جوں کو تھپڑ مارے اور اُن کے کاغذات پھاڑ ڈالے اور پھر جینئریم کی روشنیاں گل کر دیں تاکہ وہاں اوٹھنے نہ ہوں..... یہ کیا کوریہ والوں نے اور ہمارے پہلوان تو اتنے بُرے نہیں ہیں۔“

”بھولا پھر ٹھیک کہہ رہا تھا..... واقعی پاکستان کے پہلوان اگر ایسی حرکت کرتے تو پوری قوم ان کے خلاف بیانات دیتی۔ لیکن کوریہ والوں کی اس سپورٹس مین سپرٹ کا کسی نے بھی بُرا نہیں منایا۔“

”دیے بھولے تم یہ بتا دو کہ غالی ریٹری پر بیٹھ کر ”آجمن دے میوے“ کے نعرے لگنا لگا رہے ہو؟“

بھولا مسکراتا ہوا کہنے لگا۔ ”باؤ جی صبح انگور لایا تھا..... میں نے آجمن دے میوے کی آواز لگانی شروع کر دی۔ ایک نامانیم باؤ آیا اور سارے ٹکا کر لے گیا..... تو میرا ٹھوک پڑا نہ ہوا نعرے لگانے کا..... بس اسی وقت سے ذرا اپنے نعرے کے لئے ”آجمن دے میوے“ کے نعرے لگا رہا ہوں..... سارا دن لگا چھاڑ چھاڑ کر نعرے نہ لگاؤں تو میری صحت خراب ہو جاتی ہے..... آجمن دے میوے“

تھیں شکر گڑھ منیع یا کوٹ سے ایک کرم فرمانے کرم فرمائی کی ہے امداد اپنے خط میں ذرا

لکھتے ہیں.....
کرمی! میں آپ کے کالم ”کاروان سرائے“ پڑھتا رہتا ہوں اور ماشاء اللہ آپ کبھی کبھار اچھا کالم لکھ جاتے ہیں امداد آپ میں یہ خوبی ہے کہ آپ اپنے آپ پر رخصت کی صلاحیت رکھتے ہیں جو دیگر حضرات ہمیشہ دوسروں پر ہی ہنستے اور قہقہے لگاتے نظر آتے ہیں اس کے باوجود آپ میں ڈھریاں رہ جاتے ہیں۔ آپ نے اب تک بہت سارے لوگوں سے گفتگو کی ہے جو ٹیلی ویژن کے انٹرویو کے شائق ہیں ہوتی ہے۔ ان میں مجھے اداکارہ گل لالہ مولے اور پہلوان جی کے انٹرویو پسند آئے لیکن آپ کی اپنی بھی ایک حیثیت ہے کہ آپ کو سفرنامہ نگار جانا جاتا ہے تو آپ ذرا ایک سفرنامہ نگار کا انٹرویو بتائیں کہ وہ کس طرح ڈیٹیکٹیں مارتا ہے اور اپنے آپ کو توپ چیز سمجھتا ہے..... مجھے پتہ ہے کہ آپ ایسا نہیں کریں گے کیونکہ آپ پر جو چوٹ پڑتی ہے.....“

..... آپ کا ایک کبھی کبھار قاری۔
نوجوان تحصیل شکر گڑھ منیع یا کوٹ کے میرے کبھی کبھار قاری صاحب پیش خدمت ہے ایک سفرنامہ نگار کا انٹرویو اور یہ انٹرویو کریں گی ٹیلی ویژن کی معروف اداکارہ مس صدنا شیخ.....

”ماہرین صدنا شیخ پر درگرم پیسج اور سفرنامہ نگار“ کے کر حاضر خدمت ہے..... آج سے سٹوڈیو میں ایک سفرنامہ نگار شریف رکھتے ہیں اور عرف عام میں انہیں موہی دروازے کا درگرم لو کہا جاتا ہے..... آئیے ان سے ملاقات کرتے ہیں..... السلام علیکم مارکو پلو صاحب۔“
”سلام السلام مس صدنا شیخ صاحبہ..... آپ کا ٹیلیفون نمبر کیا ہے؟“

”جی! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟“

”ٹیلیفون نمبر پوچھا ہے..... آپ اگر پسند کریں تو کسی روز شام کو.....“

”مارکو پوچھو صاحب ہمارا پر دو گرام لاکھوں ناظرین ملاحظہ فرما رہے ہیں۔“

”مس صدنا ز شیخ لاکھوں ناظرین صرف آپ کو ملاحظہ فرما رہے ہیں سبحان اللہ.....“

”تو پھر فون نمبر عنایت کیجئے گا؟“

”آپ کیا کریں گے میرے فون نمبر کو..... کیونکہ آپ کچھ کرنے جو گے تو میں نہیں۔“

”دیکھئے صدنا ز..... میری ایک حیثیت ہے سفر نامہ نگار کی اس حیثیت میں میں نے مشہور

کر رکھا ہے کہ میں جہاں جاتا ہوں وہاں لڑکیاں میرا انتظار کر رہی ہوتی ہیں اور مجھ پر فون

ہو جاتی ہیں تو یہ میری ریویشن کا معاملہ ہے کہ میں آپ سے فون نمبر دریافت کر دوں۔ اور یقین کیجئے

پر دو گرام کے بعد میں آپ کو ہرگز فون نہیں کر دوں گا کیونکہ آپ نے خود ہی تو فرمایا ہے کہ میں کچھ

کرنے جو گا تو ہوں نہیں.....“

”بہر حال میں فون نمبر پر دو گرام کے بعد شاید..... تو فی الحال آپ سے چند سوال۔ آپ

سفر نامہ نگار کیسے مشہور ہو گئے؟“

”میں نے خود اپنے آپ کو مشہور کر لیا.....“

”وہ کیسے؟“

”ایک تو وہی ہر صفحے پر ایک خاتون مجھ پر عاشق ہو جاتی تھی۔ اس طرح بہت مشہور

ہوئی..... آپ نے نوٹ کیا ہو گا کہ میں نے اپنے سفر ناموں میں کبھی اپنے کسی پاکستانی عشق کا ذکر

نہیں کیا..... صرف اس لئے کہ میں پکڑا جاتا..... پہلے تو اس لڑکی کے والدین بڑھاپے اور پھر خاتون

خود صبح سویرت حال جان کر مجھے پکڑ لیتے کہ جھوٹ بولتے ہو۔ غیر ملکی خواتین سے عشق کے تذکرے

میں بھی تو سہولت ہے کہ ان کی تصدیق نہیں کی جاسکتی بلکہ ایک بار مجھے جرمنی کی کسی خاتون کے

ساتھ اپنا عشق بیان کرنا تھا اور نئی ہر ہے مجھے خاتون کا نام ضرور بتانا تھا اور مجھے کوئی جرمن

نام یاد نہیں آ رہا تھا۔ چنانچہ میں نے خاتون کا نام بھاگ بھری رکھ دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ

جرمنی میں یہ نام نہیں رکھا جاتا تو بڑی شرمندگی ہوئی۔“

”آپ کو شرمندگی بھی ہوتی ہے؟“

”وہ جی ضرور کبھی کبھار ہو جاتی ہے۔“

”اچھا ان جیسے عشقوں کے علاوہ آپ کس طرح مشہور ہوئے؟“

”میں نے اپنے ساتھ شاہین منائیں جن میں فن اور شخصیت کے حوالے سے معنائیں

بڑھ گئے۔ ان مضامین میں شخصیت میری تھی اور فن مضمون نگار حضرات کا تھا۔ اس کے

بعد میں ایک ادبی گروہ میں شامل ہو گیا۔ جس کے سربراہ جناب ادب کثیف تھے..... ادب

کثیف کو اپنے گرد ماسین اور احباب جمع کرنے کا بڑا شوق ہے۔ میں چند مرتبہ ان محفلوں

میں شریک ہوا، وہ چائے بھی پلانے تھے اور گفتگو بھی سنانے تھے اور حاضرین صرف سر

جانے تھے..... ادب کثیف صاحب سے ملنے کا یہ فائدہ ہوا کہ میں ان کا سفر نامہ نگار ہو گیا۔“

”ان کا سفر نامہ نگار؟“

”جی ہاں! اردو ادب میں کئی گروپ ہیں اور ہر گروپ کا اپنا اپنا حلقہ ہے اور اپنی اپنی

فہرست ہے..... سفر نامہ نگار، افسانہ نگار، نقاد وغیرہ سب اپنے اپنے ہیں۔ یہ گروپ

لئے ایماندار ہیں کہ جب کبھی میٹنگیں و سرٹن، ریڈیو یا کسی مذاکرے میں ان کو بلوایا جاتا ہے تو صرف

اپنے سفر نامہ نگاروں، شاعروں اور افسانہ نگاروں کے نام لیتے ہیں..... اور اکثر اس قسم

کے بیان دیتے ہیں کہ سیر نیازی کے بعد مجھے پو پٹ ہو کیوں سے بڑی توقعات ہیں.....“

”اس کے بعد کیا ہوا؟“

”جب ادب کثیف صاحب کے حوالے سے میں نے مناسب شہرت حاصل کر لی تو

پھر میں ادب چھالیہ والوں کے ساتھ مل گیا۔“

”یہ کون ہیں؟“

”ادب چھالیہ صاحب دو تین ادبی پرچوں کے مدیر ہیں۔ شیعہ قاف کا بہت دھیان

رکھتے ہیں اور ان کا ایمان ہے کہ ادب صرف چھالیہ چھالتے ہوئے لکھا جاسکتا ہے اور ادب

جھالیہ ہی دکھی ادب کی خدمت کا ایک ذریعہ ہے۔۔۔۔ میں نے ان کو بھی اپنے اہل خانہ کے لئے استعمال کیا اور پھر اپنا ایک الگ گروہ تشکیل کر لیا۔

”آپ کے ادبی گروپ کا کیا نام ہے؟“

”ہم نام بدلتے رہتے ہیں لیکن ان دنوں اسے ادب قیمت کہا جاتا ہے۔“

”مارکو پولو صاحب ہم سفر نامے سے ادب کی طرف نکل گئے یہ فرمائیں کہ سفر نامہ ادب ہے یا نہیں؟“

”اگر وہ میرا سفر نامہ ہے تو ادب ہے ورنہ نہیں ہے۔۔۔۔ اور ہاں آپ کا فون نمبر۔۔۔۔؟“

”آپ اپنے علاوہ اور کس کس سفر نامہ نگار کو جانتے ہیں؟“

”میرے علاوہ ادب ہے ہی کوئی نہیں تو میں کس کو مانوں؟“

”یعنی میں نہ مانوں؟“

”نہیں میں تو نہ مانوں پر وہاں ماننے کے لئے کوئی ہو تو مانوں۔۔۔۔ یا نہ مانوں۔“

”مارکو پولو صاحب۔۔۔۔“

”جی صدنازشیخ صاحبہ۔۔۔۔“

”آپ میرا نام اتنے۔۔۔۔ اتنے پیار سے نہیں، ٹیلیوژن پر لاکھوں ناظرین ہیں دیکھ رہے ہیں۔“

”میں بھی تو لاکھوں میں ایک ہوں۔۔۔۔۔“

”اچھا یہ فرمائیں کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ نے سیاحت و سفر تو کی نہیں، ایک بار کہیں ملازمت کے سلسلے میں گئے تھے اور پھر دھڑا دھڑا سفر نامے لکھنے شروع کر دیئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ دوسرے سفر ناموں سے استفادہ و سفر کرتے ہیں؟“

”دوسرے سفر نامے کہاں۔۔۔۔ میں نے بالکل کسی اور سے کچھ نہیں لیا۔ یہ جھوٹ ہے کہ میں روم نہیں گیا اور وہاں کا سفر نامہ لکھ دیا، بغیر کچھ کہ میری ٹریڈ وہاں سے گزری تھی

اور مجھے کسی کی تلقین کرنے کی ضرورت ہے۔ میرے پاس انگریزی زبان میں بے شمار سفر نامے ہیں۔ مختلف ملکوں کے سفارت خانوں کے بھیجے ہوئے بروشر اور معلوماتی کتابچے ہیں۔۔۔۔۔ تو مجھے کیا ضرورت ہے مقامی سفر نامہ نگاروں کی۔ ان کو تو پتہ بھی نہ چلے کہ میں کہاں سے کیا

لے کر آتا ہوں۔ یہ کچھ پڑھتے تو ہیں نہیں میں چیلنج کرتا ہوں کہ یہ میرے ناروے کے سفر نامے ہیں سے ایک فقرہ ایسا نکال کر دکھائیں جس سے پتہ چلتا ہو کہ میں وہاں نہیں گیا۔۔۔۔۔“

”یہ واقعی آپ کا کمال ہے کہ آپ پتہ نہیں چلنے دیتے۔۔۔۔۔ مارکو پولو صاحب۔۔۔۔۔“

”دیکھئے مجھے مارکو پولو نہ کیجئے۔“

”بکوں۔“

”میری بے عزتی ہوئی ہے۔۔۔۔۔“

”آپ کی۔۔۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔۔۔ لیکن کس طرح؟“

”یہ مارکو پولو میرے سامنے کیا حیثیت رکھتا ہے۔ معمولی قسم کا سفر نامہ نگار تھا۔ صرف

اس لئے کہ وہ انگریز تھا اس لئے آپ نے اسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔۔۔۔۔“

”مارکو پولو تو غالباً اٹالوی تھا۔“

”نہیں انگریز تھا۔۔۔۔۔ مجھے نہیں معلوم ہو گا تو اور کس کو ہو گا۔ میں نے ہی تو اس کے

نام کو پھر سے زور دیا ہے۔۔۔۔۔“

”آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ انگریز تھا؟“

”دیکھئے اس کے سفر نامے کا نام ہے ”ٹریولز آف مارکو پولو“ اور یہ انگریزی زبان میں ہے تو مارکو پولو انگریز ہونا نا؟ اب میں پاکستانی سیاح ہوں تو کیا میں عربی میں لکھوں گا؟

”بیت خوب۔۔۔۔۔ تو مارکو پولو۔۔۔۔۔ معاف کیجئے گا۔۔۔۔۔ تو آپ یعنی عظیم سفر نامہ نگار صاحب

اب اللہ کے لئے جو سفر نامہ نگار بننا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے کیا پیغام ہو گا؟“

”میرے پاس کچھ نہیں ہے۔۔۔۔۔“

”نہیں پیغام....“

”اچھا.... میرا بھی پیغام ہے کہ سفر کریں نہ کریں لیکن سفر نامہ مزدور لکھیں اور کوئی اور دنیا کا نقشہ بھی دیکھ لیں۔ کیونکہ ایک مرتبہ میں نے کہیں لکھ دیا تھا کہ ٹیکسٹ کا تباہ کو بیت شہر ہے اور یہ پیرس کے نزدیک ایک گاؤں ہے....“

”اچھا؛ تو وہ پیرس کے نزدیک نہیں تھا۔“

”نہیں، نقشہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ ٹیکسٹ تو تہران کے قریب ہے۔“

”تو ہمارے پروگرام“ سچ اور سفر نامہ نگار کا وقت ختم ہو رہا ہے؛ تو سفر نامہ نگار...

.... ہم آپ سے بھی اجازت چاہیں گے۔“

”لیکن صدنا ز شیخ صاحبہ آپ نے ٹیلی فون نمبر دینے کا وعدہ کر رکھا ہے۔“

”آپ باز آنے ہیں کہ نہیں....“

”ہیں باز نہیں آ سکتا۔ میری ریپویشن کا سوال ہے۔ کیوں کہ میں جہاں جاتا ہوں وہاں...

پھوڑا آتا ہوں۔“

”آپ....“

”میں دراصل آپ سے ملاقات کا متمنی شرکت ہوں.... ٹیلی فون نمبر؟“

”میں جوتے لگاؤں گی اگر تم نے میرا نمبر پوچھا تو۔“

”کل کرتی ہیں۔ میرے لاکھوں مداخلتیں مجھے دیکھ رہے ہیں تو میں تو داستان چھوڑنا...

چاہتا ہوں۔“

”اوہو.... مس صدنا ز شیخ آپ نے تو سچ سچ سینڈل اتار لی.... دیکھئے یہ داستان...

لوگوں کے سامنے نہ دہرائیے کیونکہ میرے سفر ناموں میں جو قصے درج ہیں۔ ان کا اصل ہی...

تھا.... بس ٹیکسٹ نمبر.... ہائے آپ کی سینڈل تو بہت زور سے گنتی ہے۔“

”نقشہ اور چارپائی“

میں نے مضامینت کر لی ہے۔ ”عبداللہ حسین نے پائپ سلگاتے ہوئے کہا۔

کس کے ساتھ؟ میں نے پوچھا۔

”اس حقیقت کے ساتھ کہ مجھے کبھی بھی میرے سائز کی چارپائی اور چرنے نہیں ملیں گے۔“

عبداللہ حسین ایک ایسا دراز قد شخص ہے جو دراز ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ کمرے میں داخل

ہو تو بے توابی خامت کو سمیٹ کر اور جھک کر.... اور جب وہ کمرے کے اندر آ جاتا ہے

تو پھر اس کا قد بڑھنے لگتا ہے.... اس نے اس دراز قاتی پر پردہ ڈالنے کے لئے

پلے بھرنے اور اٹھنے بیٹھنے کا ایک خاص انداز اپنا رکھا ہے.... وہ ذرا جھک کر اور

اپنے آپ کو ایک پلک دار ڈالی کی طرح میٹھا ہوا چلتا ہے.... وہ اپنی دراز قاتی پر پردہ

ڈال جاتا ہے لیکن اس میں بڑی طرح ناکام رہتا ہے.... اور ادب و ادب میں بھی اس

کا یہی حال ہے اسے ابھی تک اس کے سائز کا نقاد نہیں ملا۔ ایک چارپائی اور نقادین

بہت فرق ہوتا ہے۔ ادب میں اپنی دراز قاتی کو چھپانے کی بہت کوشش کرتا ہے اور

بڑی طرح ناکام رہتا ہے.... جس شخص نے ادا اس لیس ”اور“ ”باگھ“ جیسے بڑے ناول

تحریر کئے ہوں وہ کیسے چھپ سکتا ہے؟

یہ تقریباً بارہ تیرہ برس پہلے کی بات ہے کہ پاکستان نیشنل سنٹر میں کسی کتاب کی

تقریب رونمائی تھی۔ شاید کسی ایسی کتاب کی جو میری کبھی ہوئی تھی اور وہاں تقریب کے

بعد چائے پر میرے برابر میں ایک ایسا شخص بیٹھا ہوا تھا جو کچھ غیر ملکی لگ رہا تھا یا شاید

وہ نہیں اس کا پاپ پینے کا اندازہ فرملکی لگ رہا تھا..... اس نے آگے جھک کر کہا ”مجھے جناب عالی! آپ کی کتاب ”فاختہ“ بہت پسند آئی تھی“ میں مسکریہ کہا اور اُسے بھول گیا۔

مغفل کے اختتام پر میں نے ذرا خوشگوار ہونے کے لئے پوچھا کہ جناب کون ہیں اور کیا کرتے ہیں؟

”میں انگلستان میں رہتا ہوں اور میرا نام عبداللہ حسین ہے“

اس معلومات کے بعد میں نے کوشش کر کے اُسے دوست بنالیا۔ کیونکہ مجھے اس کی تحریر پسند تھی اور ادب میں میری مدستی صرف تحریر کے حوالے سے ہوتی ہے۔۔۔۔۔
..... مختصر یہ کہ وہ ایسا دوست ہوا کہ میں بھول گیا کہ وہ ادیب بھی ہے۔ کبھی کبھار جب مجھے یہ خیال آتا کہ موٹر سائیکل کی کچھلی نشست پر بیٹھا شخص ادا س نسلوں کا خالق ہے تو مجھے جھرجھری سی آجاتی ہے اور ہاں مجب پہلی مرتبہ میرے موٹر سائیکل پر بیٹھا تو ایک غیبی لطفہ ہوا۔۔۔۔۔ میں موٹر سائیکل پلار ہا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ میرے دائیں بائیں جو گھٹنے ہیں وہ اگرچہ میرے ہیں لیکن وہ کچھ اجنبی سے ہیں۔۔۔۔۔ معلوم ہوا کہ وہ میرے نہیں عبداللہ کے ہیں اور کچھلی نشست سے یہاں تک پہنچے ہوئے ہیں۔

عبداللہ حسین واپس انگلستان چلا گیا پھر وہ کچھ عرصے کے لئے بمبیا چلا گیا۔ ہماری خط و کتابت جاری رہی.....

وہ جب بھی پاکستان آتا ہم مل بیٹھتے اور ایک دوسرے کے ساتھ وہ باتیں کرنے جو ہم کسی اور کے ساتھ نہیں کر سکتے تھے..... ان باتوں میں ادب..... وطن..... غم..... ادب محبت سب شامل تھے بلکہ ہم محبت کے بارے میں کچھ زیادہ ہی ہم خیال تھے۔ جلد الحین ایک طویل غم کے بعد ان دنوں پھر پاکستان میں ہے اور ہم اکثر مل بیٹھتے ہیں اور کچھ پانچ برس میں جو کچھ ہوا اس کے نقشے بنتے ہیں اور ان پر ان لکستوں کی لکیری کھینچتے ہیں۔

جن پر ہم چلنا چاہتے تھے اور چل نہیں سکتے تھے۔ اور ان نامہواریوں کے بارے میں دل
ملنے میں جو ہمارے آس پاس ہیں۔

بیت کم لوگوں نے عبد اللہ حسین کو دیکھا ہے..... بہت زیادہ لوگوں نے عبد اللہ حسین
 کو دیکھا ہے کہ وہ لورا چین بھی ہو سکتے ہیں.....

اے اگر کہا جائے کہ عبد اللہ فلاں رسول میں ایک ادبی تقریب ہے تو وہ بیٹھے بٹھائے
سکڑ جائے اور کہتا ہے: "جناب عالی! میں تو نہیں جا رہا۔" وہ اخباروں میں تقریروں، ملاقاتوں
اور بیرونی کارروائیوں سے دور رہتا ہے کیونکہ وہ ان میں سما نہیں سکتا۔

پچھلے جمعہ کے روز صبح سویرے وہ میرے ہاں آگیا اور ہم نے ایک انگ اور ٹھہرا

”میں نے سنا ہے کہ ادا اس نسلیں“ چینی زبان میں ترجمہ ہو گئی ہے! میں نے پوچھا: ہاں“ وہ ڈاکٹر منہ ہو کر بولا۔ پس ہو گئی ہے..... میرے پاس ایک کاپی ہے اب پتہ نہیں وہ میری کتاب ہے یا کسی اور کی..... مجھے تو جناب چینی زبان نہیں آتی مجھے کیا پتہ۔“

مبداء اپنے بارے میں بہت کم گفتگو کرتا ہے۔۔۔۔ اس کا کتابوں کے ترجمے ہندی،
بنالی، انگریزی میں بھی ہو چکے ہیں۔ محمد عمر نے ان کی کہانیوں "نشب"، "واپسی کا سفر"،
"حویب"، "سندھ اند پھول کا بدن" کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا ہے جو کیفیٹر این شائع
ہو رہا ہے۔۔۔۔ کھیلے کئی برسوں سے وہ ایک انگریزی ناول - LOVE AMONG

۱۰ برطانیہ کی ایک اہم فلم کمپنی بنائے گی۔

”اس نادلی کو اردو میں کیا کہا جاسکتا ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔
 ”جلاوطنوں کے درمیان محبت کی بازی“ اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ”ویسے جلاوطن
 محبت کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔“

میں ایک سوال پوچھنا چاہتا تھا اور مجھے حد شرع تھا کہ وہ ناراض ہو جائے گا۔ میں اس
 سے پیشتر دو تین قیمتی دوست صرف ایک آدھ سوال کرنے کی وجہ سے کھو چکا تھا اس لئے
 میں نے کچھ دھڑکتے دل سے یہ پوچھا کہ عبداللہ تم پاکستان کے ہو یا اس دھرتی کے بہت ہو
 اردو کے لکھاری ہو اور ادب پچھلے بیس بائیس برس سے ملک سے باہر ہو اور اب انگریزی
 زبان میں لکھ رہے ہو تو تمہاری پہچان کیا ہے؟ تم کون ہو؟

”میں جناب عالی! عبداللہ حسین نے پائپ کا ایک طویل کش لگایا۔“ میں ایک پائپ
 ادیب ہوں اور میں ایک اردو لکھنے والا ادیب ہوں یہ میری پہچان ہے۔ میں نے انگریزی
 ناشر کو زور دے کر کہا تھا کہ مجھے صرف اور صرف ایک پاکستانی ادیب کہا جائے، اور
 لکھا جائے۔“

”تم اتنے عرصے بعد وطن آئے ہو۔۔۔۔۔ یہاں کیا عسوس کیا؟ میں نے بالکل اسی قسم
 کا سوال کیا جس قسم کا سوال ہر کندہ بن انٹرویو لینے والا کرتا ہے۔“

”مجھے یہاں آکر احساس کمتری ہو گیا ہے۔“ عبداللہ سنجیدگی سے بولا۔
 ”یہاں آکر کیسے ہو گیا ہے؟ یہ تمہارا اپنا ملک ہے؟“

”ہاں انگلستان میں مجھے یہ احساس کبھی نہیں ہوا۔۔۔۔۔ یہاں میں نے اپنے آپ کو عزت
 کے بغیر عسوس کیا۔ ان ملکوں میں حکومت تمہیں عزت دیتی ہے۔ یہاں آپ کو دوست کمانے
 کے مواقع دیتی ہے لیکن عزت نہیں دیتی۔۔۔۔۔“

”مجھے یاد آیا کہ مشہور اطالوی ادیب البرٹو مورادیا نے اپنی ایک کتاب میں مغرب عزت
 کے ساتھ ”کا فلسفہ بیان کیا تھا۔ عبداللہ بھی دراصل یہی کہنا چاہتا تھا۔“

”زندگی میں تم نے اور کون سا کارنامہ سرانجام دیا ہے؟“
 ”میں کھانا بہت اچھا پکا لیتا ہوں۔ پلاؤ، والیس اور فورمر وغیرہ۔۔۔۔۔ کیا یہ ایک

بہم کارنامہ نہیں ہے؟“
 ”تم اتنے مست مصنف کیوں ہو؟۔۔۔۔۔ اتنے طویل عرصے میں صرف تین کتابیں؟“
 ”میں میرا دل نہیں کرتا لکھنے کو؟“ اس کے لیے باز فضا میں یوں بند ہوئے جیسے ایک پرندہ
 رٹنے سے پہلے ہر توتا ہے۔

”لکھنے کو دل نہیں کرتا تو اور کس چیز کو کرتا ہے؟ تمہیں خوبصورت چہرے اچھے لگتے ہیں؟“
 اس نے اٹنا مجھے سوال کر دیا۔

”ہاں۔“

”تو بس بھی دل کرتا ہے۔“ وہ شرارت سے مسکرایا۔

”کیا کبھی سیاست کی طرف بھی آؤ گے؟“

”ہر ادیب سیاست میں ہوتا ہے وہ اس سے الگ کیسے ہو سکتا ہے۔“

”میرا مطلب ہے عملی سیاست میں۔۔۔۔۔ ہمارے ملک میں بڑے بڑے شاندار لوگ
 سیاست میں ہیں۔ جاگیردار، سرمایہ دار، کاروباری اور ان پڑھ۔۔۔۔۔ ایک ادیب بھی تو
 سیاست میں آ سکتا ہے؟“

”ہاں کیوں نہیں۔۔۔۔۔ ویسے جوں جوں میری عمر بڑھ رہی ہے اس کے ساتھ سیاست
 میں دلچسپی بھی بڑھتی جاتی ہے۔۔۔۔۔ پتہ نہیں میں سیاست میں آتا ہوں یا نہیں۔۔۔۔۔ پتہ
 نہیں۔۔۔۔۔ اگر کوئی خاص موقع ملتا تو شاید۔“

”انگریزوں کی کونسی چیز نے متاثر کیا؟“

”عجب کوئی پرانا درخت ختم ہو جاتا ہے وہ گرنے کو ہوتا ہے تو اُسے کاٹنے کے
 لئے آجاتے ہیں۔۔۔۔۔ اور تب وہاں لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں ماتم کرنے کے لئے۔۔۔۔۔ بچے

لوڑھے اور جوان..... اور جب وہ درخت کٹا ہے اور گرتا ہے تو وہ روتے ہیں۔ وہ ایک درخت کی موت پر روتے ہیں۔ ایک بڑھیلے میں نے دریافت کیا کہ آخر ایک درخت میں وہ کون سی ایسی بات ہے کہ اس کے کٹنے پر وہ روتے ہیں جیسا کہ ہے۔ کہنے لگی یہ درخت میری عمر سے زیادہ کا ہے۔ جب میں پیدا ہوئی تو یہ موجود تھا۔ اسے میں نے بچپن میں، جوانی میں ادا ب بڑھاپے میں دیکھا اور اس نے مجھے دیکھا اور اب یہ رخصت ہو رہا ہے۔ بس مجھے انگریزوں کی یہ ادا پسند آئی۔

”ہاں وہ درختوں اور پرندوں سے محبت کرنے والی قوم ہے۔“

”بالکل..... کبھی کوئی نایاب پرندہ کہیں سے آجائے اور برطانیہ کے کسی علاقے میں آکر بسیرا کر لے تو وہاں پہرا لگ جاتا ہے جناب عالی..... اگر وہ پرندہ مذہبہ تو کھرام بچ جاتا ہے..... ہاں وہ درختوں اور پرندوں سے محبت کرنے والی قوم ہے۔“

”نندن میں کس سے ملاقات رہتی ہے؟“

”میں بہت کم باہر نکلتا ہوں..... بس اپنی دکانداری کرتا ہوں اور شام کو کھانا پڑھتا ہوں۔ لیکن ن م راشد سے دوستی تھی..... کبھی بار فیض انونی آئے تو خاص طور پر ایک تصویر اتروائی اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے بھئی تم نہیں رہ گئے ہو واپس نہیں آنا؟“

”یہ جو صاحب ہیں سلمان رشدی“ مڈ نائٹ چلڈرن“ اور ”شیم“ کے مصنف تو یہ کیا چیز ہیں؟“

”بھئی وہ انگریز ہیں، چودہ برس کی عمر میں انگلستان آ گئے رگی سکول، پھر کیمبرج یونیورسٹی، پھر انگریز ہوئے..... ان کا کلچرل میک آپ اور نفسیات میں طویل برطانوی ہے.....“

ایک اور سوال جو بے حد دلچسپ ہے کہ جناب! پاکستان میں ناول کیوں نہیں لکھا جاتا

..... مختلف لوگوں نے اس کے مختلف جواب دیئے..... تمہارا کیا خیال ہے؟“

”بھئی ناول کتنا محنت کا کام ہے اور یہاں ادیبوں کو محنت کی عادت نہیں۔ ناول لکھنے کا سر دیوں اور گریسوں سے کوئی تعلق نہیں۔ لاطینی امریکہ میں تو خوب گرمی ہوتی ہے اور بے پناہ جیس ہوتا ہے اور وہاں بڑا شاندار ناول لکھا جاتا ہے بلکہ سب سے زیادہ لکھا جاتا ہے..... پاکستان میں لوگ ادب میں شارٹ کٹ تلاش کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ محنت کم ہو اور عظمت زیادہ ملے۔ جو افسانہ نگاری اور شاعری کے ذریعے انہیں مل جاتی ہے۔ یہ ہمارا مزاج بن چکا ہے..... اسی مزاج کی وجہ سے ہم دولت کے حصول کے لئے بھی شارٹ کٹ تلاش کرتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کرتے کہ محنت سے تحقیق سے ایک عمدہ سائیکل تیار کر لیں بلکہ ہم یہ کرتے ہیں کہ فوری طور پر باہر کے ملک سے سائیکل درآمد کر لیتے ہیں..... تو فوری عظمت اور مشہوری تو صرف ممکنہ گ سے ہی مل سکتی ہے اور ناول نگار کا میں مقام پیدا کرنے کے لئے محنت اور وقت درکار ہے..... وہی سائیکل والی بات!.....“

”یعنی ناول اور سائیکل کا آپس میں گہرا رشتہ ہے؟“

”بالکل جناب عالی! وہ خوشدلی سے مسکرائے لگا۔“

”پچھلے دنوں کسی نقاد نے کہا تھا کہ تم اور قمرۃ العین حیدر کمزور لکھنے والے ہو اور آداس نیلین اور آگ کا دیا“ بس یونہی سے ناول ہیں۔“

”اچھا؟“ عبد اللہ نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ”میں نے تو نہیں پڑھا..... بہر حال ہم ان نقاد صاحب کو کیا کہہ سکتے ہیں۔ ان کی کوئی اپنی پرا بلمز ہوں گی..... اگر ایک کتاب میں بائیس ہزار کلمہ زندہ رہتی ہے اور اسے دو نسلیں قبول کرتی ہیں اور اس سے اثر لیتی ہیں تو پھر میں اسے کیا کہوں۔ میرا خیال ہے کہ ایسے نقادوں کی تعلیم میں یا ویرن میں کمی ہوتی ہے یا شاید وہ اپنی مدد خود کرنا چاہتے ہیں۔ ہم تو ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔“

”اور وہی سوال جو فیض صاحب نے کیا تھا کہ واپس کب آؤ گے؟“
 ”میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب میں زیادہ وقت پاکستان میں گزاروں گا۔۔۔ اگرچہ پہلے
 اب کاریں بہت زیادہ ہیں اس کے باوجود میں پاکستان واپس آؤں گا۔“
 ”اور ہم دونوں ہنرہ چلیں گے؟“ میں نے نہیں کر کہا۔
 ”ہاں جناب عالی!۔۔۔“ وہ قہقہہ لگا کر بولا: ”اور ہاں کسی کو نے میں بیٹھ کر ہم
 دونوں ایک ایک ناول لکھیں گے؟“

عبداللہ حسین کے ”باگھ“ کی آواز ادب میں گونجتی ہے۔ اس کی ادا کی نے دو
 نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ وہ اپنی دراز قلمی پردہ ڈالنا چاہتا ہے لیکن اس میں بڑی
 طرح ناکام رہتا ہے۔ اگرچہ نقاد اور چارپائی میں بہت فرق ہوتا ہے لیکن عبداللہ حسین
 کو دونوں میں اپنا سا نثر نہیں ملا اور وہ اس حقیقت سے مفاہمت کر چکا ہے؟

”باغ بہاراں“

میں ایک عرصے کے بعد منہ اندھیر سے جناح باغ میں داخل ہو رہا تھا۔
 میں بھی باغوں میں رہنے والوں میں سے تھا۔ برس برس سورج کی پہلی شعاعوں کو میں نے
 سڑکوں اور عمارتوں کی بھائے درختوں اور سبزہ زاروں میں اترتے دیکھا تھا۔ میں نے باغ کو ہر روپ
 اور ہر موڑ میں دیکھا تھا۔ خزاں کی پیلاہٹ میں، بہار کے رنگوں میں، سربا میں شمعڑتے ہوئے گرمی
 میں گھستے ہوئے، بارشوں میں بھیگے ہوئے اور جس میں دم روکے ہوئے، ایک صبح ایسی تھی جب
 ہوا تیز تھیں اور طوفان گردش کرتا تھا، باغ کی سنسان اور اندھیری راہوں پر پافا گردش کرتا تھا اور درخت
 رہے تھے اور میں گہرے گہرے سانس لیتا ان راہوں پر حسب معمول دوڑنا چلا جا رہا تھا۔ جب گر
 بارش اور ہوا کا غنہ ٹھنڈا ہوا۔ تو ایک سکوت تھا اور اس سکوت میں ایک ایسی خوشبو تھی جس کا
 کوئی نام نہیں کیونکہ یہ بے نام خوشبو درختوں کے ٹوٹے ہوئے تنوں، گیلی گھاس، زمین پر گبری
 ہوئی تھیلوں سے مل کر بنی تھی۔ وہ خوشبو چلتی ہوئی گاڑی کی کھڑکی میں نظر آنے والے چہرے
 کی مانند تھی۔ جو بس چلی جاتی ہے اور آپ اسے دوبارہ نہیں دیکھ سکتے صرف یاد رکھتے ہیں۔
 باغ کے سارے درخت میسر شمسات تھے اور یقین کیجئے میں ان سے باتیں کرتا تھا۔۔۔۔۔ پھر
 ایسا ہوا کہ مجھے شہر کے ایک ایسے حصے میں رہائش اختیار کرنا پڑی جو باغ سے بہت دور تھا۔
 مجھے پہل میں نے کوشش کی کہ میں دوری کے باوجود اس سے ملاقات کے لئے پہنچا رہوں۔
 لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا۔ گھر سے باغ تک، باغ سے گھر اور پھر گھر سے شہر کی جانب رزق کی
 تلاش میں اور واپس سے پھر واپس آنا اتنا تھا کہ دینے والا عمل تھا کہ میں نے بے حد دل گرفتہ

ہو کر باغ کو چھوڑ دیا۔ کیونکہ میں تلاش رزق کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ البتہ کبھی کبھار جب بھی تم روزگار سے فرصت ہوتی میں وہاں چلا جاتا۔ لیکن یہ باغ بے حد مختلف ہوتا۔ لوگوں کا ہجوم اور دن کی تیز روشنی درختوں اور پودوں کو نہ حال کر دیتی ہے۔ اور پھر کل صبح مجھے یاد آیا کہ موسم کی حدت بڑھتی جاتی ہے۔ چند دنوں میں بہار مہیا جائے گی اور میں اس دوران ایک مرتبہ بھی باغ میں نہیں گیا۔ چنانچہ میں نے سیر کا لباس یعنی جاگرتا اور ٹریک سوٹ پہنا اور..... میں ایک عرصہ کے بعد منہ اندھیرے جناح باغ میں داخل ہو رہا تھا۔

نیم تاریک راستوں پر قدیم درختوں کے سائے میں میں آہستہ آہستہ چلتے لگا۔ جم کو اب بھاگنے کی عادت نہیں رہی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لے کر اس تازہ اور نرم ہوا کو اپنے اندر کھینچا جس کے لئے میں ترس گیا تھا۔ تب باغ میں رہنے والا ایک کردار میرے قریب گزرا۔ ان صاحب کا نام پتہ نہیں تھا۔ دبے پتے، چھوٹے قد کے اور ہمیشہ نیکر پہنے ہوتے۔ میں نے انہیں ہمیشہ بھاگتے ہوئے ہی دیکھا۔ بڑی خواہش تھی کہ ان حضرت کو کبھی ایک مقام پر کھڑا دیکھوں لیکن ہمیشہ یہی ہوا کہ یا تو سانسے سے بھاگتے ہوئے آئے اور اپنے آپ میں گن چلے گئے اور یا پیچھے سے ان کے قدم سنائی دیتے اور وہ ایک متعین رفتار سے سر ہاتے ہوئے چلتے ہوئے تاریکی میں گم ہو گئے۔ انہیں عرف عام میں بھنبھیری کہا جاتا تھا۔ چنانچہ جب کبھی نظر آنے کو کہا جاتا کہ خلیفہ کرے آج بھنبھیری نہیں آیا۔ اس کے بغیر باغ مکمل نہیں ہوتا۔ آج بھی وہ پچھلے کئی برسوں کی طرح اپنے آپ میں گن میرے قریب سے گزر گئے۔

جب میں جم خانہ گراؤنڈ کے قریب سے گزرا تو دور سے مثنوی مولانا روم کے اشعار ایک مترنم آواز میں بکھرتے سمٹتے میرے کانوں تک پہنچے۔ میں بے اختیار ان شعروں کی سمت ہل ہوا۔ وہاں میر صاحب اپنے مناسب ڈیل ڈول کے ساتھ اچھلتے نظر آئے۔ میر صاحب ٹک ٹیلی فون کے دیوار ڈکھ میں۔ ظاہر ہے ساٹھ سے اوپر کے ہیں۔ روزانہ دس بارہ میل چلتے ہیں۔ سینکڑوں ٹیکس لگاتے ہیں۔ تمام عرصہ اپنے پاؤں پر برتر کے گڈوں کی طرح اچھلتے رہتے

میں اور ملتا آواز سے علامہ اقبال اور مولانا روم کے فارسی شعرا تنی خوبصورتی سے پڑھتے ہیں کہ اگر وقت مجھ سے ملے تو ضرور جھومتے موصوف شاعری سے تو بے بہرہ نہیں لیکن کانوں سے بالکل برے ہیں اس لئے ان سے گفتگو اس طرح ہوتی: میں صدقے تار صاحب! اتنا عرصہ کہاں رہے ہو سنو۔ یاد آجایا کرو فیروز کا دل پہلا رہا ہے۔ بال بچے کیسے ہیں، صحت کیسی ہے۔ آؤ پھر کھاتے دہیں۔ نہیں ہڈی ٹککتے ہیں، نہیں ہاتھ لگاتے آپ کو راضی رکھے، اللہ خوش رکھے میں وہاں چکر لگا کر ابھی آتا ہوں.....

میر صاحب یقیناً رونقی آدمی ہیں۔ میں نے انہیں جب بھی دیکھا اچھلتے دیکھا، بھاگتے دیکھا۔ مسکراتے اور عائن دیتے دیکھا..... ان سے بعد میں ملنے کا وعدہ کر کے میں آگے بڑھ گیا۔ اب مجھے اس درخت کا انتظار تھا جہاں حضرت پگلاڈر پائے جاتے تھے اور وہ وہاں پائے گئے درخت کی ایک بڑی سی ٹہنی کو ٹانگوں میں پروئے وہ حسب معمول اٹے ٹکے ہوئے تھے اور باغ کا نظارہ کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے گردن میدی کی مسکرائے اور پھر بھونکنے میں گن ہو گئے۔ میں ان کا نام نہیں جانتا لیکن باغ کے دیگر رہنے والے انہیں حضرت پگلاڈر ہی کہتے ہیں اور ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ باغ میں آنے والے کچھ تو اپنی الگ حیثیت میں پہچانے جاتے ہیں اور کچھ ہمیشہ گروہ یا منڈلی کی صورت میں ملتے ہیں۔ مثلاً ایک شاہ عالمی اور اعظم مارکیٹ کی منڈلی ہے۔ موٹے موٹے حضرات تیز تیز چلتے ہوئے اور تازہ ترین کاروباری صورت حال پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے۔ آپ اگر ان کے نواح میں چل رہے ہوں تو کچھ اس قسم کی گھنگو سنائی دے گی۔ شیخ صاحب! وہ پتو کی والے پیسے نہیں آئے۔ خواجہ صاحب! اس کتے مال کا کیا بنا! سات روپے پھر آنے لگاتے۔ تو تو پانچ سو تھان بھج دو..... نہ نہ سات روپے سات آنے کا تو سالہا پیدا نہیں ہوتا۔ میں اس گروپ سے قابل فہم طور پر قدرے دور ہی رہتا تھا۔

ایک سیاسی منڈلی ہے جس میں مجلس شورٰی کے ممبر کو تسلیم اور پرانے سیاستدان شامل ہیں۔ جیسے جیسے میں ادا ایک دوسرے پر چڑھیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایک "پہلوان گروپ"

ہے۔ جس کے لیڈر ایک بھاری تن و توش کے پہلوان ہیں اور باتیں پہلوانوں ایسی نہیں کر سکتے۔ دنیا کے ہر موضوع پر بے تکان بولتے چلے جاتے ہیں۔ ایک ناشتہ گرد پ ہے جو نماز کے بعد کسی چھوٹے سے کھوکھے پر ناشتہ کرتے ہیں اور پھر باغ کا رخ کرتے ہیں۔ گرمیوں میں بلوکی صبح کو سلوہ پوری اور تسی وغیرہ باغ میں لاکر پارٹی ہوتی ہے۔

پھر کچھ جوڑے ہیں۔ ایک میاں بیوی ہیں موٹے موٹے پرانے ریوے انجنوں کی طرح چھک کرتے گزر جاتے ہیں۔ پتہ نہیں اتنے برسوں کی سیر کے باوجود ان کا دندن کم کیوں نہیں ہوا۔ ایک گھڑی ساز بھی ہیں جو چودھری صاحب کے گرد پ کے مہر ہیں۔ چودھری صاحب وہیں ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ بہترین یوگا ماسٹر ہیں۔ ایسی ایسی حالتوں میں ملتی ہو جاتے ہیں کہ نہیں نہیں آتا۔ گھڑی ساز ہمیشہ اپنے پیشے کے حوالے سے گفتگو کرتے ہیں۔ مثلاً جناب تار صاحب آپ کی کلائی پر سٹریپ کا نشان ہے۔ سٹریپ بدل دیں ورنہ دورانِ خون میں گڑبڑ ہوگی۔ ڈاکٹر بگ بڈنگ کا بڑا لاکا ایک مرتبہ خراب ہو گیا۔ جاپانیوں نے تو گھڑیوں کی صنعت کا بیڑہ فرق کر دیا ہے..... وغیرہ وغیرہ..... یوگا کے حوالے سے یاد آیا کہ ان دنوں روزانہ ایک صاحب کے قریب سے گزر رہا تھا۔ جو سر کے بل بڑے مزے سے کھڑے ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ قریب جا کر غور سے دیکھا تو حضرت عبدالعزیز خالد تھے۔ پتہ نہیں وہ اس حالت میں شعر بھی کہہ رہے تھے یا نہیں.....

باغ کے مختلف پنج اور کونے بھی مختلف کرداروں اور گرد ہوں کے لئے مخصوص ہیں۔ شروع شروع میں سیر کے بعد میں کسی بھی پنج پر بیٹھ کر سنانے لگتا۔ لیکن ایک اور صاحب بھاگتے ہوئے آئے۔ پنج پر مجھے بیٹھا دیکھ کر قدرے پریشان ہوئے اور میرے ارد گرد منڈلنے لگے اور خامی دیر تک منڈلتے رہے۔

باغ کے ایک حصے میں کبھی گورنمنٹ کا باغ کا ایک بوٹا نیکل گاڑی ہوا کرتا تھا۔ یہ حصہ میرا پسندیدہ ہے۔ کیونکہ یہاں لوگ بہت کم آتے ہیں۔ دو تین پرانے تالاب ہیں۔ جن میں کوئی

ہے اور ایک پرانا ٹوبہ کا بنا ہوا گرین ہاؤس ہے۔ جس پر بہت ہی کوئی جنگلی قسم کی بیل پھاٹی ہوئی ہے۔ اس گرین ہاؤس کے اندر چلے جائیں تو برازیل کے جنگلوں ایسی گھسی اور سبز خاموشی کا احساس ہوتا۔

میں آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ لوگ گزرتے رہے۔ پھر درخت پودے اور بھاڑیاں صبح کی ہلکی روشنی میں ظاہر ہونے لگے۔ پہلے وہ نیم تاریک جنگل تھے اور اب ان کی علیحدہ علیحدہ پہچان اور شناخت سامنے آنے لگی۔ باغ میں رہنے والے لوگ بھی پہلے باغ کا ایک حصہ تھے۔ پرندوں اور ٹہنیوں کی طرح۔ اور اب بھی وہ اگ اگ چہرے ہو گئے۔ یہ وہ وقت تھا۔ جب میں باغ کو چھوڑ دیا کرتا تھا۔ میں باہر جانے والے گیٹ کی طرف چلنے لگا۔ گلابوں کے قطعہ کے اوپر دھوپ اترا ہی تھی اور پنج پر تین بوڑھے بیٹھے ہوئے تھے۔ جن کے لئے گھر بڑھا پا تھا اور باہر زندگی..... بدھا کے کانٹوں سے بھرے ہوئے شاندار درخت کے نیچے ایک لڑکی بھکی ہوئی کچھ تلاش کر رہی تھی۔ پتہ نہیں اس کا کیا کم ہو گیا تھا۔

میں گیٹ سے نکل کر شہر کی سڑک پر آیا تو وہاں ٹریفک کے شور کا اثر دہا میرا منظر تھا۔ میرا موٹر سائیکل اس اثر سے شور اور اعصاب شکن جسم کا ایک حصہ بن گیا۔ میں ایک سرسبز خواب سے اگ بھا اور حقیقت کی دنیا میں گم ہوا۔ کاریں، سکوتر، وگنیں، ٹرک، تیز سیٹیاں اور شور..... زندگی کا شور۔

”ابابیلیں گوا لٹنڈی میں“

ہم سب اس سرائے میں جرگہ دنیا ہے اپنے اپنے کارواں لے کر اترتے ہیں اس میں قیام کرتے ہیں۔ قیام کی مدت ہمارے بس نہیں ہوتی۔ اس کا اختیار اُدپر والے کے پاس ہوتا ہے۔ کئی آتے ہیں، سرائے کے دروازے میں داخل ہوتے ہیں اور لوٹ جاتے ہیں۔ کچھ لٹنڈی میں ہو کر اس کے مکینوں سے ربط بڑھاتے ہیں تو اسی وقت بلاوا آ جاتا ہے۔ بیشتر ایسے ہوتے ہیں جو آتے ہیں اور قیام کے اتنے سامان لے کر آتے ہیں کہ ساری کارواں سرائے ان کے رب اور دبے سے مرعوب ہوتی ہے۔ وہ سامان سو برسوں کا لاتے ہیں مگر پل بھر میں چلے جاتے ہیں۔ کئی مسافر اگر بستر کھوتے ہیں اور ان کو یقین ہوتا ہے کہ وہ تمام شب آرام کریں گے، لیکن نصف شب بلاوا آتا ہے اور ان کو اٹھنا پڑتا ہے۔ خوش قسمت وہ ہوتے ہیں جو اکر اپنا قیام مکمل کرتے ہیں۔ اس دوران اپنے بلاوے کو یاد رکھتے ہیں۔ دوسرے مسافروں کا دکھ دہانتے ہیں اور جب وقت آتا ہے تو تیار ہوتے ہیں، اٹھتے ہیں اور مسکراتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ نہ چہرے پر رنج نہ طال۔ وہ اس کی مرضی کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور رخصت ہو جاتے ہیں۔ ہر شخص ایک کارواں ہوتا ہے۔ جس میں دکھ سکھ اور کامیابی کے ساتھی ساتھ آتے ہیں۔ کچھ لوگ پورے قیام کے دوران دکھ کی رفاقت ہی میں جیتے رہتے ہیں۔ کوئی محرومی کے پاس منت گزارتا ہے اور کوئی سکھ اور کامیابی کے قریب رہتا ہے لیکن بلاوا آنے پر سب کو جانا ہوتا ہے۔ سرائے میں قیام کا ایک اور سال مکمل ہوا اور اب اس کے دروازے پر نئے سال کی دھوپ چمکی ہے۔ اس کے علاوہ مکین کم ہوئے جنہیں ہم جانتے تھے۔ جن کے دم سے ہماری رونقیں

جنیں۔ ہم ان کا سوگ مناتے ہیں۔ اس میں نئے مکین بھی آئے جن کے دم سے کل رونقیں ہوں گی۔ ہم انہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ کوئی سال نیا یا پرانا نہیں ہوتا۔ ہاں دکھ پرانے ہو جاتے ہیں، ہر سال قیام ہو جاتا ہے۔ سورج نکلتی کے پھول کھلے رہتے ہیں لیکن ان کا رخ ہماری جانب نہیں رہتا۔ اور مکھ نئے ہوتے ہیں اُدپر والے کی عطا کردہ نعمتوں کے سکھ..... روشنی، ہوا پانی اور ہوا دھن..... اور پرندے.....

پہلے سال کے آخری دنوں ایک روز بچی پان فروش میری دکان میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک پرندہ تھا۔

”باؤ بی یہ کون سا پرندہ ہے؟“

پرندہ معصوم تھا، خوبصورت تھا اور ڈرا ہوا تھا۔

”تم اسے کہاں سے پکڑ لائے ہو؟“

”باؤ بی باہر تو دیکھو..... پوری گوا لٹنڈی میں یہ پرندے آئے ہوئے ہیں۔“

گوا لٹنڈی میں پرندے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

”آپ ہر وقت سر جھکائے کاغذوں کو دیکھتے رہتے ہو کبھی باہر بھی دیکھا کرو..... باہر

پرندے ہیں۔“ میں باہر آیا تو دم بخود رہ گیا۔ بچی سچ کہتا تھا، گوا لٹنڈی کے بازار میں سینکڑوں

پرندے اڑ رہے تھے۔ وہ دکانوں کے چھوٹے پر بیٹھے ہوئے تھے، شرک پر بیٹھے گندے پانی پر اڑا رہے

گندے تھے..... یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی سدا بہار سرسبز اور گھنے جنگل میں ہیں۔ ان کو اس

پاس کی گندگی اور گھٹن کا احساس تک نہ تھا اور وہ سینکڑوں کی تعداد میں تھے..... اور میں ان

کلام نہیں جانتا تھا۔ بھولا ریمی والا میں وہاں کھڑے دیکھ کر مسکراتا ہوا آ گیا۔

”اے چھوڑ دے اس معصوم کو پرندوں کو پکڑنے نہیں..... چھوڑ دے۔“

بچی نے پرندے کے پرروں کو ایک بوسہ دیا اور ہوا میں اچھال دیا۔

میں ابھی تک حیرت زدہ تھا۔ ”نہیں بچی مجھے ان پرندوں کے نام کا علم نہیں۔“

”میں بتاؤں باؤرجی! بھولے نے ہنسنے ہوئے کہا۔ یہ جی ابا بیلیں ہیں۔“
 ”ابا بیلیں؟ گوالنڈی میں؟ اور سیکڑوں کی تعداد میں؟“

”ہاں باؤرجی یہ ہر سال انہی دنوں میں آتی ہیں اور سنا ہے کہ خوش قسمتی لاتی ہیں۔ آپ نے انہیں پچھلے سال نہیں دیکھا تھا۔ نہیں بھولے میں کاغذوں پر سر جھکائے بیٹھا رہتا ہوں اور اصحاب نہیں دیکھتا۔۔۔۔۔“

”باہر دیکھا کرو جی! بھولا اپنی ریڑھی پر کھڑے کسی گاہک کو جھگٹانے چلا گیا۔ پچھلے سال چلا گیا اور میں حیرت سے ابا بیلوں کو دیکھنے لگا۔۔۔۔۔ ہاں وہ یقیناً ابا بیلیں ہی تھیں۔۔۔۔۔ بچے وہ اٹالوی لوگ گت یاد آگیا جس کے بول یہ ہیں۔“

جب موسم بہار میں ابا بیلوں کی ڈالیں

جب تم میرے پاس لوٹ آؤ گے۔

کیسے ترانو کے ساحل کو واپس لوٹیں گی!

یہ وہی دن ہو گا۔۔۔۔۔

میں ابا بیلوں کو اٹالیہ، لبنان اور ایران میں تلاش کرتا رہا اور وہ یہاں تھیں، اپنے پاکستان میں یہاں گوالنڈی میں اس کی چھتروں اور میٹروں پر پروار کرتی ہوئی سیکڑوں کی تعداد میں اور میں انہیں پہچان نہ سکا تھا اس لئے کہ میں اپنے کاغذوں سے سر اٹھا کر باہر نہیں دیکھتا تھا تو اپنے ملک سے باہر دیکھتا تھا۔۔۔۔۔ وہ ہر سال گوالنڈی میں آتی تھیں اور میں اپنے آپ میں گن رہا۔۔۔۔۔ میرا خیال تھا کہ وہ صرف اٹالیہ میں کیسے ترانو کے قبے میں ہی اترتی ہیں لیکن وہ ہر آگن میں بھی آتی تھیں۔ صرف میلادھیان نہیں جاتا تھا۔ کاروان سرائے میں قیام کرنے والے بیشتر مسافر میری طرح ہوتے ہیں۔ وہ اپنے مختصر قیام کے دوران سر اٹھا کر سوہنے رب کی قدرت نہیں دیکھتے درنہ خوش قسمتی کی علامت اور نیا سال مبارک کہنے کے لئے آگنوں میں ابا بیلیں اترتی ہیں۔ یہی نواہر کہنے کے لئے۔

”سکھ آئے ہوئے ہیں“

میرے والد صاحب کا کہنا ہے کہ ایک زمانے میں ان کو بٹاز عم تھا کہ دوسرے جاؤں کی طرح کم از کم تارڑ جاٹ سکھوں سے مسلمان نہیں ہوتے بلکہ وہ کچھ اور تھے (پتہ نہیں کیا تھے) لیکن ایک دن خدا کا کرنا کیا ہوا۔ اور یہ کوئی پچاس برس پیشتر کا قصہ ہے کہ ایک نہایت گزٹیل قسم کا بوڑھا سکھ ان کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ پتر تیرا نام کیا ہے۔۔۔۔۔ رحمت خان ہے! والد صاحب نے کہا کہ جن ہاں یہی میرا نام ہے۔ بوڑھے سکھ نے قریب ہو کر پوچھا، تارڑ ہو! انہوں نے سر ہلا کر اقرار کیا کہ بے شک تارڑ ہوں۔ اس پر سکھ بزرگ بے حد مسرور ہو کر بولے، تو پھر آٹھ ادرا اور مجھ سے گلے مل میں بھی تارڑ ہوں۔۔۔۔۔ والد صاحب اس دفعہ کے بعد، خامی مدت تک آپ سیٹ رہے کہ سکھ بھی تارڑ ہوتے ہیں۔

اب خدا کا کرنا کیا ہوا اور یہ کوئی تین چار دن پہلے کا قصہ ہے کہ میں آرٹس کونسل کے پلکار ہال میں ایک کتاب کی رونمائی کے سلسلے میں ہونے والی طویل تقاریر سنتے سنتے ادنگھ رہا تھا کہ کہیں سے ایک سکھ وارد ہو گیا۔ سیدھا میرے پاس آیا اور کہنے لگا، بھائی جی، آپ مستنصر حسین تارڑ ہو؟ میں نے اقرار کیا تو بولا۔ پھر اٹھو اور مجھ سے گلے ہو۔۔۔۔۔ ابھی ایک کھبانی سی مسکراہٹ میرے لبوں پر تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اٹھوں یا نہ اٹھوں، تو اس سکھ نے مجھے دباؤ نہ کر گئے لگایا اور کہنے لگا، بھائی جی مجھے آپ کی فلاں کتاب بے حد پسند ہے۔۔۔۔۔ مجھے اگرچہ اس کے یوں گلے لگا لینے پر بھی اعتراض تھا۔ لیکن ایک سکھ کا مجھے بھائی لگنا بھی مجھے آپ سیٹ کر رہا تھا۔۔۔۔۔ میں نے ایک مناسب وقفے کے بعد ان کی گرفت

سے علیحدہ ہونے کی کوشش کی اور میں اس کوشش میں کامیاب ہونے کو تھا کہ انہوں نے ابھی
دل نہیں بھرا بھائی جی کہہ کر مجھے پھر اپنی بارش آغوش میں لے لیا..... میں نے ان کی بیگماری کے
ادھر سے جائزہ لیا تو بیشتر سامعین مقرر کی تقریر سننے کی بجائے اس بیگماری سے لطف اندوز
ہو رہے تھے..... بہر حال میں نے بڑی مشکل انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ فی الحال میرے
ساتھ والی نشست پر تشریف رکھیں اور فنکشن کے اختتام تک اس بیگماری کو ملوثی کر دیں۔
یہ نہ دیکھ سگھ چا کہ تھے جو مشرتی پنجاب کی کسی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور پنجابی میں ڈاکٹریٹ
کے علاوہ فارسی میں بھی ایم اے کی سند رکھتے ہیں۔

اور چاند صاحب واحد سگھ نہیں ہیں جو لاہور کی سڑکوں پر آوارہ ہو رہے ہیں۔ ان
دنوں ہر جانب سردار اور سرداریاں اور ان کے بچے وہ بھی سگھ ہوتے ہیں انارکلی
بال روڈ اور شاہ عالم مارکیٹ میں گھومتے نظر آتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں وہی حیرت ہوتی
ہے جو لندن کو پہلی مرتبہ دیکھتے ہوئے میری آنکھوں میں تھی۔ ان کا بس نہیں چلتا۔ وہ وہ
ہلورے لاہور کے بازار اور مارکیٹ خالی کر دیں۔ دائرہ کو لمر، خواتین کے سوٹ، گھڑیاں،
ریڈیو، میک اپ کا سامان، غرض کہ وہ ہر شے خرید رہے ہیں۔ اگلے روز میں اپنے قریبی
سٹور پر گھر پر مزدوریات کی چند اشیا خریدنے کے لیے گیا تو دکاندار نے کہا کہ فلاں صابن تو
نہیں ہے میں نے پوچھا کون نہیں ہے، کہنے لگا جب سگھ آئے ہوئے ہیں میں نے سوچا یہاں اگر وہ اسٹانڈ وغیرہ کرتے
ہیں تو اس کے لئے دکان ہوتا ہے لیکن معلوم ہوا کہ نہیں۔ پاکستان ٹیلیوژن پر جتنے صابن پاؤڈر
اور دیگر اشیا رکے اشتہار چلتے ہیں وہ سب سگھوں کے فیورٹ ہیں اور ان کی آمد پر پورے
لاہور میں ان کا شاک ختم ہو جاتا ہے۔

بیٹن روڈ پر ایک سگھ خاندان سے ملاقات ہوئی جو نوم کے گدے سر پر اٹھائے چلا
جار ہاتھا۔ میں نے پوچھا ہندوستان میں نہیں ملے، سردار صاحب کہنے لگے، ملے ہیں پر بی
ودیا نہیں ملے..... سردار نے گدے کے علاوہ پاکت فی کپڑوں کا ایک ہندو آٹھا

رکھا تھا۔ بچوں نے پاکستانی جینین پہن رکھی تھیں اور آٹس کریم کھا رہے تھے۔ دو تین برس
بیشتر ایک کرکٹ میچ کے موقع پر ایک ہندو صحافی لاہور آئے اور مجھ سے ملنے کے لئے بھی
آئے۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں تو نہایت فرائضی سے اپنے ملک کے لئے
جین گنگو کریم تصامین موصوف نہایت احتیاط پسند تھے اور ہندوستان کو دنیا کا بہترین
ملک ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس پر مجھے بھی تاؤ آگیا اور میں نے تمام تر برل انرم
بالائے طاق رکھ کر ان سے سوال و جواب شروع کر دیئے۔ دورانِ گفتگو ان کی تان اسی بات
پر ٹوٹی کہ جناب آپ تو سوئی جیسی چھوٹی سے بھی درآمد کرتے ہیں اور ہم ہوائی جہاز اور ٹینک
بنارہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ان کی دھرم پنی جواب تک خاموش بیٹھی تھیں کہنے لگیں ہاں
ہوائی جہاز تو بن رہے ہیں ہمارے ملک میں شرمابی ساٹن کریم بنتی ہے، دائرہ کو لمر بننے
ہیں..... لاہور والے تو گنتا ہے شہزادے ہیں۔ اچھا کھاتے ہیں، اچھا پہنتے ہیں بھوکنا
ہے ہوائی جہازوں کو..... لوگ سگھی ہونے چاہئیں اور لوگ پاکستان میں سگھی ہیں..... اس
پر شرمابی شرمندہ ہو گئے اور کہنے لگے۔ چلیے پھر ہمارے ساتھ چل کر کچھ شاپنگ ہی
کر دیجئے۔ سارے محلے کی فرمائشیں ہیں۔

سگھ حضرات جو پاکستان آتے ہیں اس محلے میں بہت کھرے اور سیدھے سادے
ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جناب لاہور آنے کے لئے جن کا نام نکل آئے اُسے محلے والے آکر
مہیا کی دیتے ہیں۔ انڈیا میں کیسے بہت ہیں، پان بہت ہیں، کھد بہت عمدہ ہے۔ لیکن جس
ٹھے پر میڈان پاکستان لکھا ہوا اُسے باقاعدہ ڈس پے کیا جاتا ہے۔ وہ لاہور پہنچے ہی انارکلی
دیکھنے کی خواہش کرتے ہیں۔ جس طرح پیرس پہنچنے پر لوگ سیدھے شانزے لیڑے کا رخ
کرتے ہیں۔ ہمارے ٹیلی ویژن کا ان کی نئی نسل پر اتنا اثر ہے کہ وہ ہمارے نمود کا سٹروں اور
اداکاری کی طرح خالص اردو بولنے کی کوشش کرتے ہیں ٹیلی ویژن کے اداکاروں کو ملنے
کے بارے میں غیر قانونی طور پر سرحد عبور کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ چنانچہ امرتسر کی ڈیڑن کے

آغاز پر جو اتفاقی یلغار کا فائدہ اٹھا تھا۔ اب حالت یہ ہے کہ ہمارے ڈراموں کی کیسٹیں بلیک میں فروخت ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ یہ نہیں کہ بھارت پاکستان کے مقابلے میں بالکل ہی گیا گزرا ہے۔ ٹھیک ہے انہوں نے بھی اپنے لئے بہت کچھ کیا ہے لیکن ایک مدت کے بعد یہ دیکھ رہے ہیں کہ بھارتی اب پاکستان کو رشک کی نظر دل سے دیکھتے ہیں اور سکھ پاکستانی حکومت سے بے صبر خوش ہیں کہ انہیں پاکستان آنے کے لئے بے شمار سہولتیں دی جا رہی ہیں۔

بہر حال میں تو آرٹس کونسل کی اس تقریب کا تذکرہ کر رہا تھا جس میں ایک سکھ اندر سنگھ جانہ صاحب میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس دوران وہ کنول مشاق کے ساتھ کھسک پھسک کر تے رہے۔ تھوڑی دیر بعد پھر اٹھے اور کہنے لگے۔ تاڑ صاحب اٹھو اور مجھے لگے ملو اور اس کے ساتھ ہی ایک مرتبہ پھر انہوں نے مجھے دہلی کوچ لیا۔ سنا تھا کہ جٹ کا چٹا بڑا سمٹ ہوتا ہے لیکن یہاں تو چٹا سکھ کا تھا جو بہت ہی شدید تھا۔ بہر حال نارغ ہو کر کہنے لگے۔ مجھے تو اب پتہ چلا ہے کہ فلاں ٹی وی سیریل آپ کی مکھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد بیٹھ گئے کچھ لمحوں بعد یکدم رنج روشن میری جانب کیا اور خوش ہو کر کہنے لگے ادو، مجھے تو ابھی ابھی کنول نے بتایا ہے کہ آپ نے فلاں ڈرامے میں تو اداکاری بھی کی تھی اور وہ ڈرامہ مجھے۔۔۔۔۔ اٹھو اور مجھے لگے ملو۔۔۔۔۔ ہم اب تک اتنی مرتبہ بللیگر ہو چکے تھے کہ حال میں کوئی خاتون اندر بھی کر سکتی تھیں۔ بہر حال مجبوری تھی۔ اس لئے کہ ایک نیم دلانہ قسم کا چٹھا ڈال کر انہیں بیٹھنے کو کہا اور دل میں تیرہ کر بیا کہ اب نہیں اٹھوں گا ابھی چند ہی لمحے گزر رہے ہوں گے کہ چاند صاحب اپنی نشست سے اٹھے اور ہاتھ پھیلا کر بولے، اٹھو اور مجھے لگے ملو۔ میں نے کہا چاند صاحب آپ یقیناً بہت اچھے سکھ ہیں۔ جو میری حوصلہ افزائی کی خاطر مجھے بار بار جتھے مارتے ہیں۔ لیکن اب نہیں اٹھوں گا۔ آپ بتائیے کہ بات کیا ہے۔ کہنے لگے۔ میں گمرد دواسے واپس جا رہا ہوں چنانچہ مردنا مجھے بللیگر ہونا پڑا۔ میں نے پوچھا، سیدے گمرد دواسے واپس جا رہے ہیں؟ کہنے لگے، نہیں پہلے انارکلی سے دائرہ کو خرید دیں گا کیونکہ ہمارے ہاں اب یہ کہا جاتا ہے کہ کیس، کچھ، کٹرا، کرپان کے علاوہ

ایک سکھ کی پہچان کو کر بھی ہے اور میں ایک مکمل سکھ بن کر واپس جانا چاہتا ہوں۔ دائرہ کو رکھا استعمال تو سمجھ میں آتا ہے۔ یعنی خاص طور پر ان دنوں سکھ حضرات نوم کے لئے کپڑے خرید رہے ہیں۔۔۔۔۔ شاید اس لئے کہ آج کل ان کے لیے وہاں زمین سفت ہو رہی ہے۔

”لوٹ مار سیل“

اس شام میں گھر بیچا تو بیگم ایک انتہائی شاندار کا مدار سارھی میں بیس کنڈھوں ایک نئی شال ڈالے ڈرائیگ روم میں بیٹھی اور اس کے سامنے میز پر کافندی اور موئی لفافوں کا ایک ڈھیر تھا۔ بچے کمر سیوں پر براجمان تھے۔ اور نئے سویٹروں اور پتلونوں میں بیس تھے یہی تبدیلی حیرتوں میں گم ہوا کہ کہاں تو ایک پتلون خریدنے کے لئے کئی ماہ کی منصوبہ بندی درکار ہوئی ہے اور کہاں یہ کہ ہر جانب عید کا سماں ہے اور نئے کپڑوں کی اُجلی خوشبو ہر سو پھیلی ہے۔

”یہ سویٹر تمہارے لیے“ بیگم نے میز پر سے ایک لفافہ اٹھا کر اس میں سے ایک ویز اُٹھائی سویٹر نکالا اور اس کی باتوں کو میری باہولہ پر پھیلاتے ہوئے کہا۔

”شکریہ! لیکن اب تو موسم گزر نہیں گیا اتنے موٹے سویٹر کے لیے؟ میں نے بیان کیا....

”اگلے سال کام آجائے گا۔“ اس نے کہا۔ اور اس برس بھی اگر مری میں برف پڑی ہوگئی تو چند روز تو پہنا جاسکتا ہے۔ تم نے میری سارھی کے بارے میں کچھ نہیں....

”بہت قیمتی گنتی ہے۔“ میں نے ہسکلاتے ہوئے کہا۔ ”کتنے کی ہے؟“

”اور یہ شال کیسی ہے؟“ بیگم نے اپنی شال پر ہاتھ پھرتے ہوئے کہا کچھ کچھ پیار کی نظروں سے میری جانب دیکھا۔

”یہ بھی قیمتی گنتی ہے۔“ میں مزید ہسکلا یا۔ ”کتنے کی ہے؟“

”تم نے بچوں کے سویٹر نہیں دیکھے، اٹھو بچو! ابو کو سویٹر دکھاؤ۔“

سب بچے اُٹھے اور اپنے اپنے سویٹروں کی نمائش کر کے پھر بیٹھ گئے۔

”ڈرائیگ روم کا پردہ کیسا ہے؟“ بیگم نے ایک شہزادی کی طرح شاہانہ طریقے سے ہاتھ لگایا۔ واقعی نیا پردہ تھا اور بہت خوب تھا اور یہاں پھر مجھے پوچھنا پڑا کہ کتنے کا ہے اور بیگم یہ سوال سن کر صرف مسکرائیں کہ اے نادان ایسی بیش بہا اشیاء کی قیمتیں ہوجھ کر اپنے گھٹیا ذوق کی نمائش کرتا ہے۔

”اور یہ سویٹر بھی تمہارے لئے ہے۔“ بیگم نے ایک اور سویٹر لٹا دیا۔

”میں بیگم جی یہ کیا ہو رہا ہے....؟“ میں نے گھبرا کر پوچھا۔ یہ سویٹر بہت گرم ہیں اور سردیاں ختم ہو چکیں۔ تمہاری سارھی جو ہے تو اس کا بھی کچھ فیشن نہیں۔ یہ پردے بھی پہنانے لگ رہے ہیں اور تمہاری شال بھی اتنی گرم اور بھاری ہے کہ اس کے وزن سے تمہارا سانس اکھڑنے کو ہے اور ماتھے پر پسینے کے قطرے ہیں۔ یہ آرڈر آف فیشن اور سبزن کپڑے خریدنے کی جگہ کیا ہے؟“

”اس جوتے کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ بیگم نے میز کے نیچے سے ایک برانڈ نیا ہوتا نکالا۔

میں یکدم خوفزدہ ہو گیا کہ شاید یہ جوتا میری جانب پھینکنے کے لئے اُٹھایا گیا ہے لیکن معلوم ہوا کہ یہ جوتا میرے لئے تو تھا۔ مجھے واقعی ایک سردانہ جوتے کی اشد ضرورت تھی لیکن یہ والا جوتا میرے سائز سے تندرے بڑا بلکہ خاصا بڑا تھا۔ بنایا عالم چنا کے لئے تھا اور شاید وہ اسے بنے نہیں آیا تو اسے بیگم نے آئیں۔

”کوئی بات نہیں اگلے سال بُڑا آجائے گا۔“ بیگم نے قہقہہ دی۔

”اگلے سال؟“ میں نے حیران ہو کر کہا۔ ”بیگم میں نہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں نے جتنا بڑا

ہونا تھا تو چکا۔ اب تو میری جھلک کا نمبر بڑا ہو سکتا ہے۔ میری تو نمبر بڑی ہو سکتی ہے لیکن میں بڑا نہیں ہو سکتا یہ جو تاؤ مٹانے ہو گیا اور کیا میں پوچھ سکتا ہوں یہ آؤٹ آف فیشن....

”ایک تو تمہارے لیے اور تمہاری آل اولاد کے لیے اتنی مصیبتوں سے بچنے کے لیے خرید کر لائی ہوں اور آؤ پر سے ناراض ہوتے ہو۔ بیگم نے منہ بھلا لیا۔“ تمہیں پتہ ہے کہ یہ بالکل مفت میں آئے ہیں....

”مفت میں آئے ہیں تو بڑے نہیں۔“

”بالکل مفت میں تو نہیں لیکن تقریباً۔“

”لیکن یہ آئے کہاں سے؟ میں نے تنگ آکر کہا۔“

”سیل۔ سیل کلیرنس سیل۔۔۔۔۔ ایک بچے نے کہا۔“

”اصلی لوٹ سیل۔۔۔۔۔ بلکہ لوٹ مار سیل۔“ دوسرے نے آواز لگائی۔

”آؤنے ہونے سیل اور یاراں مینے ساڑے تے ایک ٹھینہ تو باڈھا۔“ تیسرا بھی

بول اٹھا۔

”یہ سارے کپڑے میں نے سیل میں خریدے ہیں۔“ بیگم نے ہنس کر اصطلاح کی۔

”بالکل سستے اور تقریباً مفت بلکہ دس کلو دیسی گھی بھی لائی ہوں۔ اس کی بھی سیل

گئی ہوئی تھی۔ باقی سارا کچھ اگلے سال کام آجائے گا اور گھی کے پراٹھے کھلاؤں گی تمہیں۔“

یکدم انہیں کچھ یاد آیا۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ بیٹھتے بیٹھتے ڈولنے لگا اور میں نے بیگم سے

کہا۔ ”وہ آج صبح میں نے پوری تنخواہ جو تمہیں دی تھی پورے بیٹے کا خرچہ وہ۔۔۔۔۔“

”بس اسی کا تو یہ سامان آیا ہے۔ اب تم اس ماہ کے لیے کہیں سے خرچہ پانی کا بندوبست

کرو۔“ بیگم نے کہا۔

”اصلی لوٹ سیل، بلکہ لوٹ مار سیل۔“ میں نے ایک موٹے پردھیر ہوتے ہوئے کہا۔ بیگم اب

دوسری سیل لگاؤ۔ اگرچہ میں آؤٹ آف فیشن اور آؤٹ مینز ہوں لیکن شاید بک جاؤں۔“

”بونی بے ایمان ہے“

”بونی بے ایمان ہے۔“

یہ بیان کسی غلی اداکارہ کے بارے میں نہیں ہے جس کا نام بونی ہے اور نہ ہی یہ کسی گیت کا اداکار ہے بلکہ یہاں بونی سے مراد لندن پولیس کا روائسی خوش اخلاق، خوش گفتار اور ایماندار سپاہی ہے۔ جسے انگلستان ولے پیارے ”بونی“ پکارتے ہیں۔ تو پھر یہ بونی بے ایمان کی طرح ہو گئی۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے ہو گیا۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ سابق برطانوی پولیس کھنڈ کی سربراہیات ایک خود مختار تنظیم نے چار سال کی تحقیق کے دوران حاصل ہونے والی شہادتوں پر مبنی رپورٹ میں کہا ہے کہ برطانوی پولیس نسل پرست، شرابی، زانی اور گانگوانہ کرنے والے افراد پر مشتمل ہے۔ گیارہ موصفات پر مبنی اس رپورٹ کی چار جلدیں ہیں لیکن اس کا سبب باب صرف ایک فقرے میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ”بونی“ بے ایمان ہے۔

یہ خبر ان افراد پر مبنی بن کر گرے گی جو بات بے بات پر بونی اقوام کی ایمانداری

اور خوش اخلاقی کے حوالے دیتے ہیں اور اپنے قومی اداروں اور ملکی اخلاقیات پر برستے

میں اس قسم کے قسطنطنیہ مغرب کوئی ایسا موقع ملتا ہے کہ وہ دیکھتے۔ جب وہ ٹھنڈی

سائیں بھر کر کہتے ہیں۔ ”اچھا ہمارے مقابلے میں کیا تو میں ہیں۔“ انگریز کو دیکھئے۔۔۔۔۔ میں

ایک مرتبہ برکس میں جا رہا تھا کہ راستہ بھول گیا۔۔۔۔۔ امریکیوں کی ایسی خوش اخلاقی۔۔۔۔۔

صاحب کا دیار کرنا تو وہ جانتے ہیں اور ہم۔۔۔۔۔ بے ایمان، نیکے اور اخلاقیات سے عاری

ہم دراصل جو مغرب غربہ قسم کے ملکوں کے باشندے ہیں ایک عربی کے ملکوں کے بعد ابھی تک احساس کمتری کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ ادھر میں کچھ بھی نظر نہیں آتا اور ادھر سب اچھا ہے۔ ہم میں سے بیشتر "متاثرین مغرب" ہیں۔ پاکستانی پورے پر غیر ملکی مہر لگی ہو تو..... واہ واہ سبحان اللہ کیا ڈیزائن ہے۔ کیا میٹرل ہے۔ میں نے تو دور سے ہی دیکھ کر یہ کہہ دیا تھا کہ دلائتی ہے۔ جس شے پر بھی ساختہ پاکستان کی بجائے کسی ایرے غیرے ملک کا نام درج ہو ہم فوراً مرتبے میں چلے جاتے ہیں اور داد کے ڈونگے برسائے گئے ہیں۔ میں ایک ایسے صاحب کو جانتا ہوں جو انگلینڈ سے نہایت قیمتی قسم کے تین ریکٹ خرید لائے تھے اور یہاں آکر معلوم ہوا کہ پاکستان کے ہی بنے ہوئے ہوئے ہیں۔ مجھے بھارت سے آئے ہوئے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے اور وہ ہماری بیشتر مصنوعات کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں کہ اچھا اچھا آپ کے ہاں تو در آمد کرنے پر پابندی نہیں ہے۔ یہ مال اپورٹ ہو گا اور جب انہیں بنایا جاتا ہے کہ یہ کپڑے کے تھان جو آپ بنل میں داب کر رہے ہیں اور یہ آرائش کا سامان درجن کے نام نہایت دلائتی ہوتے ہیں، اور یہ وائر کو لو وغیرہ سب اس بے چارے پاکستان میں ہی بنتے ہیں تو انہیں بے حد پریشانی ہوتی ہے۔ انہیں تو پریشانی ہونی چاہیے۔ لیکن اپنے ہاں کے متاثرین مغرب کو کیا کہئے گا جو پھر بھی اپنی مصنوعات کو دیکھ کر ناک بھونچ رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ دور سے ہی پتہ چلتا ہے کہ پاکستانی ہے.....

میں ایک مرتبہ دلائت سے پاکستان آ رہا تھا چنانچہ شاہنگ کے لئے پکا ڈلی سرکس کے قریب واقع ایک فرم "سوان ساریز لمیٹڈ" میں چلا گیا۔ میں نے اپنے خون پسینے کی کالی بکھرے پسینے کی کماٹی سے کیونکہ میں دلائت میں کبھی زخمی نہیں ہوا تھا ایک فرج اور ایک ڈیک کا آرڈر دیا۔ رقم ادا کی اور ان سے رسیدیں حاصل کیں اس وعدے پر کہ وطن

چننے پر مجھے ان اشیاء کے سپنگ ڈاکومنٹ روانہ کر دیئے جائیں گے اور یہ وہاں کا ممول ہے کہ آپ رقم ادا کر کے رسید حاصل کر لیتے ہیں اور خرید کردہ اشیاء آپ کے نام پر شپ کر دی جاتی ہیں۔ چنانچہ میں وطن واپس آ گیا اور یہاں بیٹھ کر سپنگ کے کاغذات کا انتظار کرنے لگا اور تقریباً ایک سال تک کرتا رہا۔ مودبانہ خطوط روانہ کئے۔ دھکی آمیز تاریخیں بھیجیں مگر ادھر سے خاموشی۔ چنانچہ تنگ آ کر اپنی ایک کلاس فیلو بڑی این کو خط لکھا کہ بی بی یہ حالات ہیں تم ذاتی طور پر اپنے انگریز بھائیوں سے طوا و دم از کم میری رقم واپس دلادو۔ اگلے ہفتے میرے نام کا چیک آ گیا۔ این نے خط میں لکھا کہ مجھے تمہاری رقم واپس لینے کے لئے تھوڑی سی غلط بیانی کرنا پڑی تھی جس کے بغیر وہاں کام نہ چلتا اور وہ تھوڑی سی غلط بیانی یہ تھی کہ میں مسٹر شیر کی بیوی ہوں، لاؤس سے خاندان کی رقم۔ بہر حال اللہ بھلا کرے اس نیک بی بی کا اس نے چیک بھیج دیا۔

میں نے بھی چیک جب کیش کروانے کے لئے انگلستان روانہ کیا تو فوری طور پر "باؤنس" ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ اکاؤنٹ میں رقم نہیں ہے۔ بہر حال دوسری مرتبہ انگلستان جانے کا اتفاق ہوا تو میں کھولتا ہوا "سوان ساریز لمیٹڈ" کے دفتر جا پہنچا اور رسیدیں اور چیک وغیرہ الگ کے سامنے رکھ کر اپنی رقم کا مطالبہ کیا۔ اس پر ڈائریکٹر صاحب مسکرائے اور کہنے لگے۔ "میں بے حد شرمندہ ہوں تارڑ صاحب لیکن جس فرم کے ساتھ آپ نے کاروبار کیا اس کا نام "سوان ساریز لمیٹڈ" تھا جسے آفیشل لیکوڈیٹر دیوالیہ قرار دے چکے ہیں۔ اب اس فرم کا نام "سوان براڈمنڈ لمیٹڈ" ہے۔ میں نے مزید کھولتے ہوئے کہا کہ جناب آپ ہی تو ڈائریکٹر تھے جنہوں نے مجھ سے رقم وصول کی تھی۔ انہوں نے میری ہمنیزی کا بالکل بڑا نہ مانا اور انگریز انصافیات کا عمدہ مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ جناب آپ درست کہتے ہیں لیکن برطانوی قانون کے مطابق وہ فرم دیوالیہ ہو چکی اس لئے آپ اپنی رقم کا پانچ فیصد حصہ عدالت سے رجوع کر کے حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم "سوان ساریز کی بجائے" "سوان براڈمنڈ" ہیں جو بالکل مختلف

فرم ہے۔ البتہ میں وہی ہوں آپ کا خادم..... فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں، کوئی فرسخ یا ڈمک وغیرہ خریدنا ہو تو حکم دیجئے..... میں اسی طرح کھول آٹھا ہوں جب کوئی شخص انگریزوں کی عمدہ اخلاقیات کے بارے میں مجھے درس دیتا ہے۔ تو جناب آئندہ اگر کوئی صاحب آپ کو انگریز اور یورپی اخلاقیات کے بارے میں پیکر دیں تو انہیں سیر پاس بھیج دیجئے گا۔ میرے پاس اور بھی بے شمار کہانیاں ہیں..... بولیں

سے زیادہ ایماندار نہیں ہے۔

”جانی جوکر اور پاکستان“

استنبول کے ایک قہوہ خانے میں میری ملاقات جانی جوکر سے ہو گئی۔ وہ پچھلے دو گھنٹے سے کرسی پر بیٹھا انگلیاں چٹخا رہا تھا۔ اور میز پر رکھی چینی پھانک رہا تھا کیونکہ وہ بالکل پھانک تھا اور ہائے پینے کے لئے اس کی جیب میں پیسے نہ تھے۔ چنانچہ میں نے اس کی سفید رنگت سے مرعوب ہو کر اسے اپنی میز پر مدعو کر لیا اور اس کے لئے چائے منگوا لی جانی جوکر ایک انگریز ہی تھا۔ چائے کے دو کپ چڑھانے کے بعد وہ تیز نگ میں آ گیا اور کہنے لگا، کہاں کے ہو؟ میں نے کہا، پاکستان! اس پر وہ مسکرا کر بولا، جنت میں نے پوچھا کونسی جنت، کہاں کی جنت۔ کہنے لگا، پاکستان جنت ہے..... میں نے کہا کہ اسے بھائی ہی کہاں کی بات کرتے ہو۔ پاکستان کہاں کی جنت ہے نہایت فضول سا ملک ہے، پس ماندہ غلیظ اور بہت ہی یہودہ، کیا بات کرتے ہو۔ اس پر جانی جوکر مسکرایا اور بولا، میں تمہارے ملک ہی کی بات کرتا ہوں۔ تم جنت میں رہتے ہو۔ میں اس کی اس بات پر ہلکا سا کیر پکڑ لیا کہتا ہے۔ کیوں میرے ملک کو جنت بتا رہے؟ تب مجھ پر کھلا کہ یہ مرد غلیظ ہی ہے اور وہاں جو کچھ چرس وغیرہ دستیاب ہو جاتی ہے اس لئے میرے ملک کو جنت ثابت کرنے پر آمادہ ہوا ہے۔ چنانچہ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا، تمہارے لئے تو وہ جنت ہی ہے۔ کیونکہ وہاں چرس آسانی سے مل جاتی ہے اس پر اس نے سر ہلایا اور بولا، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں چرس نہیں پیتا۔ میں اب مزید چکرایا کہ کیسا ہی ہے چرس نہیں پیتا۔ ضرور اس کے دماغ میں خوس ہے جو پاکستان کو جنت کہتا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ بھی تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے میں پاکستانی ہوں اور پاکستان ہرگز جنت نہیں ہے۔ اس پر وہ مسکراتے ہوئے مراقبے میں چلا گیا۔ جب

سر اٹھایا نو کہنے لگا، اگر میں ثابت کر دوں کہ پاکستان واقعی جنت تو ہے۔ مجھے چونکہ معلوم تھا کہ بات تو ہمارے بڑے بڑے لیڈر ثابت نہیں کر سکے تو یہ غلطی ہی کیسے کرے گا۔ چنانچہ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے میں چائے کے ساتھ تمہیں ایک بسکٹ بھی کھلاؤں گا۔ ایک بسکٹ کا نام سن کر ان چوکنہ ہوا اور بولا۔ اچھا غور سے سنو۔ میں ایک برس تک لاہور کے بھاٹی دروازے کے اندر رہا ہوں۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہارے ملک میں سبب، کیلا، انار، امرود، مالٹے، انگور، شہتوت، لہان، آم وغیرہ ہوتے ہیں؟

میں نے کہا، ہوتے ہیں، پھر کیا ہوا؟

کہنے لگا انگلینڈ میں نہیں ہوتے.... صرف سیب ہوتے ہیں وہ بھی کٹے.... تمہارے ملک میں گندم، مکئی، گنا وغیرہ ہوتے ہیں؟

میں نے کہا ہاں وہ بھی ہوتے ہیں مگر....

کہنے لگا ہم اپنی ساری خوراک درآمد کرتے ہیں.... ولایت میں سوائے چند آلوؤں کے اور کچھ نہیں ہوتا.... کیلے، ولیٹ، انڈیز سے آتے ہیں۔ انار، قبرص سے، مالٹے اردن اور اسرائیل سے، انگور ہسپانیہ سے....

میں نے کہا ٹھیک ہے، لیکن تمہارے ہاں گوشت بہت عمدہ ہوتا ہے۔

وہ بولا۔ وہ بھی ارجنٹائن، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ سے آتا ہے۔ بلکہ سارے یورپ کا وہیں سے آتا ہے۔ تمہارے ہاں تو میں نے شیر، مرغابیاں اور کبوتر بھی کھائے ہیں۔ یہی قدر سے پٹنایا اور بولا۔ درست ہے کہ ہمارے ہاں خوراک بہت ہے لیکن موسم.... اتنی گرمی ہوتی ہے کہ تم روسٹ ہو جاؤ....

جانی جو کہ اپنی غلطی نہی ہنسا۔ پاکستان میں ولایت کی طرح ایک موسم نہیں ہوتا۔ وہاں موسم ہوتے ہیں۔ کتنے روز شدید گرمی ہوتی ہے، پھر وہاں کی برسات اور موسم بہار وہاں

چھوٹ کھتے ہیں۔ ان میں خوشبو ہوتی ہے۔ کیا تم نے کبھی کسی ولایتی پھول میں خوشبو محسوس کی؟ اور موسم سرما کی دھوپ جو تمہارے نصیب میں ہوتی ہے۔ جنت والوں کو بھی کہاں ملے گی! میں نے سوچا کہ میں تو بحث میں بار جاؤں گا۔ چنانچہ میں نے اپنا ٹرمپ کارڈ پیش کیا کہ جناب یہی صاحبِ دہاں خلافت بہت ہے۔ مکھیاں بہت ہیں۔ وہ بولا، اس کی ذمہ داری تو تم پر عائد ہوتی ہے نہ تمہو کا کردار جگہ جگہ اور خلافت نہ پھینکا کرو گئی کوچوں میں۔ اب مجھے خاصی دیر سوچنا پڑا کہ اس کینٹ کو اور کیا کہوں۔ تب میں نے ایک اور وار کیا۔ پاکستان بہت پور ملک ہے۔

وہ اس کے لئے بھی تیار تھا۔ کہنے لگا۔ تو کیا انگلینڈ دلچسپ ملک ہے۔ تمہارے ملک میں تو زمین کی اتنی مختلف شکلیں ہیں کہ انسان پور ہو ہی نہیں سکتا۔ میدان ہیں، جنگل ہیں، صحرا ہیں اور دنیا کے جنت ترین پہاڑ ہیں اور اتنا سرسبز ہے کہ آنکھیں دکھنے کو آتی ہیں۔ میں نے کہا انگلینڈ بھی تو سرسبز ہے۔ کہنے لگا وہاں آبادی اتنی ہے کہ سبزہ دکھائی ہی نہیں دیتا اور بارش اتنی ہے کہ کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ تمہارے ہاں کچھ لوگ بڑے ہوں گے لیکن جن لوگوں سے میں ملا ہوں وہ سب کے سب اچھے تھے۔ گاؤں میں کسی کے دروازے پر دستک دے کر کھانا مانگ لو مل جائے گا۔ انگلینڈ میں ملے گا؟ وہ درست کہتا تھا۔ انگلینڈ میں تو آپ گے بھائی کے گھر کھانے کے وقت چلے جائیں تو وہ مزے سے ڈانگ روم میں بیٹھا کھانا کھانا رہے گا اور بھوٹی صلاح بھی نہیں مارے گا۔ مختصر یہ کہ مجھے بار ماننا پڑی اور جانی جو کہ کوہاٹ کے ساتھ ایک بسکٹ کھلائے پڑے۔ جانی جو کہ نے پاکستان کے بارے میں حقیقی باتیں بھی کہی وہ سب مجھے معلوم تھیں لیکن میں نے کبھی ان کے بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ پاکستان میں قدرتی نعمتوں کی اتنی بہتات ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی ان کے بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچتا۔ جغرافیائی طور پر اتنا بے پناہ تنوع ہے کہ دنیا کے کم ہی ملک اس قدر خوشحال ہیں کہ ایک مہینے میں صحرا کی گرم ہوا ہے تو دوسرے حصے میں اسی لمحے برفباری ہوئی

ہے۔ اور تو اور پاکستان کے باشندوں کے قد کاٹھ اور شکل و صورت بھی اتنے مختلف اور رنگ و رنگ ہیں کہ ہر قسم کی رنگت اور ناک نقشے دکھائی دیتے ہیں۔ جب کبھی یورپ سے خشکی کے راستے وطن لوٹتا ہوں تو ہمیشہ راستے کی خشکی، بے آبادی اور بنجر پن کے بعد پاکستان میں ہونے والے رولتی اور سبزے کا سمندر میسر استقبال کرتا ہے اور میں ٹمکرتا ہوں کہ میرے بالآخر اپنے وطن میں ہوں۔ ایسا وطن جو دنیا کے بیشتر ملکوں سے بہت بہتر اور خوبصورت ہے۔ دراصل میں یقین نہیں آتا کہ ہم جنت میں رہتے ہیں۔ جب تک کہ کوئی دلائلی صوابیہ اور ہمیں یہ نہ بتائے کہ دیکھو تم پر آڈائٹریں رہنا ہے۔ یہ بھی درست کہ زندگی کے بیشتر شعبوں میں سانپ بھی ہیں جو اس جنت کو صرف فاقی مفاد کی خاطر جہنم بنانے پر تھے ہوئے ہیں لیکن اس میں جنت کا کیا قصور؟

”نادان فرنگن اور جنگلی بھینسیں“

کیا آپ یقین کریں گے کہ کل شام میں نے پرانی سبزی منڈی کے دروازے میں سے ”واکڈ بفلوز“ یعنی جنگلی بھینسوں کا ایک ریوڑ باہر نکلتے دیکھا۔ جن ہاں اباکل سیاہ لٹکتی ہوئی خورق اور قسم کی بھینسیں جن کے سر پر تھے ہی افرائی مچ گئی، پچی پان فروش کا خواجہ اٹل گیا، دو سائیکل سوار اسٹریٹ بچوں والے کی دکان میں جا گئے اور ریڑھے والے کا گھوڑا ہنٹانا ہوا الف ہو گیا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کئی افراد نے دکانوں کے تھروں پر چڑھ کر جان بچائی۔ ان جنگلی بھینسوں کے متعدد ریوڑ دن میں کئی مرتبہ سبزی منڈی میں اپنی آماجگاہ سے نکلتے ہیں اور سرک پر بھگدڑ مچاتے ہیں۔

میں بھی پہلے پہل آپ کی طرح ان بھینسوں کو عام سے معصوم جانور سمجھتا تھا لیکن ٹرمیا کی لاہور آمد کے دوران میرا نقطہ نظر یکسر تبدیل ہو گیا۔ ٹرمیا میرے ایک سوس دوست کی بہن تھی برا سرائے مشرق دیکھنے کے شوق میں لاہور آئی اور کا پتی لہذا دہلی واپس سوئٹزرلینڈ چلی گئی۔ لیکن اس سے پیشتر میں اسے ایک گاڈ کی حیثیت میں قابل دید مقامات دکھاتا رہا۔ ایک روزانہ روزنامہ شہر کے گریڈ ٹور کے بعد ہم دونوں جمہورین روڈ کے راستے مال روڈ کی جانب جا رہے تھے کہ ایک دم اس نے ایک ہلکی سی مہذب چچ ماری اور میرا بازو پکڑ کر کہنے لگی: ”مستضر مجھے بچاؤ“ میں نے کہا کہ شاید بی بی کو مارٹ ایک ہو گیا ہے یا بالو بازار سے کھائی ہوئی چاٹ کی وجہ سے اس کے معدے میں اتھل پھل شروع ہو گئی ہے۔ چنانچہ میں نے مشرقی آداب کے تحت فوراً اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کیا کہ کہیں کسی الزام میں دھرنہ لیا جائوں اور اس کی بے چینی کا

سبب پوچھا۔ اس کے چہرے کا رنگ اتر چکا تھا۔ وہ بے حد خوف زدہ تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر میرا بازو تھام لیا اور گولہ اندازی چوک کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی۔ "وائٹ بلفورڈ" میں نے اس جانب دیکھا تو ادھر سے چند بھینسیں خراماں خراماں چلی آ رہی تھیں۔ میں نے اسے بتایا کہ اے نادان فرنگی یہ جنگلی بھینسیں ہرگز نہیں ہیں بلکہ بے ضرر اور مدد دینے والی گھریلو پالتو بھینسیں ہیں جو کسی کو کچھ نہیں کہتیں، لیکن تیرا بیستو روپے خرچہ کر رہی تھی۔ کہنے لگی۔ "لیکن یہ بھینسیں تو یہ جنگلی ہوتی ہیں تم نے اگر انہیں سدھا کر گھروں میں رکھ لیا ہے تو اس سے ان کی فطرت تو نہیں بدل سکتی۔" میں نے بہت برا بھلا کیا کہ بی بی انہیں تو ہمارے ہاں بھولی بھینسیں کہا جاتا ہے جو بالکل بے ضرر ہیں لیکن وہ نہ مانی اور کہنے لگی کہ اچھا اگر تم شیر کو گھریلو رکھو اور اسے سدھا تو کیا وہ شیر نہیں رہے گا۔" میں نے کہا بالکل رہے گا لیکن شیر اور بھینسیں میں فرق ہے۔ وہ بولیں کہ کوئی فرق نہیں دونوں جنگلی کے جانور ہیں اور کسی وقت بھی حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد تیرا کا دل لاہور میں نہ لگا۔ وہ ہمہ وقت ادھر ادھر چھوٹک پھونک کر قدم رکھتی۔ جیسے شہر میں نہ ہو کسی پر خطر جنگل میں چل رہی ہو اور بالآخر وہ بھینسیوں کے شہر لاہور سے کوچ کر گئی۔ تیرا دیا کے جانے کے بعد میں بھی بھینسیوں کو ٹسک کی نظر سے دیکھنے لگا۔ کیا پتہ کہ کب اپنی فطرت کی طرف لوٹ جائیں اور حملہ آور ہو جائیں۔ اگر ڈرہچکا کی مشہور فلم پر بندے "جو ڈیفنی ڈی موڈ" کے ایک افسانے پر مبنی تھی میں بھی یہی کچھ ہوا تھا کہ یکدم ایک قصبے کے تمام پرندے انسانوں پر حملہ آور ہونے لگے ہیں۔ ایک فلم میں کتوں کو بھیڑیوں میں بدلنے دکھایا گیا تھا۔ عام گھریلو پالتو کئی مرتبہ بچوں پر حملہ کر دیتی ہیں۔ یعنی ان کے اندر شیر سے رشتہ داری والا خون اپنے گتے کو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ بھینسیں بھی کسی روز اپنی تمام تر شرافت بھول کر صبح چ جھگی ہو جائیں۔ مشہور امریکی مصنف ہیننگوے نے اپنے ایک سفر نامے میں لکھا تھا کہ جب جنگلی بھینس حملہ کرنے کی نیت سے تمہاری طرف بھاگنا شروع کرتی ہے تو انسان فوراً اپنی خطرات کی معافی مانگنے لگتا ہے اور اس کا وہ سب کچھ خطا ہو جاتا ہے جو انسان کے علاوہ بھی خطا ہو سکتا ہے اور یہ

کہ جنگلی بھینسے کا شکار شیر کے شکار کی نسبت زیادہ خطرناک ہے۔ اب اگر بین الاقوامی ادارہ کی وجہ سے بے شک ہو گیا کہ ہمارے ہاں کی بھولیاں بھٹاں بھی جنگلی ہو سکتی ہیں تو اس میں میرا کیا ہے صرف اور ان میں بھینسیوں کا بھی کیا قصور۔ جو صرف اپنے اصل کی جانب لوٹ جائیں گی۔ یہ صرف صرف حضرت انسان کو حاصل ہے کہ اس کے اصل کا کچھ پتہ نہیں چلتا وہ معاشرے کے جنگلی میں اپنی شکلیں بدلتا رہتا ہے۔ جب کمزور سامنے ہو تو وہ شیر بن جاتا ہے خود کمزور ہو تو لہو بن جاتا ہے۔ طاقت کی حالت میں ہو تو باغی، بے حیثیت ہو تو جیونٹی، امیر ہو تو منہ زور گھوڑا۔ فریب ہو تو نانی کا کیرا۔۔۔۔۔ لیکن قصہ تو جانوروں کا چھڑا تھا کہ اگر تمام جانور خود بخود جو جائیں تو ہر حال لاہور کی بھینسیں تو جنگلی ہو چکی ہیں اور ہماری گلیوں بازاروں میں دہشت پھیلاتی گھومتی رہتی ہیں۔ کچھ عرصہ پیشتر اخباروں میں بڑی بڑی سرخیوں سے اعلان کئے گئے تھے کہ بھینسیں شہر کے باہر پہنچادی گئی ہیں۔ گواہوں کے چالان ہوئے تھے۔ انہیں ایک کالونی الاٹ ہوئی تھی اور اس کے بعد ای ڈی اے جین کی نیندر سو گیا اور اب تک سوتا ہے کیونکہ اسے تو معلوم ہی نہیں کہ بھینسیں ہر شہر میں آچکی ہیں یا شاید ای ڈی اے نے جان بوجھ کر صرف ٹورسٹ اٹرکشن کے لیے انہیں کھلی بھی دے رکھی ہے کہ دنیا بھر کے سباح حضرات آئیں اور دیکھیں کہ کس طرح انسان اور وحشی جانور ایک ہی شہر میں رہتے ہیں۔ کیا جنگل میں منگل کا سماں ہے۔ دنیا کے کسی اور شہر میں ایسا نظارہ کہاں ہوگا۔ بلکہ ای ڈی اے میری مانے تو ایک پوسٹر چھپوائے جس میں لاہور کے کسی بارونق بازار میں بھینسیوں کا ہجوم مستی کے عالم میں چلا جا رہا ہے اور اس کے نیچے لکھا ہو "آئیے اور لاہور دیکھیے۔ بھینسیوں کا شہر لاہور۔ لیکن بھینس کے آگے بن بھانے سے کیا ہوتا ہے؟

”بیچ ہانکنگ“

میں اپنے کھٹ کھٹ کھٹا موٹر سائیکل پر حسب معمول شہر سے گھر کی طرف جا رہا تھا کہ ایک نوجوان نے مجھے ٹھیکہ دکھا دیا۔ اس سے پیشتر بھی لوگوں نے مجھے لفٹ کے لئے روکنا چاہا تھا مگر میں رک نہ سکا۔ کیونکہ میری بریک قدر سے عمر رسیدہ ہے اور رکتے رکتے دو چار فرلانگ فاصلے طے کر جاتی ہے لیکن آج موٹر سائیکل کی تازہ تازہ سروس ہوئی تھی۔ چنانچہ میں نے بریک پر پاؤں رکھ دیا تاکہ اس نوجوان کو لفٹ دے کر ان ہزاروں لفٹوں کا بدلہ چکا سکوں جو مجھے ایام جوانی میں دنیا کے بے شمار لوگوں نے دی تھیں.... اور جن کی بدولت میں ان کے بارے میں کھڑے رہا تھا.... موٹر سائیکل رکی اور میں نے نوجوان سے مسکراتے ہوئے پوچھا کہ کبھی کہاں جاؤ گے؟.....

شرک پر کھڑے ہو کر لفٹ لینے کا روانہ یا بیچ ہانکنگ کہاں اور کس طرح شروع ہوئی۔ اس کے بارے میں کچھ بیان ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں جب روسی محاذ بے حد گرم اور قاتل تھا۔ جرمن فوجی چھٹی پر واپس وطن آتے تو اپنے اپنے آبائی شہروں تک جانے کے لئے شرکوں پر کھڑے ہو جاتے۔ ان کے ہم وطن جذبہ تشکر کے تحت انہیں اپنی گاڑیوں یا موٹر سائیکلوں پر بٹھا کر ان کے قصبوں یا شہروں تک مفت میں لے جاتے۔ جنگ کے خاتمے پر یہ عادت نوجوان نسل نے اپنی جوتنگ دستی کے باوجود سیر و سیاحت کی شوقین تھی۔ چنانچہ آہستہ آہستہ یہ رواج پورے یورپ میں پھیل گیا اور شاہراہوں پر کھڑے نوجوان سیاحوں کو لفٹیں دی جانے لگیں۔

میں پہلی مرتبہ بیچ ہانکنگ سے ایک انگریز لڑکے پیٹر وڈ کے ذریعے متعارف ہوا۔ پیٹر نے مجھے بتایا کہ کس طرح اس نے پورے یورپ کی سیر لوگوں سے لفٹیں مانگ مانگ کر کی ہے۔

اور اسے اس دوران کیسے کیسے تجربات ہوئے چنانچہ میں نے بھی سیاحتی تھیلا یا ریک سیک کاڈ سے پر ڈالا اور قسمت آزمائی کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ ولایت میں مقیم ایک بزرگ کو جب میرے اس ہانکنگ کے ارادے کا خبر ہوئی تو وہ خاص طور پر پانچٹر سے لندن تشریف لے لے لے گئے۔ ”برخوردار تمہارا دعاغ خراب ہے۔ اچھے بھلے معزز خانوادے سے تعلق رکھتے ہو۔ کیوں شرکوں پر کھڑے ہو کر گوروں سے لفٹ کی بھیک مانگو گے، شرم کرو۔۔۔“ مجھ میں شرم کا کچھ فقدان تھا چنانچہ میں نے اپنا ارادہ نہ بدلا۔ جب پہلی مرتبہ اپنا سامان شرک پر رکھ کر انگوٹھا دکھانے کی کوشش کی تو فاضی ندامت ہوئی اور بزرگی کی باتیں یاد آئیں۔ بہر حال اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ میں نزدیک ترین ریوے سٹیشن یا بس سٹاپ سے کوسوں دور تھا چنانچہ دست سوال پھیل دیا..... وہ دن اور آج کا دن..... میں نے کچھ نہیں تو پچاس ساٹھ ہزار میل کا فاصلہ تو لفٹوں کے ذریعہ طے کیا ہوگا.....

بیچ ہانکنگ میں البتہ کچھ دشوار مقام بھی آتے ہیں۔ مثلاً آپ سارا دن ایک جگہ اکڑتے رہیں اور آپ کو کوئی لفٹ نصیب نہ ہو۔ یا پھر آپ کو کسی دیرانے میں آنا کر ڈیو گھر ملا جائے اور آپ کو میلوں پیدل چلنا پڑے.... ایک کامیاب بیچ ہانکر کے لئے ضروری ہے کہ وہ خوشگوار طبیعت کا مالک ہو۔ کھڑے ہونے کے لئے ایسی جگہ کا انتخاب کرے جہاں گاڑیاں آسانی سے رک سکیں۔ مثلاً جہاں کوئی قریبی شرک شاہراہ میں آکر منہ ہو کسی پٹرول پمپ کے باہر وغیرہ وغیرہ.... اس کی دشواری اپنی جگہ لیکن اس طریقہ سفر کی بدولت مجھے اتنے مختلف قسم کے لوگوں سے ملنے اور درافتادہ دیہات اور قصبوں میں جانا نکلنے کا اتفاق ہوا ہے کہ اگر بس یا ٹرین میں سفر کرتا تو شاید دنیا کے بارے میں میرا علم بہت ہی اوصولہ رہ جاتا۔

پاکستان میں اس کا رواج گزشتہ چند برسوں سے مقبول ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اجتماعی مشکلات کو اجتماعی طریقے پر ہی حل کرنے کا ایک خوبصورت طریقہ ہے۔ آپ اگر کار میں اکیلے

مسافر کر رہے ہیں تو کسی کو ساتھ بٹھالینے سے یا اسے اپنی منزل تک پہنچا دینے سے جو آپ کی منزل بھی بے زیادہ پٹرول تو خرچ نہیں ہوگا البتہ اس فرد کا انسانیت اور بھائی چارے پر یقین بڑھ جائے گا اور وہ یقیناً شکر گزار بھی ہوگا۔ جس طرح میں آج بھی ان ہزاروں لوگوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے نصیحتیں دیں۔ اسی طور پر پاکستان میں ایک ایسا طریقہ بھی اپنایا جائے کہ جو ایران اور ترکی وغیرہ میں ایک عرصے سے مقبول ہے۔ یعنی ہر وہ ڈرائیور جس کی گاڑی میں جگہ ہوتی ہے بس شاپ پر یا سڑک کے کنارے رکنا ہے اور اپنی منزل کا اعلان کرتا ہے اس جانب جانے والے مسافر اس کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں اور اسے مناسب کرایہ ادا کر دیتے ہیں۔ یوں ڈرائیور کے پٹرول وغیرہ کا خرچہ نکل آتا ہے اور آرام سے اپنی منزل تک پہنچ جاتے جاتے ہیں۔ سینما گھروں میں فلم کے خاتمے پر بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر پاکستان میں بھی یہ رواج مقبول ہو جائے تو رکشہ اور ٹیکسی والے فی الفور اپنے کرائے نصف کر دیں گے..... آزمائش شرط ہے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی نہر کے کنارے کی جہاں ایک نوجوان نے لفٹ کے لئے بے چیننگا دکھایا اور میں نے موٹر سائیکل روک کر پوچھا کہ کبھی کہاں جاؤ گے؟..... جواب تھا کہ ابھی نہیں میں موٹر سائیکل پر لفٹ نہیں لیتا اور پھر ایسی پھینچ موٹر سائیکل پر۔ ابھی کوئی کار آئے گی تو اس میں آرام سے بیٹھ جاؤں گا۔ چنانچہ میرے دیکھتے دیکھتے ایک شاندار کار رُک دی اور نوجوان اس میں سوار ہو گیا..... اب میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ اس فضول موٹر سائیکل کو ہال ٹیج پیچیک آؤں اور کاروں میں نصیحتیں حاصل کر کے آرام سے زندگی بسر کروں؟

”آئی نو پاکستان کا چیکو“

ان دنوں اظہار کا بہترین ذریعہ شکر ہی..... شکر اس شے کو کہتے ہیں جسے کسی سطح پر چکایا جاسکے۔ چنانچہ انہیں اردو میں چپی یا چکوکھا جاسکتا ہے۔ یہ چکوک زیادہ تر در آمد ہوتے ہیں اور ان کا نفع ان خاندانوں کے لیے ہوتا ہے اور اس میں جنس کی آمیزش بھی ہوتی ہے۔ یہ چکوک ہونگہ انگریزی زبان میں ہوتے ہیں اس لئے درآمد کرنے والے ان میں پوشیدہ معافی سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں..... یہ چکوک عام طور پر کاروں اور نوجوان نسل پر چپکے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر بھوٹی کاروں کے لئے نہایت ہی خریدار چکوک ہوتے ہیں..... مثلاً تیرا ایک طویل کار ہے۔ ”میرے نزدیک آؤ گے تو قتل کر دوں گی“..... جب میں بڑی ہو جاؤں گی تو روڈ مزرائس بن جاؤں گی..... یا پھر ”میں مٹی ہوں بڑی اچھی ہوں“..... اس طرح دفتروں، گھروں اور کمروں میں لگانے کے بے طرح طرح کے چکوک دستیاب ہیں.....

ان میں ایک چکوک ”آئی نو پاکستان“ کا بھی ہے..... یعنی میں پاکستان سے محبت کرتا ہوں۔ مجھے دنوں ایک دوست کے ساتھ ملکی سیاست کے بارے میں ملکی پھلکی، لیکن سنجیدہ قسم کی بحث ہو رہی تھی وہ بڑے زور شور سے دلائل دے رہے تھے اور میں سن رہا تھا۔ بالآخر میں نے تنگ آکر کہا کہ دیکھو بھائی میرا اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ اگر آپ اپنے وطن کے ساتھ لگاؤ رکھتے ہیں تو پھر آپ جو بھی کہیں قابل قبول ہے..... لیکن اگر آپ اس سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں تو پھر آپ کی گفتگو قبول نہیں کی جاسکتی.....“

”کیا مطلب!“ وہ منہ پر مکا مار کر بولے ”کون کہتا ہے کہ میں پاکستان سے“

کرتا۔۔۔

”میں تو نہیں کہتا۔۔۔۔۔ میں نے گھبرا کر کہا۔

”میں پاکستان سے محبت کرتا ہوں“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ ”کیا تم نے میری کار دیکھی ہے؟“

”ان دنوں آپ کے پاس کون سی کار ہے؟“

”ان دنوں میرے پاس ایک سولڈر سٹرن ہے۔۔۔۔۔ اور تم بے شک ابھی جا کر دیکھ لو کہ اس کے اگلے شیشے پر آئی لوپاکٹن“ شکر لگا ہوا ہے۔۔۔۔۔ وطن دوستی کی اس سے بڑی اور کیا مثال ہوگی۔۔۔۔۔

”یہ ثبوت ہے آپ کی پاکٹن کے ساتھ محبت کا؟“

”تو اور کیا۔۔۔۔۔ میں نے شکر لگا کر اپنا فریضہ پورا کر دیا ہے۔۔۔۔۔ اب میں ملک کے لیے اکی سے بڑھ کر اور کیا کر سکتا ہوں؟“

اور ہم میں سے بیشتر ایسا ہی کرتے ہیں۔ ہم اپنی کاروں، موٹر سائیکلوں اور کمروں میں ”آئی لوپاکٹن“ کا چکر لگا کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم فارغ ہو گئے ہیں۔

پچھلے برس ہنزہ کے صدر مقام کریم آباد میں ایک شام تھی اور اس شام سانے سے ایک گورا چٹا درمیانی عمر کا شخص کا اندھے پر سامان کا تھیلہ اٹھائے سر ہٹکاتے چلا آ رہا تھا اور اس کے گلے میں جوتوں کا ہار تھا۔ جن ہاں! اس نے اپنے دونوں نل بورٹ تسموں سے بانہ کر گلے میں لٹکار رکھے تھے۔ میں نے سوچا یہ نسل اور شکل سے جرمن لگتا ہے چنانچہ قریب سے گزرتے ہوئے میں نے ذرا ہلک کر اسے ”گڈ مائننگ“ کہہ دیا۔ حالانکہ اس وقت شام گہری ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ اس نے جواب دیا اور قریب سے گزر گیا۔ میں نے سوچا جرمن بھی ہے اور بدواٹ بھی ہے۔۔۔۔۔ چند لمحوں بعد وہ پھر آگیا۔ ”مارٹ صاحب! آپ نے مجھے گڈ مائننگ کہا تھا۔۔۔۔۔“ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ جرمن تو اردو بولتا ہے لیکن ظاہر ہے وہ پاکستانی تھا۔۔۔۔۔

”جن ہاں میں نے ہی آپ کو گڈ مائننگ کہا تھا۔۔۔۔۔“

”کال ہے آپ کی انگریزی آتش غلط ہے۔۔۔۔۔ اس وقت تو آپ کو گڈ مائننگ کہنا چاہیے۔ حاجت السوس کی بات ہے کہ آپ جیسے ادیب۔۔۔۔۔ اس نے مجھے خامی بھارتی پلا دی۔“ آپ کہاں سے آرہے ہیں؟ میں نے موضوع بدسننے کی کوشش کی۔

”میں ادھر پہاڑوں میں گیا تھا اور اُدھر سے آرہا ہوں۔“

”کون سے پہاڑوں میں۔۔۔۔۔ اور کدھر سے۔“ آدمی دلچسپ معلوم ہوتے تھے۔ چائے پیس گئے۔

”پہلے مجھے رات کے لیے رہائش دے کر رہے۔ پھر چائے بھی پی لیں گے۔“

ان صاحب کے لیے بڑی مشکل سے رہائش کا انتظام کیا۔ کیونکہ ان دنوں کریم آباد کے تمام نول خلع تھے۔

”اب میں آپ کو چائے پلاؤں گا۔۔۔۔۔“ ان صاحب نے خوش ہو کر کہا۔۔۔۔۔ پہلے اپنا تعارف کرادوں۔۔۔۔۔ میں کراچی میں سکول ٹیچر ہوں۔۔۔۔۔ ان تین مہینے کی چھٹیوں میں ادھر شمالی علاقوں میں آجاتا ہوں اور آوارہ گردی کرتا ہوں۔“

”آپ کہاں ادھر کن پہاڑوں میں جاتے ہیں؟“

”میری کوئی منزل نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ کبھی کسی کوہ پیما ٹیم کے ہمراہ چلنے لگتا ہوں۔ اپنا خیمہ ہے اپنی خوراک بنالیتا ہوں۔ کبھی کوئی وادی یا گلشیر پسند آجائے تو ٹیم کو چھوڑ کر ادھر نکل جاتا ہوں۔ یوں میں پاکستان سے محبت کرتا ہوں۔۔۔۔۔“

”ہیں؟“ میں نے چونک کر کہا۔ ”یہ پاکستان کہاں سے آگیا؟“

”میں جو کچھ دیکھتا ہوں وہ پاکستان ہی تو ہے۔۔۔۔۔ پھر میں واپس جاتا ہوں اور اپنے شاگردوں کو بتاتا ہوں کہ میں کہاں کہاں جھٹکتا پھرا۔۔۔۔۔ انہیں پہاڑوں اور برنائی تو دونوں کے بارے میں بتاتا ہوں جو میں دیکھتا ہوں دور افتادہ وادیوں میں رہنے والے لوگوں کے بارے

میں بتاتا ہوں اور یوں وہ بھی پاکستان سے محبت کرتے ہیں؟.....

”پھر پاکستان؟..... پاکستان سے محبت کا اس آوارہ گردی کے ساتھ کیا تعلق بنتا ہے؟“
”دیکھیں جناب..... کیا آپ نے کبھی عشق کیا ہے؟“

”لاحول ولا.....“ میں نے گھبرا کر کہا: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں قبلہ..... میں شادی

شدہ.....“

”بہر حال..... کیا آپ کسی سائے سے محبت کر سکتے ہیں؟..... محبت کرنے کے لئے
جاننا ضروری ہے اگر آپ کو یہ معلوم نہیں کہ محبوب کا ناک نقشہ کیا ہے تو پھر آپ اس سے کس طرح
محبت کر سکتے ہیں؟“

”یہ تو بالکل درست فرمایا آپ نے..... میں نے قائل ہوتے ہوئے کہا۔

”تو جناب میں تو پاکستان کو جانتے کھ لے۔ اس کا ناک نقشہ دیکھنے کے لئے سفر کرنا

ہوں.....“

لوگ اپنے سینوں پر کاروں پر تحریروں پر، کالموں پر، ”آئی لو پاکستان“ کا چکرو لگاتے
پھرتے ہیں اور انہیں بالکل علم نہیں کہ ابھی پاکستان کا ناک نقشہ کیا ہے شہادت کیسی ہے..... وہ
یہ چکرو لگا کر محب الوطنی کے فریضے سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ کربم آباد کی شام میں مٹنے والا وہ
گراچی کا ٹیچران سے مختلف تھا۔ اس نے اپنے سینے پر کوئی چکرو آویزاں نہیں کر رکھا تھا لیکن وہ
اپنے محبوب کے ناک نقشے کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اور پھر نئی نسل کو بتانا چاہتا تھا کہ ان کا وطن
کیسا ہے۔ کتنا خوبصورت ہے..... اسے کسی ”آئی لو پاکستان“ کے چکرو کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ
اسے کچھ بھی ثابت کرنے کی ضرورت نہیں تھی..... اور کار کے عقب میں لگا ہوا ”آئی لو پاکستان“
تو سب دیکھتے ہیں۔

”آئی لو پاکستان“ کے چکرو ضرور آویزاں کیجئے..... باہر بھی..... اور دل کے اندر بھی۔

ہرن مینار اور پیا سے ہرن

میرے ساتھ تین بچے تھے۔ بچہ نمبر ایک۔ بچہ نمبر دو اور بچہ نمبر تین..... اور مینوں بچے
پیا سے تھے۔

ہم ایک مجیل غلاما لوب کے کنارے بیٹھے تھے اور پیا سے تھے۔

ہم چاروں کی زبانیں باہر نکلی ہوئی تھیں اور ہم پیا سے جانوروں کی طرح بانپے چلے جا رہے
تھے۔ اور یہ صرف اس لئے ہو رہا تھا کہ مجھے اور میرے بچوں کو اپنا قومی ورثہ بے حد پیلا تھا۔
اس قصے کا آغاز کچھ اس طرح ہوا کہ بچہ نمبر ایک نے کسی اخبار میں پڑھا کہ مکر آنا رتدیر کی

غرامت کو قائم رکھنے کے لئے اتنے کروڑ روپیہ خرچ کرے گا۔ چنانچہ بچہ نمبر ایک ہجرت سے پوچھا
کہ اب یہ پرانی مہارتوں پر اتنے روپے کیوں خرچ کرتے ہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ انہیں ڈھا
کر شاہجہان پلازہ وغیرہ بنادیں جائیں۔ میں نے اسے بتایا کہ شاہجہان اگرچہ تم نے قوم کی اجتماعی
روح کی ترجمانی کی ہے لیکن یہ پرانی عمارتیں ہمارا قومی ورثہ ہیں۔ ہماری تاریخ کی تصویریں
ہیں۔ ہمارے فن کی نمائندہ ہیں وغیرہ وغیرہ..... اس پر اس نے بڑے آرام سے پوچھا کہ
شہنشاہ.....

”شہنشاہ کہ بادشاہی مسجد دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہے.....“

”ابو آپ بادشاہی مسجد کو آثار قدیمہ تو نہیں کہہ سکتے..... کوئی اور حوالہ دیجئے“ بچہ نمبر ایک
نے اپنی نینک درست کی۔

”شہنشاہ لاہور کا شاہی قلعہ، ہماری غفلتوں کا شاہکار، عظیم شاہکار، باغ..... اور مقبرہ جہانگیر

وغیرہ ایسی باتیں ہیں جنہیں سنبھال سنبھال کر نہ کہنا ہمارا ملی فریضہ ہے۔۔۔

اس دوران بچہ نمبر دو بھی کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ بھی گفتگو میں شامل ہو گیا۔ اور یہ بھی آپ کا بی فریضہ ہے ابو کہ آپ اپنی کہ آپ اپنی اولاد کو ماضی کے شاہکار دکھائیں۔
 "بالکل" میں نے خوش ہو کر کہا۔ ہر پاکستانی یہ فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اپنے شاندار ماضی سے آگاہ کرے اور آثارِ قدیمہ کی سیر کرائے..... اور میں یہ فرض ادا کر چکا ہوں؟
 "آپ نے ہمیں ہرن مینار دکھایا ہے؟" بچہ نمبر تین کسی فلمی ولن کی طرح کمرے میں داخل ہوا اور بڑھک لگا کر بولا۔ یہ دراصل ایک سازش تھی مجھے ہرن مینار سے جانے کی اور اب ہم جھیل نماتا لالہ کے کنارے بیٹھے تھے اور پیاسے تھے۔

لاہور سے روانہ ہوتے وقت، بچوں کے ذہن میں ہرن مینار اور اس کی جھیل کسی خواب کی وادی میں تھے جہاں جھیلوں میں ہرن گھومتے تھے اور خشک چشمے ہر قدم پر ابلتے تھے۔ شیخوپورہ سے گزر کر ہم بائیں ہاتھ ہوئے اور ایک چھوٹی سی سڑک پر سفر کرتے ہوئے ایک روڈ بلاکسڈ پر پہنچ گئے۔ یہاں ایک برآمدے میں کمر سی پر ایک کارندہ اکڑا ہوا بیٹھا تھا اور ہرن مینار میں داخل ہونے کے ٹکٹ منہ پر پھینک رہا تھا اور اگر کچھ دودھ پیتا تھا تب بھی یہاں بانٹ تھا اور اس کا بھی ٹکٹ تھا۔ میں نے حساب لگایا کہ ٹکٹ کی رقم سے میں بچوں کو لالچو میں باقاعدہ عیش کر داسکتا تھا.... لیکن اب میں لاہور سے بہت دور تھا اور مجھے ایک نئی فرم ادا کرنا تھا چنانچہ میں نے ادا یگی کر دی۔ ٹکٹ عیب میں ڈال کر جانے لگا تو ایک "چھوٹا" نمودار ہو گیا۔ "باؤ جی گاڑی کا ٹکٹ دو...." میں نے بہت کہا کہ ہم شاید کہیں نہ جائیں گاڑی کے قریب ہی رہیں لیکن وہ نہ مانا اور مجھے یہاں بھی نامی رقم ادا کرنا پڑی۔

ہرن مینار گرمی اور جس کی زد میں تھا۔ ہم نے ایک نظر اس کمرائے نامے پر ڈالی جو کہ ان موٹر بوٹوں اور کشتیوں کا تھا جو کہ تالاب میں کھڑی تھیں اور آگے بڑھ گئے بلکہ بے کھڑ ہو گئے کہ آٹا تو ہم موٹر بوٹ میں سیر کریں گے اور میں انہیں دھکیل کر آگے لے گیا ہرن مینار پر

بڑے ادا و ہر ادا دھر گھومنے کے بعد ہم نے ایک سائرہ دار مقام پر بیٹھ کر کچھ شامی کباب ادا
ڈول روٹی وغیرہ خوش کی اور تب ہمارے گلے خشک ہوئے، ہمارے جسم خشک ہوئے، آنکھیں بننے
لگیں اور ہم ہر دن مینار کے سبزہ زار میں ایک عام سائل تلاش کرنے لگے، کسی پینڈ پپ کی جستجو
میں گھومنے لگے اور وہاں کچھ بھی نہ تھا..... بوتلیں پینے والے تھے جو شیطانی مسکراہٹ سے
ہنس دیکھتے تھے اور چابی سے بوتلوں کو "ٹن ٹن" بجاتے تھے کہ ادھر آؤ مال خرچو اور بچوں کے
حق تو کرو..... یہاں کوئی پانی نہیں ہے۔ صرف ایک نل تھا جسے ہم نے جان بوجھ کر توڑ دیا ہے
اور لوگ بوتلیں پئیں یا پیاسے مر جائیں آؤ آؤ..... واقعی وہاں ایک نل تھا جو کسی نے توڑ دیا

ہم شیخوپورہ تک گرتے پڑتے پہنچے اور شرک کے کنارے گئے ایک ہینڈ بپ سے پراس
بھا رہے تھے کہ بچہ فیر میں یعنی میری بیٹی عینی کہنے لگی ابوریہ جو چاہے گھر کا بہن لڑکیا تھا تو یہ یہاں
سے لڑکیا تھا۔

”اے کیا۔ بچہ غبرو یعنی سمیرا بولا۔ وہ ہرن مینار دیکھنے آیا ہوگا اور پانی اُسے ملا نہیں ہوگا اس لئے مر گیا۔“

”ہاں بہنوں کو سرن مینار نہیں جانا چاہیئے۔“ میں نے سر جھکا کر کہا۔

”قوموں کی ترقی کا پنکچر شدہ ٹائر“

ان دنوں صبح کے وقت جو چند حیاتی موٹی دھند آلود دھوپ فشاں شہری ہوئی ہوتی ہے۔ اس میں نہر کے کنارے آہستہ سے موٹر سائیکل پر چلتے جانا کتنی ٹری نعمت ہے۔ کئی آسودگی ہے۔ جو برا نہیں کہ بدن کو کاٹے بلکہ اس میں ایک نرم حد تک جو جسم کے آس پاس پھیلتی ہے اور احساس دلاتی ہے کہ زندگی میں کچھ آسائشیں ایسی ہوتی ہیں جو رُوب کی طرف سے ساری مخلوق کے لئے ایک نعمت کے طور پر عطا ہوتی ہیں۔ کئی بھی ایک ایسی ہی صبح تھی اور نہر کے کنارے خوشگوار دھوپ اور نرم ہوا میں سانس لیتا شہر کی جانب آ رہا تھا۔ میں جان بوجھ کر موٹر سائیکل آہستہ چلا رہا تھا کہ کوئی مجھے مس نہ تھا کہ چیز تنگ کر اس عبور کرتے کرتے ہی مجھے یہ صاف اور شفاف ہوا نصیب نہ ہوگی۔ وہاں میں شہر کی آلودگی اور کثافت میں سانس لوں گا اور پھر سارا دن گوبر، گرد اور میکا کی ٹراپسورٹ سے بھرا ہونے والے دھوئیں کو اپنے اندر آتا رہوں گا۔ ہم جدید زندگی کی دھڑ میں یہ بھول چکے ہیں کہ اس طرز زندگی میں کچھ تباہی بھی ہیں۔ جن کا کچھ بندوبست کرنا چاہیے۔ ان میں سے ایک ہوا کا آلودگی ہے جو کارخانوں کی چیمنیوں کا روں اور رکشوں کے سائفرسوں اور گندگی کے ڈھیروں میں سے جنم لیتی ہے اور ہم اس میں سانس لیتے رہتے ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ لاہور شہر کے گنجان آباد علاقوں میں پودے بھی سرسبز نہیں رہتے ہر جہاں جاتے ہیں۔ انسان پودوں کی نسبت قدرے ڈیٹ واقع ہوا ہے لیکن ایک بیج ایسی آجاتی ہے جب گوبر اور گرد کی تہ اس کے جسم میں نہ رہ سکتی کہ اُسے ناکارہ کر دیتی ہے۔ کیا ہمیں اس وقت تک انتظار کرنا چاہیے۔۔۔۔۔ بہر حال میں نہر کے کنارے صبح کی دھند آلود دھوپ کو اپنے بدن میں جذب کرتا شہر کی جانب آ رہا تھا کہ یک دم

موٹر سائیکل قدر سے لڑکھڑایا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ٹائر دن کو نشہ ہو گیا ہے اور وہ جھوٹے پتے جاتے جاتے ہیں۔ بمشکل سینڈل کو سنبھالا اور اس کے ساتھ ہی موٹر سائیکل کھڑا ہو گیا۔ پچھلے ٹائر پنکچر ہو چکا تھا۔ موٹر سائیکل سوار برادران جانتے ہیں کہ اگر ٹائر کسی ایسی جگہ پنکچر ہو جائے جس کے آس پاس پنکچر گوانے کی بہولت میسر نہ ہو تو اس وقت چہرے پر کئی قیامت برپا ہوتی ہے۔ ان کتنی بے بسی سے وہاں کھڑا ہوتا ہے۔ اور اپنے قریب سے شاں شاں کرنی گزرتی کاروں اور موٹر سائیکلوں کو کس حسرت سے دیکھتا ہے اور خاص طور پر ان کے ہوا سے چھوٹے ہوئے ٹائر کو جو سڑک پر تیزی سے گھومتے چلے جا رہے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ کچھ حضرات اپنی گاڑی آہستہ کر کے آپ کی بے بسی کا نظارہ کرتے ہیں اور پھر ہوا ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔ میرا موٹر سائیکل چونکہ بہت دیر سے اس لئے اُسے گھسیٹ کر لے جانا بھی ناممکن ہے۔ جہاں کھڑا ہو جائے بس کھڑا ہو جاتا ہے یعنی گل فم ہو جاتا ہے۔ اس دوران کچھ ٹرک سواروں نے مجھے پہچانا اور مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا کر پچھے گئے۔ اُن کا خیال تھا کہ تار صاحب ادیب آدمی ہیں نہر کی خوبصورتی کو انماٹے کر رہے ہیں۔ چنانچہ میں بے یار و مددگار وہاں کھڑا رہا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ نزدیک ترین پنکچر لگانے والے کا ٹھکانہ کہاں ہے۔۔۔۔۔ تاریخ دان گہن نے ایک مسکت خودہ بادشاہ باغیر کے بارے میں لکھا ہے کہ جب وہ امیر تیمور کے سامنے پیش ہوا تو اس نے اپنی موجودہ صورت حال بھلا کر اپنی عزت نفس کو یاد رکھا: چنانچہ میں نے بھی اپنی پنکچر شدہ صورت حال کو بھلا کر شہر نہر کے کنارے پھیلی ہوئی خوبصورت دھوپ کو یاد رکھا اور گھاس پر بیٹھ کر اس سے لطف اندوز ہونے لگا۔۔۔۔۔ میں نے سوچا کہ اگر کوئی سرکاری ایجنسی ایسا نقشہ تیار کرے جس میں لاہور شہر میں پھیلی ہوئی پنکچر کی دکانوں کا نقشہ ہی ہو تو ہم لوگوں کو کتنا آرام ہو جائے۔ جہاں موٹر سائیکل پنکچر ہوا وہیں پر نقشہ نکالا اور نزدیک ترین دکان پر چلے گئے۔

میرا موٹر سائیکل فٹ پاتھ کے کنارے کھڑا تھا۔ اس کا پچھلا ٹائر پنکچر ہو چکا تھا اور ہر طرف ایک ٹھہراؤ تھا۔۔۔۔۔ ایک ایسا ٹھہراؤ جو کبھی کبھار قوموں کی زندگی میں بھی آ جاتا ہے

باہر جا رہے تھے۔ ان کے ملبوسات بھی ان کے لئے عام اور دوزمرہ کے تھے۔ بیشتر کے ہاتھوں میں چمچے لٹن کیرئیر تھے۔ کچھ بچے آئس کریم کھا رہے تھے۔ مشروبات کے شالوں پر خاموش تھا اور تین تین روپے کی بوتلیں و جینوں کے حساب سے پی جا رہی تھیں۔ مسافروں کے چہرے تندرستی اور سفر کے شوق سے دمک رہے تھے۔

ابھی گاڑی کے چلنے میں کچھ وقت تھا..... پیٹ فارم نمبر ایک کا چکر لگا کر میں آہستہ چلتا ہوا ایک اور پیٹ فارم کی طرف نکل گیا..... اس پیٹ فارم پر منظر کچھ مختلف تھا۔ اس پیٹ فارم کی انتظار گاہ میں جس بہت تھا اور تار کی تھی..... یہاں زندگی تھی فری ہر کاغذ اڑتے تھے اور بے شمار لوگ..... بچے بوڑھے اور عورتیں غلیظ اور پٹی ہوئی چادروں میں بیٹے فرش پر کر و میں بدلتے تھے..... بچوں کے بدن پر قمیضوں کی بجائے توپڑے تھے اور وہ بچہ ڈوبے پتے اور تقریباً بیمار لگ رہے تھے۔ بوڑھے بھی ڈوبے پتے تھے اور زیادہ تر سفید وادھوں والے تھے..... ان آنکلیں بھی بھی تھیں۔ خواتین ناکافی ساڑھیوں میں تھیں اور ان کے چہرے بے رونق اور بے رنگ تھے..... مرد بھی گندے اور پٹھے ہوئے پاجاموں میں تھے..... بدن پر ایک پرانی بنیان اور بدن کو کھجاتے ہوئے..... ان مسافروں کا سامان بھی مختلف تھا..... ان کے پاس مین اور کٹری کے وہ پرانے سوٹ کیس تھے جنہیں اٹھا کر پاکستان میں چلا جائے تو عوام مسکوانے لگیں کہ یہ کیا اٹھائے پھر تا ہے..... ان کے بستر اور گھڑیاں اتنی بوسیدہ اور گندی تھیں کہ ہم عام طور پر ایسی چیزیں کوڑے کرکٹ میں پھینک دیتے ہیں۔ یہاں مشروبات کی بوتلوں کی کنک بھی معفود تھی۔ کیونکہ ظاہر ہے ان مسافروں کی جیب اس قسم کی عیاشی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کے پاس کافی آلود مراحیاں رکھی تھیں جن پر المونیم کے پچکے ہوئے ٹکاس اونٹھے پڑے تھے۔ اس پیٹ فارم اور اس پیٹ فارم کے مسافروں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ زیادہ دیر تک وہاں کھڑا نہ ہو سکا اور اپنے پیٹ فارم کی طرف لوٹنے لگا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ یہ پیٹ فارم کن لوگوں کا ہے..... ایک قلی پانی کے نل سے منہ ہاتھ دھو رہا تھا۔ کیوں بھائی

اس پیٹ فارم اور اس پیٹ فارم کے مسافروں میں اتنا فرق کیوں ہے؟ میں نے پوچھا۔ آپ نہیں جانتے جی؟ وہ بگڑی سے چہرہ پونچھے ہوئے بولا "ادھر ہندوستان کے مسافر ہوتے ہیں جی..... ہندوستان سے آئے ہوئے لوگ..... اور ادھر تو جی اپنے مسافر ہوتے ہیں پاکستانی۔"

میں نے آزادی کا ایک طویل سانس اپنے بدن میں اتارا اور اپنے پیٹ فارم پر چلا گیا۔ ان خراش کے ساتھ کہ خدا کرے میں ہمیشہ اسی پیٹ فارم کا مسافر رہوں..... اور وہاں زندگی تھی۔

بیہوشی گم ہو گئی ہے

میں لوہاری چوک سے گزرا تو بنگ کے باہر اس کی موٹر سائیکل کھڑی تھی..... اور اس کی موٹر سائیکل یہاں ہو نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ غلیل تھا اور پندرہ دن کی رخصت پر تھا۔ میں نے کہا پتہ کرنا چاہیئے۔ اندر گیا تو وہ ایک ضخیم رجسٹر پر جھکا ہوا تھا۔ جس کا عکس اس کی عینک کے دبیر شیشوں پر دکھائی دے رہا تھا..... مجھے غصہ آگیا۔ عجیب شخص ہے۔ مجھے پیغام بھیجوا یا تھا کہ میں بے حد بیمار ہوں اور آخری دموں پر ہوں۔ ہو سکتا ہے توں جاؤ درد پھر ملیں گے گڑھ لایا، اور اب یہاں ڈیوٹی دے رہا ہے، اچھا نام مستند دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ میں اُس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن وہ ایک عالم استغراق میں سر جھکائے رجسٹر کو پیار بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے ایک زبردست کنگڑا مارا جس کی آواز سن کر بنگ میں نقد رقم لینے والے چوکنے ہو گئے اور دیگر شان نے مجھے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا لیکن قاضی راشد جاوید احمد رجسٹر پر جھکا رہا۔ تب مجھے شک ہوا کہ ہونہ ہو اس رجسٹر کے اندر کچھ گرم قسم کی تصویریں ہیں جنہیں وہ چوری چپے دیکھ رہا ہے اور بے حد لطف اندوز ہو رہا ہے اور اسے کچھ پتہ نہیں کہ اس کے پاس کوئی کنگڑا ہے اور کون کھڑا ہے..... لیکن رجسٹر پر سوائے اندراج شدہ رقوم کے ہندسوں کے اور کچھ نہ تھا۔ چنانچہ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا: "برادرم! تم بیمار تھے، مچھی پر تھے، اب یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے ایک ایسے شخص کی طرح ناگواری سے سر اٹھایا جو اپنی مجبور کے ساتھ راز و نیاز میں مشغول ہو اور جسے ڈسٹرب کر دیا گیا ہو اور

کہا: "بارہ چوٹی گم ہو گئی ہے" اور پھر رجسٹر پر جھک گیا۔ اتنی دیر میں بنگ کے مرزا صاحب جو اپنی فقرے بازی میں مشہور ہیں ادھر آ نکلے۔ میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔ میں نے پوچھا مرزا صاحب یہ آج لاشد کو کیا ہو گیا ہے، بات ہی نہیں کرتا۔ انہوں نے سنجیدہ ہو کر کہا: "چوٹی گم ہو گئی ہے" اور ایک اکاؤنٹ ہولڈر کو امڈ کرنے چلے گئے۔ راشد حسب سابق سر جھکائے ہاتھ میں بال پوائنٹ تھا مے، رجسٹر کے صفحات کو پلٹ رہا تھا اور ایک عالم فراہوشی میں تھا۔

بنگ لاچر می بھی مجھے جانتا تھا۔ اس نے سلام کیا اور میرا حال پوچھا۔ میں نے کہا میں تو ٹھیک ہوں لیکن یہ بھائی صاحب کچھ ٹھیک نہیں۔

اس پر چڑا میں نے بھی سنجیدگی اختیار کر لی اور کہنے لگا چوٹی گم ہو گئی ہے؟ مجھے احساس ہوا کہ آج پورا شاف گرمی کی وجہ سے شاید جل گیا ہے یا پھر کسی سازش کے تحت مجھے بھیڑا جا رہا ہے۔

میر صاحب کچھ چیک ہاتھ میں تھا مے ادھر سے گزرے تو ان سے بھی سلام دعا ہوئی۔ انہوں نے بھی یہی خبر سنائی کہ چوٹی گم ہو گئی ہے۔

ہر دفین منٹ کے وقفے کے بعد شاف کا کوئی نہ کوئی ممبر نعرہ لگاتا..... کیوں بھی مل گئی: اور لاشد سر ہلا کر پھر رجسٹر میں گم ہو جاتا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد راشد کی عینک کے شیشوں میں ایک چکا چوند ہوئی، وہ اٹھا اور اپنی مختصر سی بھاتی کو ایک گوریلے کی طرح پیٹتے ہوئے نعرہ لگایا..... "مل گئی....." اس پر تمام شاف ممبران بھاگ بھاگ میز پر، کرسیاں پھلانگتے اس کے پاس آئے اور باری باری ہلکی ہلکی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ اس خوشی میں چائے منگوائی گئی اور پی گئی۔ جب یہ آخری نفری ختم ہوئی تو راشد نے میری طرف دیکھا اور حیران ہو کر کہنے لگا: شاہ جی آپ کس آگے۔ کمال ہے، کھڑے کیوں ہو، بیٹھ جاؤ۔ میں بیٹھ گیا اور پھر اس مردوداں سے

پوچھا کہ بھائی یہ کون سی چوٹی تھی جو گم ہو گئی ہے اور اب مل گئی ہے تو کہاں ہے؟
 اور پھر تم تو مرد بیمار تھے، یہاں کیا کر رہے ہو..... اس پر اس نے اپنی داستان چوٹی
 بیان کی..... کہنے لگا کہ گھر سے دو آئی بیٹے گیا تھا ڈاکٹر کے پاس، واپسی پر سوچا اتنے
 عرصہ سے جنگ دوستان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ذرا سلام دعا کر لیں۔ یہاں آیا تو معلوم
 ہوا کہ پچھلے تین چار روز سے جنگ کے ٹوٹل میں ایک چوٹی کا فرق آ رہا ہے..... یہاں
 کے یاروں نے بہت زور مارا ہے لیکن چوٹی پوری نہ ہوئی۔ مجھے اگر خبر بخار تھا اور مجھے پتہ
 بھی تھا۔ لیکن یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ کسی بینکر کو آپ کہیں کہ ٹوٹل پورا نہیں ہو رہا اور وہ
 اطمینان سے گھر چلا جائے..... چنانچہ صبح سے حساب کر رہا تھا اور فرق نکال لیا ہے۔ اگر
 نہ نکال سکتا تو رات کو نیند نہ آتی۔

یہ بینکوں کے لوگ بھی عجیب و غریب مخلوق ہیں۔ ان کے دو گھر ہوتے ہیں۔ ایک مارینی جس میں ان کے بال بچے ہوتے ہیں اور دوسرا بینک جن میں ان کے رجسٹرڈ ہتے ہیں اور اس گھر سے وہ زیادہ محبت کرتے ہیں..... اگر آپ کو کسی برانچ کے اندر کچھ وقت گزارنے کا اتفاق ہو تو آپ دیکھیں گے کہ بینکوں والے بہترین فقرے باز ہوتے ہیں اور جہاں ان کا حکم چلتا ہے وہاں ان کی زبان بھی چلتی رہتی ہے..... یہیں ہر ایک مرزا صاحب ہیں جو لوگوں کی زبانیں باہر نکلوانے کے ماہر ہیں۔ مثلاً کوئی صاحب بہت دور سے بلا پتے ہوئے بینک میں داخل ہوتے ہیں تو مرزا صاحب سے فرمائش کی جاتی ہے کہ ذرا ان کی زبان تو باہر نکلوائیں۔ چنانچہ مرزا صاحب ان کے پاس آجاتے ہیں جو گرمی کی وجہ سے بالکل بونترے ہوتے ہیں اور ان سے مندرجہ ذیل مکالمہ کرتے ہیں۔

”ہاں جی! کیا کام ہے؟“

”جی بل جمع کرانا ہے۔“

• کہاں سے آئے ہو !

”سیر کلر روڈ ہے۔“

۱۰۔ اچھا تو سمجھ رہا ہوں دکھاؤ۔“

..... وہ صاحب بلا سوچے سمجھے اپنی زبان باہر نکال کر دکھا دیتے ہیں..... مرزا صاحب
 زبان کا لام کر کے انہیں فارغ کر دیتے ہیں اور وہ بچارے گھر جاتے ہوئے سوچتے رہتے
 ہیں کہ ان کے کہنے پر اپنی زبان باہر نکال دی۔

یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی صاحب جلدی جلدی اپنا حساب ختم کرنے کے لئے رجسٹر پر کھڑے رہے ہیں اور مرزا صاحب قریب جا کر کہتے ہیں "اسلام علیکم وہ صاحب وعلیکم السلام" پڑھتے ہیں اور اپنے کام میں مگن رہتے ہیں۔ تب مرزا صاحب ہاتھ اُٹھا کر بڑھا کر کہتے ہیں۔ یا راتھ ملاؤ۔ وہ صاحب مجبوراً سر اٹھا کر ہاتھ ملاتے ہیں اور اس دوران ٹوٹل بھول جاتے ہیں.... دوبارہ شروع کرتے ہیں اور تھوڑی دیر بعد ایک مرتبہ پھر مرزا صاحب سلام کرنے کے لئے پہنچ جاتے ہیں۔

بنک کے لوگوں کی تنخواہیں کام کی نسبت بے حد قلیل ہیں مگر پھر بھی بہت کم لوگ بنک
 کے کسی دوسری جگہ ملازمت کرتے ہیں۔ یہ اپنے ہی خون کے ذائقے میں خوش رہتے ہیں اور
 دنیا بھر کے ایوارڈز کے انتظار میں بوڑھے ہو کر فوت ہو جاتے ہیں..... گلوبک نمبر ۳ کے ایک
 بینک میں داخل ہونے پر منجر صاحب باقاعدہ آپ کے استقبال کے لئے دروازے پر آتے
 ہیں بلکہ صبح کو دانے کے لئے شاف نے اپنے خرچ پر ایک کوئی خرید رکھا ہے اور انہیں جلد از
 جلد ناراض کر دیا جاتا ہے..... یہ نہیں کہ تمام بینکوں والے فرشتے ہوتے ہیں۔ ان میں بھی
 ڈراما کار بھی ہوتا ہے۔ لیکن وہ بالآخر پکڑا جاتا ہے۔ جبکہ دوسرے محکموں میں یہ کارکن
 اپنی کارگروہاں دکھاتے رہتے ہیں اور کبھی پکڑے نہیں جاتے..... میرا چھوٹا بھائی بھی
 ایک بینک میں ملازم ہے۔ کئی سال کی سروس ہے مگر تنخواہ صرف اتنی ہو گی کہ عید کے لئے

اپنی بچیوں کے دو فراک اور دو جوتیاں خریدے اور بیس..... کئی مرتبہ سمجھایا کہ بھائی میرے چھوڑو اس پیٹے کو۔ کوئی اور کام کرو۔ کچھ نہیں تو سرخ چھوٹے لگانو، بوٹ پالش شروع کر دو بینک سے زیادہ کمائو گے۔ لیکن بینک میں جملنے کیا افیون ہے کہ چھٹی ہی نہیں۔ صبح سے رات تک ایک فیض بلڈنگ میں کام کرتا ہے۔ ویج بورڈ ایوارڈ کی باتیں کرتا ہے اور بیسوں اور دیگیوں میں دھکے کھاتا ہے..... لیکن بینک چھوڑنے کو تیار نہیں۔

بات چوتنی سے شروع ہوئی تھی۔ وہ چوتنی جو گم ہو گئی اور جسے بڑی مشقت کے ساتھ تلاش کر لیا گیا۔ بینکوں کے علاوہ پاکستان میں اور بھی بے شمار جگہیں ہیں جہاں گم ہوئی رہتی ہیں اور کوئی انہیں تلاش نہیں کرتا۔ چنانچہ وہ چوئیاں اٹھنیوں میں بدلتی رہتی ہیں، پھر روپوں میں اور پھر لاکھوں اور کروڑوں روپوں میں..... اور تب سڑکیں اکٹڑ جاتی ہیں۔ سکولوں، کالوں، ہسپتالوں کی عمارتیں نامکمل رہ جاتی ہیں۔ اگر ان ملکوں میں بھی ایسے لوگ موجود ہوں جو چوتنی کے گم ہو جانے پر فوراً اسے تلاش کرنے کے لئے بیٹھ جائیں تو پھر ہم ایک بہتر پاکستان میں رہ سکتے ہیں۔

عاشق اور انشورنس ایجنٹ

کہا جاتا ہے کہ عاشق اور انشورنس ایجنٹ کا اقبال نہیں کرنا چاہیے۔ دونوں کا پسندیدہ موضوع موت ہے۔ عاشق کہتا ہے کہ میں..... میں تمہارے لئے جہان دے دوں گا مرنے کا اور جب میرا جنازہ ہمارا ہوگا تو تم و منو میں مشغول ہو گے اور میری قبر پر اگر بتی جلانے آؤ تو سرخ دوپٹے کر آنا وغیرہ وغیرہ۔ اور انشورنس ایجنٹ آپ کو دیکھ کر ہی آنا لگتا ہے اور وضو نہ کرنا کوئی بھی ہو وہ اسے موت کی طرف سے آتا ہے۔ شادی کے سہرے دیکھ کر اُسے قبر کی چادر نظر آتی ہے اور وہ آپ کو یقین دلاتا ہے کہ "وہ غافل نہ ہو یک دم یہ دنیا چھوڑ جاتا ہے" لیکن اپنے دوست خان صاحب ڈراما نویس۔ انہوں نے دوستوں کے علاوہ سینکڑوں شوق پالے ہوئے ہیں اور ان میں سے ایک شوق یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ کسی در کسی طریقے سے سدھر جائے۔ بہت سمجھایا کہ خان صاحب یہ شوق فضول ہے کچھ حاصل نہ ہوگا لیکن وہ باز نہیں آتے اور جب ملتے ہیں کیا؟ کب؟ اور سب سے زیادہ کیوں؟ کا استعمال کرتے ہیں.....

ہماری قوم اتنی گندی کیوں ہے؟ ہم رشوت کیوں دیتے ہیں؟ اگر قانون کہتا ہے کہ دیگیوں میں ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر نہیں لگائے جاسکتے تو پولیس والے کیوں؟..... اخباروں والے کیوں؟ لگے دزد ہیں بچوں کو سکول سے اٹھانے یعنی پک کرنے والے پر گیا اور فٹ پاتھ پر خوشگوار دھوپ میں کھڑا چٹائی کا انتظار کر رہا تھا کہ خان کی سوزو کی "شوں" کر کے مال پر سے گزر گئی۔ تصویر ڈیر بعد نظر آئی اور دوسری جانب چلی گئی۔ پانچ منٹ بعد کیا دیکھتا ہوں کہ ان کی کار پھر چلی آ رہی ہے۔ انہوں نے چونکہ اپنی چھوٹی سی گاڑی کی پشت پر جب میں بڑی ہو جاؤں گی تو روز ٹرانس بن جاؤں گی۔

کاسٹلر لگا رکھا ہے اس لئے دور سے پہچانی جاتی ہے۔ میں نے ہاتھ دیا تو وہ روک گئے پھر
حال ، پسینے سے تر اور سانس چڑھا ہوا کار میں بیٹھے بیٹھے کہنے لگے میں تو مار میں گھوم رہا تھا
تم نے خواہ مخواہ روک لیا اور اب دوبارہ مار میں کیسے جاؤں گا؟ میں نے سوچا کہ تیرا دھوپ کی
وجہ سے خان صاحب کچھ میٹر جوڑ گئے ہیں، ٹھنڈا پیئیں گے یا گرم؟ میں نے پوچھا "ہائیں؟ انہوں
نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا یہ کیا کہہ رہے ہو؟ اندکروانا ہے؟ روزوں میں ایسی بات کرنے پر؟
میں نے بھی اقرار کیا کہ جناب روزہ رکھنے کے باوجود یہ عادت نہیں جاتی۔

"نہیں پتہ ہے کہ ایک صاحب کی کار گرم ہو گئی تو وہ اُسے کھڑی کر کے بونٹ اٹھا کر اس میں
ٹھنڈا پانی ڈال رہے تھے تو پکڑے گئے۔"

"کس الزام میں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہی کہ روزوں میں آپ کسی کو پانی کیوں پلا رہے ہیں اس لئے..... اب تو یہ ہے کہ لوگ اپنے
ہمراہ نہیں لاتے کہ اگر گرمی سے بے ہوش بھی ہو گئے تو کہیں سے پانی نہیں ملے گا۔"

"لیکن آپ کہاں گھوم رہے ہیں؟"

"بتایا تو ہے کہ مار میں گھوم رہا ہوں۔" دراصل گھر والوں نے عید کی خریداری کرنی تھی انہیں
انار کھلی لایا تو.....

"جہاں رہتے ہو خریداری وہاں نہیں ہو سکتی تھی؟"

"ہو سکتی تھی۔" انہوں نے عینک صاف کرتے ہوئے کہا: "لیکن میری ساس صاحبہ کا کہنا ہے

کہ کچھ پتہ نہیں کتنے برسوں سے انار کھلی سے دوپٹہ لاتی ہوں تو اب بھی وہیں جاؤں گی؟"

"تم عید کے قرب وجوار میں ساس کو قریب نہ آنے دیا کرو۔" "ہاں" انہوں نے قہقہہ لگانے کی
ناکام کوشش کی: "اگر میں ایسا کروں تو وہ مجھے اپنی بیوی کے قریب نہ آنے دے۔ بہر حال خاندان
بھر کو انار کھلی کے قریب اتارا اور پھر کار پارک کرنے کے لئے جگہ تلاش کرنے لگا اور مجھے پہلی بار
معلوم ہوا کہ پاکستان میں کاروں کی تعداد کھینچوں سے زیادہ ہے۔ کمبوئی مکھیوں کو بیٹھنے کے لیے

بڑی آسانی سے مل جاتی ہے لیکن کار پارک کرنے کے لئے جگہ ناپید ہے۔ جگہ جگہ تلاش کرتا کرتا ٹارے
ڈاک خانے تک آیا پھر ریگل تک اور پھر گورنر ہاؤس سے چکر لگا کر واپس گیا کہ کہیں میرے بچے انتظام
نہیں کر رہے ہوں۔ اب چونکہ کہیں بھی کار روک نہیں سکتا تھا اور پارکنگ کے لئے جگہ دھقی اس لیے میں
آہستہ آہستہ انار کھلی سے گورنر ہاؤس کے مدار میں داخل ہو کر گھومنے لگا۔ یہ انار کھلی کو نوٹر لیفٹ زون
کیوں نہیں بنایا جاسکتا؟ بالآخر انہوں نے اپنے پسندیدہ لفظ "کیوں" کو استعمال کر ہی دیا۔
پتہ نہیں: میں نے بور ہو کر کہا:

"اور سارے سال میں ایک ہی تو ہوا آتا ہے جسے ہم ذاتی طور پر کمانے ہیں" یعنی روزے
رکھ کر عید کمانے ہیں تو نیل کے ساحل سے لے کر تاجناک کا شہر ایک عید نہیں ہو سکتی؟"
پتہ نہیں: میں نے کندھے جھٹکے۔

"تمہیں پتہ کس بات کا ہے؟" وہ بھنا گئے "تمہیں پتہ ہے کہ ہم میں سب سے بڑی خامی یہ ہے
کہ ہم اپنی خامیوں کا اعتراف نہیں کرتے۔ اپنی غلطیوں کو نہیں مانتے۔ پوری دنیا میں ہم شاید واحد قوم
ہیں جو ہر وقت اپنے دفاع میں مصروف رہتے ہیں۔ جیسے اکثر جوہوں میں آپ دیکھتے ہیں اگر ٹریفک
سارجٹ نے کسی شخص کو اشارہ کاٹتے ہوئے پکڑ لیا ہے تو وہ شخص پچھلے پندرہ منٹ سے یہی بحث کر رہا
ہے کہ نہیں میں نے اشارہ نہیں کاٹا.....

"کئی مرتبہ اس نے اشارہ نہیں کاٹا ہوتا" میں نے مسکرا کر کہا "اور کئی بار کاٹا ہوتا ہے" انہوں
نے فوراً کہا ٹھنڈا آج ٹوٹنٹن مارکیٹ کے قریب سورج آنکھوں میں پڑ رہا تھا اور میں سترخ روشنی عبور
کر گیا۔ سارجٹ نے پوچھا تو میں نے کہا کہ جناب بالکل کاٹا اشارہ کاٹا ہے اور غلطی سے کاٹا ہے۔
صاف کر دیجئے تعین کر دو کہ سارجٹ ہکا بکارہ گیا اور دو قدم پیچھے ہٹ کر مجھے سیوٹ مار کر بولا۔
"میری بائیس سالہ سردس میں آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنی غلطی تسلیم کی ہے میں آپ کو سلام
کرتا ہوں اور آپ تشریف لے جائیں....."
"کیا واقعی ایسا ہوا تھا؟"

”اں ابھی تھوڑی دیر پہلے انہوں نے ماتھے پر سے پسینہ پونچھا۔

یہ ساری لنگھو یوں ہوئی کہ وہ کاریں بیٹھے تھے۔ کارشرک کے کنارے کھڑی تھی اور فٹ پاتھ پر کھڑے ایک سارجنٹ صاحب آگئے۔ ”آپ یہاں شرک پر کار کھڑی نہیں کر سکتے۔“

”جی بالکل سارجنٹ صاحب! یہ میری غلطی ہے آپ درست فرماتے ہیں۔“ خان صاحب مسکرا کر کہنے لگے۔

”درست فرماتا ہوں تو لاؤناں کاغذات تمہارا چالان کریں۔ پڑھے لکھے ہو کر قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ ہاں جی ہم ایسا کرتے ہیں۔“ سارجنٹ نے چالان بک نکالتے ہوئے کہا۔

میں نے مسکراتے ہوئے منہ دوسری طرف کر لیا کہ کہیں خان صاحب یہ نہ پوچھ لیں کہ کیوں۔

”فینسی ڈریس“

میرے سر پر ایک مرغی بول رہی تھی۔

کٹ کٹ۔ کٹ کٹ۔ کٹ کٹ۔

کٹ کٹ کرتی آئی مرغی۔

میں نے چارو تاپا رانگھیں کھول دیں۔ چھٹی کا دن تھا اور میں حسب معمول رشتائی میں خیمہ زن اوگھنا پہنستا تھا لیکن مرغی کی کٹ کٹ نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔

”ہوئی مرغی بول۔“ میرے سر پر بیٹھی کھڑی تھی۔ سفید بھالہ دار نیکی میں ملبوس ناک پر سفید کتے سے بنی ہوئی ایک چوہنچ چپکائے اور سر پر انگریز گوانٹوں ایسی سفید ٹوپی بھائے۔ نیچے ٹھیک ہے آپ مرغی ہیں لیکن مجھے تو کونے دیں۔۔۔۔۔ شاباش جائے اور امی کے سر لانے کٹ کٹ کیجئے۔

”لیکن ابو آج تو میرے سکول میں فینسی ڈریس کا مقابلہ ہے اور آپ نے مجھے لیکر جانا ہے۔“ وہ چوہنچ ہلا کر بولی۔ پچھلے کئی دنوں سے ہمارے گھر میں فینسی ڈریس کا ہنگامہ چل رہا تھا۔ میں نے شرٹ شرٹ میں تو کوشش کی کہ اس بے جا خرچ سے اجتناب کروں لیکن روزانہ عینی میرے سر پر کھڑی ہو جاتی۔ ابو سب بچے فینسی ڈریس میں حصہ لے رہے ہیں پمیز مجھے کچھ نہ کچھ بنا دیجئے۔ بس کہتی ہیں کہ تو نہیں لگا کر بٹلر بن جاؤ۔“ میں نے سمجھا کیا بیٹے لڑکیاں بٹلر نہیں بنا کر تیں۔ کم از کم شادی سے بچے نہیں بنا کر تیں۔ پھر اس نے لکھ بننے کی خواہش کی لیکن جھوٹ موٹ کی لکھ بنانے کیلئے جو سیکڑوں لکھ لے چکا کرتے۔ ریشمی لباس میرے جواہرات اور تاج وغیرہ۔ دلہن بنانے کے لئے بھی

اصلی دہن جتنا خرچہ تھا۔ چنانچہ مرغی بننے کے حق میں فیصلہ ہو گیا۔ جس کے لئے سفید مٹی کی کھوپڑی تھی اور صرف ایک عدد چوچ اور ٹوپی کی ضرورت تھی۔ اس روز کے بعد یعنی دن رات کٹ کٹ کرتی آئی مرغی۔ دال کا دانہ لائی مرغی یاد کرتی رہتی۔ البتہ مجھے یاد نہ رہا کہ میرے واسطے مجھے روز یہ فیسی ڈریس شو منعقد ہوئے اور مجھے اپنی گرم رضائی چھوڑ کر یعنی کوساتھ لے جانے اب وہ میرے سر پر کھڑی کٹ کر رہی تھی۔

”بیٹے اگر آپ سکول نہ جائیں تو میں دوپہر کو آپ کے لئے ڈھیر سارے پاکٹ خریدواؤں گا۔“ میں نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

یعنی نے اپنی ناک اور ٹوپی اتاری اور رونے کی تیاری کرنے لگی۔ ”ہائے ابو میرے چوتے میرا انتظار کر رہے ہو گے۔ میری مس مجھے مارے گی۔ میں نے جانا ہے۔ چنانچہ مجھے بستر سے باہر آنا پڑا۔

سکول پہنچے تو یعنی کے چوتے ”ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے۔ انہیں فوراً اکٹھا کیا گیا اور مس ذکیہ چارلی کی نگرانی میں ریپر مل شروع ہو گئی۔ بیٹج کے عین سامنے فیسی ڈریس میں حصے والے بچے اور ان کی استانیاں جنہیں یہاں میں کہا جاتا ہے براجمان تھیں اور کچلی نشستوں پر دلوں اپنے بچوں کی نوک پلک درست کر رہے تھے۔ شو کا آغاز ہوا تو پہلی اور دوسری جماعتوں کے بچے بیٹج پر آنے لگے۔

”میں فقیر ہوں۔“ دے جا بابا اللہ کے نام پر۔“ پٹھے ہوئے کپڑے اور نقلی داڑھی جو بہت بڑی تھی اور تالیاں۔

”میں قلی نمبر ۲۰ ہوں سامان اٹھاؤں۔“

”میں ہنٹی ڈمپٹی ہوں“ ایک گول گپا بیٹج پر آگیا۔ بچوں کے ہتھکے اور تالیاں۔

”میں مالین ہوں“ ایک بچی پھولوں کی ٹوکری اٹھائے بیٹج پر آئی اور پھولوں کی پتیاں ہوا میں اچھٹنے لگیں۔

”میں رنگ ہوں۔“ میں پائلٹ ہوں۔“ میں سندھی بچہ ہوں۔“ میں پہلوان ہوں۔“ میں لڑائی بچی ہوں۔“ میں دہن ہوں۔“ میں مہاراج کرشن ہوں۔“ میں پوپ پال ہوں۔“ اور ان ادب بہرہ پر کا سوا رنگ جاری رہا جس پر کئی ماہ کی محنت اور ہزاروں روپے خرچ کئے گئے۔

علامہ اقبال کی نظم ”ماں کی دعا“ کا اس ٹوبی نے پیش کی اور بے مدخر بصورتی سے پیش کی۔ پھر شاعر شروع ہو گیا جس میں میر تقی میر، غائب، اقبال، بہادر شاہ ظفر کے بعد صادق بیگ اور کٹر شاعر صی مشہور شعراء نے اپنا کلام پڑھا۔ یہ تمام شعراء سات سے آٹھ سال کی عمر کے تھے۔

اس کے بعد وہ آٹھ پیش کی گئی جس کے لئے مجھے صبح صبح یہاں آنا پڑتا تھا۔ قرۃ العین ٹارڈ نے اپنی جوتی درست کی اور اپنے درجن بھر چوڑا سیٹ بیٹج پر جا کر کٹ کٹ کرتی آئی مرغی ملنے لگی اور ایک بڑی ساری چیل اس کے چوڑوں پر حملہ آور ہوئی اور بی مرغی نے اپنے پردوں کا بیٹ کر چوڑوں کو بچا لیا۔ میں نے بھی خوب تالیاں بکھائیں۔

ایک ٹیبلو میں حضرت عمر کا انصاف پیش کیا گیا۔ ایسی دائریوں والے دو عرب بیٹج پر گھومنے لگے اور ایک ایسی لڑکی کو انعام دیا جس نے اپنی ماں کے کہنے کے باوجود دودھ میں پانی ملانے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ خلیفہ اگر موجود نہ ہو تو تب بھی تلاوت کرنا اسلام میں حرام ہے۔

سب سے عمدہ اور سبق آموز ٹیبلو نخریک پاکستان کے بارے میں تھا جس میں تحریک کے تمام تر مراحل کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا تھا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ تمام بچے جو قائد اعظم علامہ اقبال، لیاقت علی خاں، محترمہ فاطمہ جناح بنے گھوم رہے ہیں۔ صرف دوسری جماعت میں پڑھتے ہیں۔ علامہ اقبال شعر پڑھتے اور بیٹج پر ان کے شعروں کی تصویر ظاہر ہو جاتی۔ شاہین نودار ہو جاتے۔ یہ غازی تیرے پراسرار بندے سامنے آ جاتے۔ لیاقت علی خان کھر بیک اگرچہ بہت بڑی تھی لیکن انہوں نے اسٹیج میں پاکت فی پرچم لہرایا۔ علامہ اقبال کھر

مونچھیں کبھی کبھار گرجائیں اور انہیں فوراً لٹکالیتے..... ساروں سے آگے جانے والے منور
 بھی دکھائی دیتے جن کے گرد بے شمار ستارے تھے اور بے حد پیارے تھے۔ نفیر جب کے مقام
 پر پرنسپل گھنڈون داس نے منیر بانی کے فرائض سنبھال لئے اور لاہور کے بشپ کی بیگم نے بھولہ
 انعام نفیس کئے۔ شکایت یہ ہے کہ صرف بچوں اور اساتذہ کو ہی انعام دیئے گئے۔ بچوں کے
 والدین بھی تو میرے امتحان میں مشکل پاس ہوئے تھے۔ انہیں بھی کوئی ٹائی یا چاکلیٹ تمنا دیا جانا۔
 ہم گھر واپس آ رہے تھے تو مینی پوچھنے لگی: "ابو آپ جب پھوٹے تھے تو فنی ڈریس پہنا تھا؟"
 میں نے کہا: "ہاں ہوتا تھا..... کئی بچے فقیر ہوتے تھے، قلی ہوتے تھے، غریب ہوتے تھے اور
 ایک دن کے لئے نہیں ہمیشہ کے لئے ہوتے تھے۔"

"ابو آ اس نے ایک دم میرا کندھا پکڑ لیا۔" مجھے یاد آیا اس کہہ رہی تھیں کہ اتھویا کے بچوں کے
 لئے امداد چاہئے گھر سے پیسے لے کر آؤ.....۔ اتو یہ اتھویا کہاں ہے؟ میں نے اسے بتا کر غریب
 ایک ملک ہے جسے جبر کہتے ہیں؟ اچھا تو ابو؟ وہ معصومیت سے کہنے لگی: اتھویا کے بچوں کو
 پیسے اس لئے بھیجنا ہیں تاکہ وہ بھی فنی ڈریس میں حصہ لے سکیں؟
 "ہاں بیٹے..... وہ بہت دنوں سے فنی ڈریس میں حصہ لے رہے ہیں..... بھوک کے فنی
 ڈریس ہیں۔"

”نجانا کرو ب“

ہر گلی ہر کوچہ ہر بازار اپنے آپ میں ایک مکمل دنیا ہوتی ہے۔ پیدائش سے شروع ہو کر مرگ
 تک کے تمام مراحل آنکھوں کے سامنے آتے رہتے ہیں۔ مجتوں، ذلتوں، محرومیوں کے مارے
 لوں کا مایہ جوں، خوشیوں اور تو انائیوں سے دیکھتے چہرے..... آپ بے شک ساری عمر اس
 گلی کوچے یا بازار سے باہر قدم نہ رکھیں صرف دیکھتے رہیں اور آپ کو کل دنیا کا عکس اس میں نظر آتا
 رہے گا۔ میں بھی اپنے بازار میں دیکھتا رہتا ہوں اور لوگ گزرتے رہتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ
 کون سا چہرہ دفتر سے کتنے بے واپس آتا ہے اور میرے سامنے سے گزرتا ہے۔ فوٹا ہاتھ پر
 سے گزرنے والے بچوں کے بارے میں جانتا ہوں کہ انہیں کتنے بے چھٹی ہوتی ہے۔ ان لوگوں کو
 میں اس بچہ سے علاحدہ پہچانتا ہوں جو اپنے کام کا ج اور روزگار کے سلسلے میں ضرور تباہاں سے
 گزرتے ہیں۔ صرف اسی ایک روز..... بازار کا خاکروب بھی ایک چہرہ ہے جسے میں مدتوں سے
 دیکھ رہا ہوں۔ بازار میں جھاڑ دیتے ہوئے، گندی نالیوں میں گھسے ہوئے ہوئے، غلاظت اٹھاتے
 ہوئے اس کی مونچھیں غالباً سفید ہیں۔ کیونکہ جو کام وہ کرتا ہے اس میں سفیدی زیادہ دیر تک
 قائم نہیں رہ سکتی۔ جسم فرمونوں کی سوکھی ہوئی میوں کی طرح ہے اور وہ اتنی دیر سے جھاڑ وپر
 جھکا رہا ہے کہ اب سیدھا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جھکا جھکا چلتا ہے۔ ظاہر ہے میں نے اس کے
 ساتھ لنگو بھی نہیں کی اس کے سلام کا جواب نہیں دیا..... لیکن وہ میرے سامنے رہتا ہے۔ آج
 میں وہ اپنا اتھائی کام پڑانے کے بعد سامنے والے تھڑے پر بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا..... میں
 نے اسے دیکھا اور سر جھکا کر اپنے کام میں محو ہو گیا۔

”سلام باؤ جی“ میں نے سر اٹھایا وہ باہر فرٹ پاتھ پر کھڑا تھا۔
 ”باؤ جی!“

”کیا بات ہے؟“

”بھلا ہوئے خیر ہو دے آپ سے بات کرنی ہے باؤ جی“

”اندر آ جاؤ۔“

”وہ..... جھپکتا..... ہوا اندر آیا اور فرش پر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا تو وہ شرما گیا۔“ نہیں باؤ جی.....“

”کچھ نہیں ہوتا کرسی کو..... بیٹھ جاؤ.....“ وہ بیٹھ تو گیا لیکن بالکل کنارے پر جیسے ابھی فرش پر بیٹھ جائے گا۔ کیا بات ہے؟“

خیر ہو دے باؤ جی آپ اخبار میں مضمون لکھتے ہو..... مجھے اچھونے بتایا تھا جی۔ اس نے بتایا تھا جی کہ آپ نے کھا ہے کہ اس بازار میں صفائی نہیں ہوتی۔“

اچھو کہنے لگا باؤ جی نے کھد دیا ہے کہ تم صفائی نہیں کرتے اس لئے کارپوریشن والے تمہیں جواب دے دیں گے..... باؤ جی! میں غریب آدمی ہوں

اس نے ہاتھ جوڑے اور کھڑا ہو گیا۔ ”میں کبھی حرام نہیں کھایا جی..... پوری صفائی کرتا ہوں، جمع بھارت دیتا ہوں، نایاں صاف کرتا ہوں کچھ اٹھاتا ہوں..... میں بائیس سال ہو گئے جی اس بازار میں مجھے..... باؤ جی میں غریب آدمی ہوں..... میں اسے بیس بائیس برس سے دیکھ رہا

تھا اور مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ بولتا بھی ہے اور اس کی مونچیں سفید ہیں اور وہ ایک انسان ہے میری طرح کا.....“ بیٹھ جاؤ..... آرام سے.....“

”نہیں جی!“ وہ ہاتھ جوڑے کھڑا رہا۔ ”باؤ جی اس بازار میں میں ایکلا صفائی کرتا ہوں باقی سب لوگ گند ڈالتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں صفائی رکھنا صرف میرا کام ہے۔ بڑا بڑا صاحب کیلے کھا کر چھلکے شرک پر پھینکتا ہے جی..... سبزی والے اپنی گلی سڑی سبزیوں میں پھینک

دیتے ہیں، قصائی لوگ اور بھریاں پھینک دیتے ہیں اور وہ پھول کر بھگانا ہو جاتی ہیں اور نالی بند ہو جاتی ہے۔ میں تو جی نالیوں میں گھسارتا ہوں سارا دن آپ نے بھی دیکھا ہوگا.....

گزشتہ روز بوائے تو سردیاں گرمیاں ہیں ہی اس میں غوطے لگا کر کھولتا ہوں..... صبح آتا ہوں اور دلت کو جاتا ہوں اللہ بھلا کرے..... اچھو کہہ رہا تھا جی۔“

”اچھو غلط کہتا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یار تم بیٹھ جاؤ کرسی پر..... بیٹھ جاؤ“ میں نے مصنوعی غصے سے کہا اور وہ بیٹھ گیا۔

”نام کیا ہے تمہارا؟“

”نجا!“

”پورا نام کیا ہے؟“

”نجا ولد نولا۔“

”بلی نجا تو کوئی نام نہ ہوا..... کچھ اور ہوگا۔“

”یہی ہے جی نجا.....“ شنختی کارڈ پر بھی یہی لکھا ہے۔ نجا ولد مولانا مذہب عیسائی..... پہلے ہم بابلی ہوتے تھے.....“

”تہتے کہاں ہو؟“

”موتی دروہے کے اندر پتھر والی حویلی میں.....“

میں نے اسے ایک سگریٹ بلایا کہ یہاں تو وہ رواں ہو گیا۔ ”میں نے باؤ جی ہوش سنبھالی تو ماں باپ کا رٹھاپا دیکھا۔ بہن کو جوان دیکھا۔ بڑے بھائی شادیاں کر دیاں کر دیاں ہو گئے۔ ماں باپ کی خدمت کی کوٹھے اتار اتار کر بہن کا بیوا کیا پھر میری شادی ہو گئی۔ اللہ پاک نے آگے پیچھے چھ بیٹیاں بھی دیں۔ میں انہیں سنبھالتا رہا بیٹے کی خواہش تھی۔ بیوی کو لے کر دانا صاحب، پیرنگی اور مادھول

کے شادوں پر جا کر بیٹا مانگا اور صاحب آپ کے پاؤں کی خیرات بیٹا مل گیا۔ پھر باؤ جی ہوئی کو کینسر ہو گیا۔ میں نے کہا سبھی لوگ میں گھر کے برتن بیچ دوں گا، فقیر ہو جاؤں گا لیکن تیرا علاج کرواؤں گا۔“

وہ مافی ہی نہیں کہنے لگی چھ بہار گھر میں میں اُن کو کیسے نکالوں۔۔۔۔۔ پھر وہ مر گئی۔۔۔۔۔ اور میں باؤجی کام کر کر کے مارا ہو گیا۔ میرا کب نکل آیا ہے اُن کی شادیاں کرتے کرتے۔۔۔۔۔ وہ بھلا لوگ زندہ تھی تو میرا خیال رکھتی تھی۔ روٹی بڑی چکا کر دیتی تھی۔۔۔۔۔ بچے کی مونچھیں شکر خزانے لگیں اور نظر چرا کر باہر دیکھنے لگا۔ بس جی زندگی اس طرح ہی گزر گئی۔۔۔۔۔ عمر؟ نہیں جی! پتہ نہیں میری عمر کیا ہے۔۔۔۔۔ میں تو جی ساڑھن کل چلانا بھی نہیں جانتا۔ گھڑی دیکھنی نہیں آتی مجھے۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ لاہور سے باہر ایک مرتبہ گیا تھا ڈیرہ غازیخان سخی سردر کے دربار میں سلام کرنے۔۔۔۔۔ پچھلے ہفتے بیٹے کی شادی کر دی ہے۔ بڑا بے نیاز ہے قادر کیرم ہے اس نے مجھے غریب کو میٹھا دیا دنیا کے ساتھ ملا دیا۔۔۔۔۔ باؤجی میں غریب آدمی ہوں، میرا خیال رکھنا! اُس نے پھر ہاتھ جوڑ دیئے۔

”اوتے بچے! باہر ایک دکاندار کھڑا تھا۔“ اُسے دکان کے نیچے کی نالی بند ہو گئی ہے وہ تیرا پو پو کھولے گا چل۔“

”بسم اللہ جی۔۔۔۔۔ تسی چلو میں آیا۔۔۔۔۔ بھلا ہوسے، خیر ہوسے باؤجی مولا آپ کو زندگی دے۔۔۔۔۔“ اور بچا اٹھ کر چلا گیا۔۔۔۔۔

ہاں باقی سب لوگ گند ڈالتے ہیں اور بچا اکیلا سفائی کرتا ہے۔

”بیگمات اور سیلاب“

”بیگم فرقان“

”بیگم فرقان“

”میں نے سوچا ہمارے خاوند تو ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں کیوں نہ ہم بھی سہیلیاں بن جائیں۔“ ہائے بیگم فرقان آپ کتنی سویت ہیں۔ میں بھی کئی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ آپ کے ہاں آؤں اور ملاقات کروں۔ لیکن آج کتنی خوش قسمتی کی بات ہے کہ یہاں دریائے رادی کے پل پر ملاقات ہو گئی۔“

”جی ہاں میں نے آپ کو فوراً پہچان لیا کہ آپ ہی بیگم فرقان ہیں کیونکہ آپ دور سے ہی کچھ زور دند کی نظر آ رہی تھیں۔“
”تو آج ادھر کس طرح آنا ہوا؟“

”بس ایسے ہی انجانے منٹ کے لئے آ گئی۔۔۔۔۔ گھر میں بور ہو گئی تھی۔ کوئی نئی انڈین فلم بھی نہیں تھی کہ آرام سے دی کا آر پر دیکھتی۔ چنانچہ یونہی اخبار دیکھ لیا اور ہائے اتنی توں کہ خوفناک خبریں تھیں اس میں کہ ہمارے ملک میں فلتہ وغیرہ آ گیا ہے۔۔۔۔۔“
”میں بھی کچھ نہیں کر رہی تھی اس لئے ڈرائیور کو کہا کہ کسی اچھی سی جگہ لے چلو تو وہ کہنے لگا کہ بی بی جی ان دنوں رادی کے پل پر بڑی رونق ہوتی ہے۔ لوگ وغیرہ ڈوب رہے ہوتے ہیں تو ذرا وقت اچھا گزر جاتا ہے اس لئے ادھر آ گئی۔۔۔۔۔“
”تو پھر مڑا آیا؟“

”ہاں بہت..... دیکھناں یہاں اور بند کئے اوپر جو ہزاروں لاکھوں غریب لوگ بیٹھے ہیں اور شاید سبھو کے وغیرہ بھی ہیں تو ان کو دیکھ کر میرے دل کو کچھ ہوتا ہے۔“

”بس یہی تو انا نیت ہے۔“

”تو یہاں آنے سے پہلے میں نے کچھ ہلانے کپڑے اور جوتے وغیرہ کار میں رکھ لئے اور باری گیٹ سے کچھ نان اور ایک دیگ چاول خرید لئے.....“

”ہاؤ سوٹ..... لیکن آپ نے ابھی تک نان اور چاول ان غریب لوگوں میں تقسیم کیوں نہیں کئے۔“

”ادھر کوئی فوٹو گرافری دکھائی نہیں دے رہا.....“

”ہاں تصویر کے بغیر موشل وغیرہ کا کیا فائدہ..... آپ کی تصویر اخبار میں چھپے گی کہ سیکم یر تان سیلاب زدگان میں چاول تقسیم کر رہی ہیں تو پھر دے ملک کو پتہ چلے گا کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے ہوئے بلکہ اپنے بہن بھائیوں کے دکھ درد میں اُن کا ساتھ دے رہے ہیں۔“

”تو ادر کیا..... در نہ تصویریں تو ہماری اترتی رہتی ہیں؟“

”ویسے پل پر سے پانی کتنا خوفناک لگ رہا ہے؟“

”جی ہاں..... ویسے ایک بات کہوں؟ اور چاہے مجھے کوئی ناراض ہی کیوں نہ ہو جائے ضرور کہوں گی کہ یہ لوگ جو سیلاب کی وجہ سے اپنے گھروں کی چھتوں پر بیٹھے ہوئے ہیں تو بہت خوش قسمت لوگ ہیں اپنے گھر کی چھت پر بیٹھ کر ان کو کتنا زبردست منظر نظر آتا ہوگا..... ہر طرف پانی ہی پانی....“

”اور وہ چھتوں پر بیٹھ کر وہ گانا گانگ سکتے ہیں کہ ہر طرف پانی ہی پانی ہے لیکن پینے کے لئے پانی کا ایک قطرہ نہیں.....“

”یہ تو ٹھیک ہے لیکن ان بچاروں کو ویسٹرن میوزک کا کیا پتہ؟“

”ویسے آپ نے ادھر کوئی لاش وغیرہ پانی میں بہتی ہوئی دیکھی؟“

”نہیں۔“

”اور کوئی بچہ یا بوڑھا ڈوبتا ہوا؟“

”نہیں۔“

”کتنی زیادتی ہے..... اخباروں میں تو یہی لکھا ہوتا ہے اور یہاں کچھ بھی نہیں ہے

..... میری بڑی خواہش تھی کہ کوئی لاش و اش وغیرہ تیری ہوئی دیکھوں.....“

”ہاں..... اور کوئی ڈوبتا ہوا شخص بھی..... وہ بھی تو خوب منظر ہوتا ہے۔“

”مجھے یہاں آکر بہت مایوسی ہوئی ہے۔ اب اتنا بڑا سیلاب بھی نہیں جتنا شور مچایا جاتا

ہے اور اس سیلاب سے ہم لوگ ان کی نسبت زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔“

”ہاں اصل سیلاب زدگان تو ہم ہیں۔ مثلاً یہ کہ میرے کچھ سرخوش ادھر سے آئے تھے

عمود کوئی کی طرف سے تو وہ پچھلے تین دن سے نہیں آئے کیونکہ ان کے گھر پانی میں گھرے ہوئے

ہیں.....“

”تو پھر آپ نوکروں کے بغیر کیا کرتی ہیں؟“

”یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ ہمیں زیادہ تکلیف ہوئی ہے سیلاب سے تو وہ نوکر نہیں آئے

تو میں نے گھر کا سارا کام دوسرے نوکروں سے کرایا اور بہت تھک گئی.....“

”میرا بھی یہی حال ہوا۔ پھل خریدنے گئی تو دوکاندار کہنے لگا کہ بی بی جی صرف سیب ہیں

ادھر کوئی پھل نہیں کیونکہ راستے بند ہیں..... تو مجھے گرا بہت پسند ہے تو وہ بھی نہیں تھا تو

میں نے پچھلے تین دن سے گرا نہیں کھایا سیلاب کی وجہ سے۔“

”مائے بیگم خرقان مجھے تو آپ پر ترس آتا ہے آپ نے تین دن سے گرا نہیں کھایا سیلاب

کی وجہ سے اور پھر بھی لوگ کہتے ہیں کہ ہم ان کے دکھ نہیں بانٹتے۔ اور میری سینے۔ آپ کو پتہ

ہے کہ ہوسکے اور اگر جو گاؤں اور کھیت ہیں تو ان سے سبزی آتی تھی تو مجھے باکی سبزی ملی اور

بہت مشکل۔“

”دراصل سب سے زیادہ تو ہم لوگوں کو مصیبت پڑی ہے ناں..... جو لوگ گریبا کھاتے ہی نہیں تھے ان کو تو کوئی فرق نہیں پڑا۔ یا جن کے نوکر نہیں ہیں۔“

”اور یہاں دیکھئے کہ رادی کے آس پاس کتنی رونق ہے۔ سیاسی جماعتوں نے جنسے ملا رکھے ہیں۔ کرسیاں میز سجا رکھے ہیں اور لاؤڈ سپیکر متاثرین کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا جا رہا ہے تو ان سیلاب زدگان کو اور کیا چاہیئے۔“

”ہم لوگ بھی تو اتنے آرام دہ گھروں سے نکل کر خاص طور پر ادھر آئے ہیں۔ ان کے ساتھ اظہار ہمدردی کرنے کے لئے..... ہم سے کوئی اظہار ہمدردی نہ کرائے تو اس سے ہمارا کیا قصور.....؟“

”جی ہاں اور لوگ کہتے ہیں کہ یہ سیلاب وغیرہ بہت دردناک ہے۔ حالانکہ بیگم برتقاں ادھر ہندوستان سے اس میں تین سبھتے ہوئے آئے تو کیا یہ مزید بات نہیں۔“

”ہاں یہ تو سیلاب کا پازٹیو پہلو ہے..... دردناک پہلو یہ بھی ہے کہ ایک آدمی کے بچے مر گئے تو وہ انہیں دفن نہیں کر سکا اور ان کو پانی میں بہا دیا۔“

”ہاؤ شوپڈ..... حالانکہ اسے چاہیئے تھا کہ اسی وقت ایجوکیشن وغیرہ کے لئے فون کر دیتا.....“

”ہو سکتا ہے کہ اس کے گھر کے چاروں طرف پانی ہے اور وہ کچھ کئی دفنوں سے مکان کی چھت پر بھوکا پیاسا بیٹھا رہا ہو.....“

”ہاں تو ہو سکتا ہے..... لیکن یہ بچوں کی لاشیں پانی میں بہا دینا بہت ہی ظلم ہے..... ہم اس بارے میں پروڈنٹ کریں گے.....“

”بیگم فرتقاں آپ کتنی دیر یہاں کھڑی رہ کر نظارہ وغیرہ کریں گی۔“

”بیگم برتقاں نظارہ کیا خاک کرنا ہے کوئی لاش وغیرہ تو دکھائی نہیں دیتی۔ اگر پانی میں ابھرتا ہو کسی بچے کا ہاتھ وغیرہ ہی دکھائی دے جاتا تو یوں وقت ضائع نہ ہوتا..... آپ

کے ناں اور جہاں پر دگرگرم کا کیا ہو گا۔“

”نو نوکر اگر ہی نہیں آیا ابھی تک..... اس لئے میں تو گھر چلتی ہوں اور اوپکس کی تھیلیاں

دیکھئے.....“

”ایک بات ضرور بتانی جائیں..... یہ لوگ جو شوہر مچاتے ہیں کہ لاہور سے راولپنڈی جانا بول جی ٹی روڈ بند ہے اور ریوے لائن پر پانی ہے اس لئے ٹرینیں بھی نہیں چل رہی تو یہ سب لوگ بائی ایر کیوں سفر نہیں کرتے؟“

”بالکل..... اور بائی ایر سفر کرنے سے سیلاب دکھائی دے گا اور آپ پھر ہزار میٹر کی جہد سے متاثرین کے ساتھ اظہار ہمدردی کر سکتے ہیں۔“

”خدا حافظ بیگم برتقاں.....“

”ہائے ہائے بیگم فرتقاں.....“

”ایک لنگوری کالم“

اگر لاہور کے چڑیا گھر سے ایک مرد لنگور فرار ہو گیا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے اگر وہ لنگور کی تصویر کو مان لیا جائے تو وہ تو میرا بھی اتنا ہی قریبی ہے جتنا کہ پاکستان کے باقی لوگوں کا..... لیکن اس کے باوجود جس دن سے وہ لنگور فرار ہوا ہے اور پھر تھانہ سول لائن میں اس نے اپنی گرفتاری پیش کی ہے لوگ میری طرف عجیب عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے انہیں شک ہو کہ جس لنگور نے تھانے میں گرفتاری پیش کی ہے وہ دراصل وہ لنگور نہیں جو فرار ہوا تھا وہ لنگور کوئی اور لنگور ہے اور ہو سکتا ہے کہ میں بھی کہیں سے فرار ہو کر ادھر آ نکلا ہوں.....

اس لنگوری سلسلے میں مجھے دو تین خطوط بھی موصول ہوئے ہیں۔ ان میں سے دو خط تو بے حد غیر منجمد انداز میں تحریر کئے گئے ہیں اور ان میں مجھے طرح طرح کے القابات سے نوازا گیا ہے..... ان میں سے ایک لقب چاہا لنگور کا بھی ہے..... یہ بھی لکھا گیا ہے کہ جی آپ جانوروں کے بارے میں بہت سچی ہیں اور ہمیشہ انسانوں کی نسبت بھالوؤں، بندروں اور کتوں وغیرہ کے بارے میں زیادہ کالم لکھتے ہیں اسی لئے ہیں شک ہے کہ کہیں آپ بھی..... لیکن ان میں سے ایک خط نہایت بُر دہائی سے تحریر شدہ ہے۔ پاکستان کے کس شہر سے آیا ہے اس کا کچھ پتہ نہیں اور لکھنے والے نے اپنا نام انیل لور یعنی جانوروں سے محبت کرنے والا لکھا ہے..... یہ صاحب لکھتے ہیں..... میں آپ کے کالم احتیاط اور پیار سے پڑھتا ہوں۔ احتیاط سے اس لئے کہ کبھی کبھار آپ کا کوئی بے حد معصوم سا کالم اپنے معانی میں انتہائی زہر ناک ہوتا ہے اور پیار سے اس لئے پڑھتا ہوں کہ آپ میں محبت کا جو جذبہ ہے وہ صرف انسانوں کے لئے ہی مخصوص نہیں بلکہ آپ

قدرت کے تمام تر مظاہر اور درندوں، چرندوں اور پرندوں سے بھی محبت کرتے ہیں۔ آپ کا کالم جس میں آپ نے ایک بھالو کی شان میں ایک آزاد نظم تحریر کی ہے بہت پسند آیا..... مجھے دونوں لاہور کے چڑیا گھر کے ایک لنگور کے فرار ہونے کی خبر بھی تھی مجھے حیرت ہے کہ آپ نے بھی شک اس مزید کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ وہ کون سے عوامل تھے جن کی بنا پر لنگور چڑیا گھر سے بھاگ گیا اور پھر خود ہی گرفتاری پیش کر دی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اگر آپ بھالو کی طرح لنگور کی شان میں بھی ایک آزاد نظم تحریر کریں..... میں شکر گزار رہوں گا..... آپ کا انیل لور.....

جانوروں سے محبت کرنے والے اس شخص نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں اس لنگور پر ایک لنگوری کالم ضابطہ تحریر میں لے آؤں۔

دیکھنا یہ ہے کہ لنگور چڑیا گھر کی تمام تر راحتوں کو چھوڑ کر انسانوں کی دنیا میں کیوں بھاگ کر آیا؟ آخر چڑیا گھر میں اسے کتنے کے علاوہ کیا کام تھا..... کیا اسے یہ غلط فہمی تھی کہ چڑیا گھر کے باہر دراصل ایک جنگل ہے اور وہاں لنگور ہی لنگور ہیں اور وہ اپنے لنگور برادران میں شامل ہونے کے لئے چڑیا گھر سے نکلا تھا اور جب اس نے باہر آ کر دیکھا کہ وہاں تو لنگوروں کی بجائے انسان ہیں تو اس نے مایوس ہو کر گرفتاری پیش کر دی۔ وہ انسانوں سے کیوں مایوس ہوا؟ یقیناً اس نے انہیں بہت قریب سے دیکھا ہو گا اور وہ کچھ دیکھا ہو گا جو انسان کرتے ہیں۔ اس لئے اس نے اس میں بہتری بھی کہ چڑیا گھر واپس پہلا جائے۔

دیسے چڑیا گھر میں انسان خود اپنے تپے سے رقم خرچ کر کے اسے اپنی شکلیں دکھانے آ جاتے تھے؟ شاید اس نے یہ محسوس کیا ہو کہ باہر کی دنیا اور چڑیا گھر میں کوئی فرق نہیں؟ سو اس کے لئے کہ وہاں کوئی قتل نہیں ہوتا یا سب کو کا نہیں مارتا اور چڑیا گھر میں بچوں کے بیگ لڑکپن بھی نہیں ہیں..... یقیناً اس نے چڑیا گھر کو باہر کی دنیا سے بہتر یا ہو گا..... تبھی تو واپس آ گیا..... سوال تو یہ ہے کہ اگر لنگور چڑیا گھر سے تنگ آ کر جاتا ہے تو وہ فرار ہو کر انسانوں کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے اگر انسان اپنی دنیا سے تنگ آ جائے تو کیا وہ چڑیا گھر جاسکتا ہے..... رہائش اختیار کرنے کی

غرض سے..... یہ بہت اہم سوال ہے اور اس کا ایک متوقع جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کا کیا خیال ہے کیا ہم فی الوقت ایک چڑیا گھر میں رہائش پذیر نہیں ہو اسے جھوڑ کر کسی اور چڑیا گھر میں جانے کی کوشش کریں.....؟ منجھڑے تو یہاں بھی ہیں اور طرح طرح کی بولیاں بھی سننے میں آتی ہیں..... اخباری اطلاع کے مطابق لنگور نے اپنی من مرنی سے سول لائن تھانے میں گرفتار کیا نہیں کر دی۔ اس میں ظاہر ہے کہ نریب داستان کا منظر بھی شامل ہے۔ لنگور نے اگر گرفتاری ہی پیش کرنی تھی تو گلبرگ تھانے میں کیوں نہ پیش کی؟ ظاہر ہے کہ وہ غریب کا بال چڑیا گھر سے نکلا اور اس کی دیوار سے خطہ تھانے میں جا نکلا۔ جہاں دھریا گیا؟ اور شاید تھانے والوں کو بہت بعد میں احساس ہوا ہو کہ جواہروں نے گرفتار کیا ہے وہ کوئی انسان نہیں بلکہ ایک لنگور ہے..... کیونکہ گرفتار کرنے والے وہ انصاف کے ترانہ کو پکڑتے ہیں اور ان کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوتی ہے اور انہیں کیا پتہ کہ وہ کس کو گرفتار کر رہے ہیں۔ بس یہ کہ گرفتار شدہ کوئی غریب عزیاء ہو تو اگلے روز اس کے نام پتے، تصویر اور تفصیل بہت اخبار میں خبر لگ جاتی ہے اور اگر کوئی صاحب ثروت کا بیٹا ہو تو اسے ایک اہم شخصیت کا بیٹا کہہ کر چپکے سے جھوڑ دیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب وہ گرفتار کئے جانے والے "جرم" کی تصویر امارنے گئے ہوں گے تب انہیں پتہ چلا ہوگا کہ ادھویہ تو لنگور ہے۔ ویسے ایک قیاس یہ بھی ہے کہ لنگور کو پولیس نے گرفتار نہیں کیا بلکہ وہ اپنے چاروں پاؤں اور دم کے ساتھ چلتا ہوا خود لائن حاضر ہو گیا وہاں تھانیدار صاحب کرسی پر بیٹھے ہو گئے اور ان کے ساتھ اس کی کچھ اس قسم کی گفتگو ہوئی ہوگی.....

"جناب تھانیدار صاحب میں ایک مفرد ہوں مجھے گرفتار کریں....."

"لو خواہ مخواہ گرفتار کریں..... بھلا مجھے اور کوئی کام نہیں..... ابھی ابھی صاحب کا

آرڈر آیا ہے کہ..... تمام دکن ڈائریکٹروں کو انعام دیا جائے کہ....."

"جناب میں بہت دود سے آیا ہوں مجھے گرفتار کر لیا جائے....."

"اچھا... تو تم ہو کون؟"

"میں لنگور ہوں جی....."

"اچھا کس کے لنگور ہو؟"

"میں اپنا خود ہی لنگور ہوں جی..... اور یہ دم بھی میری اپنی ہے؟"

"دیکھو لنگور بھائی جان..... اب پتہ نہیں کہ قانون کے مطابق ہم آپ کو گرفتار کر بھی سکتے

ہیں یا نہیں..... اس کے لئے ذرا تفتیش کرنی ہوگی کیا پتہ آپ کسی اہم شخصیت کے کچھ لگتے ہوں تو پھر....."

"میں جی چڑیا گھر سے بھاگ کر آیا ہوں اور کسی اہم شخصیت کا کچھ نہیں لگتا..... میرے

سبھی نو کچھ لنگوری حقوق ہیں جن کی ہر جگہ خلاف ورزی کی جا رہی ہے..... مجھے گرفتار کیا جائے....."

اس دوران ایک سپاہی لنگور کو نور سے دیکھتا ہے اور پھر تھانیدار کے کان میں کچھ

کہتا ہے۔ تھانیدار کے پسینے جھوٹ جاتے ہیں اور وہ اپنی پتلون سنبھالتا ہوا اپنی کرسی سے

اٹھتا ہے اور دونوں ایڑیاں بمشکل جوڑ کر لنگور کو سیٹھ کرتا ہے..... "سر مجھے معاف کر دیں۔"

"لنگور بھائی جان سوتا ہے کہ میں ایک عام اور سادہ سا لنگور ہوں کی بجائے سر لنگور کیسے ہو گیا

..... تھانیدار ابھی تک سیٹھ کی حالت میں ہے اور دوسرے ہاتھ سے پسینہ پونچھتا جاتا

ہے۔ اس دوران ایک سپاہی آتا ہے اور تھانیدار کے کان میں کچھ کہتا ہے..... تھانیدار

صاحب ایک گہری اور غصیلی سانس لیتے ہیں اور دھڑام سے کرسی پر گر جاتے ہیں۔ پھر

مینبر پر گم مار کر کہتے ہیں..... "اوتے تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا لنگور کے بچے؟"

"کیا نہیں بتایا؟" لنگور رنڈ کر کہتا ہے۔

"بہن کہ تم پر ہمارے لنگور نہیں....."

"جی میں تو چڑیا گھر کا لنگور ہوں....."

”خواہ مخواہ تراہ نکال دیا ہے لنگور کی اولاد نے..... تھانیدار گرفتار ہے: چلو ادے گرفتار کر لو اس..... لنگور ادے کو....“

اس حکم پر سپاہی آگے آتے ہیں اور لنگور کی دم قابو کر کے اُسے گرفتار کر لیتے ہیں۔ یہ لنگور اب تک آخری خبریں آنے تک واپس چڑیا گھر پہنچ چکا، ہوگا..... میں بھی واپس پہنچ چکا ہوں اور ہاں لنگور کی شان میں ایک مختصر آزاد نظم.....

”میں بھی اک لنگور ہوں.....“

”تو بھی اک لنگور ہے.....“

میرا کیا قصور ہے.....“

تیرا کیا قصور ہے؟